

مادین

مستشرق

رام دین

مضامین رپورٹاژ

ممتاز مفتی

ڈاٹ کام

ترتیب

۱	رام دین	۵	۱۲	اشتہار پی آر اور ادب	۱۵۱
۲	راولپنڈی اور اسلام آباد	۱۴	۱۳	سائنس اور ادب	۱۵۸
۳	عورت کا المیہ	۲۶	۱۴	آپ کا نام	۱۶۱
۴	پاکستان	۳۴	۱۵	غُصیل دُور	۱۶۹
۵	محترمہ ہومیو پیتھی کے نام	۶۱	۱۶	آپا	۱۸۳
۶	ناقابلِ فراموش	۶۸		شاہراہِ لیشم - رپورٹ ناثر	
۷	عورت اور جنسیات	۸۴	۱۷	چھڑ یار	۱۹۳
۸	طُغیل نیازی	۱۰۰	۱۸	تھا کوٹ	۲۰۷
۹	جائے پناہ سے جائے امتیاز	۱۱۲	۱۹	ڈاسو	۲۳۱
۱۰	ادب اور ادیب	۱۳۱	۲۰	الپچی نالا	۲۵۴
۱۱	کلچر، سیمینار اور ادیب	۱۴۳	۲۱	چلاس	۲۷۹

سی ری
کی سی
ٹوٹیلہ
نوک
کے نام

بھنوں نے مجھے اپنے ”ساتھ“ سے نوازا۔ اپنا
ساتھی بنا ناگوارہ کیا۔

ممتاز مفتی
مارچ ۱۹۸۶ء

رام دین

آج کل ہم پر ایک جنون سوا ہے۔ کہتے ہیں، نوجوانوں کو پاکستان کی آئیڈیالوجی سمجھاؤ۔ بڑی بڑی علامہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ پاکستان کیوں معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا مسلک کیا ہے۔ تاریخی پہلو۔ اقتصادی پہلو۔ سیاسی پہلو۔ ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

میری دانست میں یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ پاکستان کو صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے رام دین کو دیکھا ہے۔ سمجھا ہے۔ جانا ہے۔

میں نے رام دین کو ۱۹۳۴ء میں دھرم سالاکے نواحی دیہات میں دیکھا تھا۔
ان دنوں میں دھرم سالامیں انگلش پمچر تھا۔

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کا سانپ نکلا تھا۔ سال بعد برصغیر پر اس کی لکیریں ابھریں۔ مالی اخطا کا جن بوتل سے نکلا اور دھواں بن کر برصغیر پاک و ہند پر چھا گیا۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چلنے لگا۔ اسامیروں میں تخفیف، تنخواہوں میں تخفیف، گریڈوں میں تخفیف۔ تخفیف ہی تخفیف۔

بدقسمتی سے میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر اس وقت سنٹرل ٹریننگ کالج سے باہر نکلا جب ملازمت حاصل کرنے کے جملہ راستے مسدود ہو چکے تھے۔

بڑی دودھ دھوپ کی۔ سفارشیں کروائیں۔ پھر کہیں تعلیم کے انسپکٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ جب کوئی ماسٹر ٹیچنگی پر جائے گا تو عوفی پر لگا دوں گا۔ وہ بھی پتلے گرید میں۔

پہلی عوفی مجھے خانوال میں ملی۔ دوسری دھرم سالامیں۔ میں جو بٹالے کا رہنے والا تھا

اور لاہور میں تعلیم حاصل کرتا رہا، مجھے علم نہ تھا کہ پنجاب میں ایسے علاقے بھی موجود ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اقلیت کے مفہوم کا شعور ہی نہ تھا۔ کیسے ہوتا؟ بٹالے میں ہندو اقلیت میں تھے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ شادی اور موت پر مل جل کر بیٹھتے۔ شادی پر آپس میں بھاجیاں بانٹی جاتی تھیں۔

دھرم سالانہ مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس اقلیت کا یہ عالم تھا کہ سارے سکول میں صرف دو مسلمان طالب علم تھے۔ اور میں واحد مسلمان ٹیچر تھا۔ میری مُشکل یہ ہے کہ میں پانی بہت پیتا ہوں، اور بار بار پینا ہوں۔ رام دین سے میری ملاقات صرف پانی پینے کی وجہ سے ہوئی۔ اگر میں بار بار پانی پینے کا عادی نہ ہوتا تو شاید رام دین کے وجود سے کبھی واقف نہ ہوتا۔

ایک روز سکول میں میں نے ایک ہندو لڑکے سے کہا: مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ لڑکا میری بات سن کر ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ کہا تو وہ بڑے ادب سے بولا "ماسٹر جی، میں آپ کو پانی نہیں بلا سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب، میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔"

میں ہنس پڑا۔ بولا "برخوردار، دھرم بھرشٹ تو تب ہوتا ہے جب تم میرے لالچ کا پانی پیو۔ مجھے پانی پلانے سے تو دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔"

میری دلیل کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ادب سے سر جھکائے جوں کا توں کھڑا رہا۔ ان دنوں مجھے یہ شعور نہ تھا کہ دھرم بھرشٹ ایک جذبہ ہے جسے نہ عقل سے تعلق ہے نہ دلیل سے۔ اور ہندو اقلیت کے علاقے میں اس کا مفہوم ادب سے اور ہندو اکثریت کے علاقے میں اور۔

مجھے پتا تھا کہ ہندو مسلمان کے لالچ کا پانی نہیں پیتے۔ لیکن پانی پلانے کو تو وہ پُن

سمجھتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ مسلمان سے اپنا برتن دُور رکھتے۔ اس دُوری کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ بانس کا ایک ٹکڑا لیتے۔ اسے کاٹ کر ایک نالی بنا لیتے۔ اس نالی کے ایک سرے پر وہ اپنی گڑوی سے پانی ڈالتے، دوسرے سرے پر مسلمان اوک سے پانی پیتا۔

ریلوے سٹیشنوں پر گاڑی رکتی تو آوازیں سنائی دیتیں ”ہندو پانی“ ”مسلمان پانی“۔ ہندو مسافر تو ”ہندو پانی“ کا انتظار کرتے تھے۔ مسلمان دونوں پانیوں میں کچھ فرق نہ جانتے۔ بے تکلف ہندو پانی پیتے۔ اور پانی پلانے والا جو حقارت بھرا فاصلہ قائم رکھتا، اس سے مطلق بُرا نہ مانتے۔

دھرم سالامیں دھرم بھرشٹ کا یہ نیا مفہوم جان کر میں حیران ہوا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ دھرم بھرشٹ کا یہ مفہوم نیا نہیں بلکہ ان علاقوں کا مروجہ مفہوم ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہیں۔

اس واقعے سے چند روز بعد مجھے ہندو اکثریت کے علاقے کی وہ تخلیق نظر آئی جس کا نام رام دین ہے۔

چھٹی کا دن تھا۔ دھرم سالام کے مناظر تھے۔ میں نے کہا، چلو، گھوم پھر کر دن گزاریں۔ پہاڑوں کی پگ ڈنڈیوں پر گھومتا پھرتا آٹھ دس میل دُور نکل گیا۔ راستے میں پیاس لگی۔ چشمے تو وہاں جگہ جگہ پس رہے تھے، لیکن پینے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے کہ سرکار نے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے تھے :

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کسی چشمے سے پانی نہ پیئیں، جب تک وہاں سرکاری بورڈ نہ لگا ہو کہ یہ پانی پینے کے قابل ہے۔

اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کے پانی میں کوئی ایسی دھات پائی جاتی تھی جو گلے میں بیٹھ جاتی اور بالآخر گردن پر گھڑا نکل آتا۔

بہر حال، پانی کی تلاش میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچا۔ ایک دکان دار لالہ جی سے پوچھا ”جی، یہاں سے پینے کا پانی مل جائے گا؟“

لالہ جی نے غور سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولا ”مسلمان؟“
میں نے سر انبات میں ہلا دیا ”جی“

لالہ بولا ”وہ سامنا گھر مسلمان کا ہے۔ وہاں سے پی لو۔“

سامنے گھر کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تازہ گوبر کی لپائی ہو رہی ہے۔
بادرچی خانے میں چوکنا ہوا ہے۔ بالکل جیسے رسوئی میں ہوندا ہے۔ کٹوریاں اور تھالیاں پڑی
ہیں۔ بالکل ایسی جیسے ہندو گھروں میں ہوتی ہیں۔

میں نے سوچا: یہ تو مسلمان کا گھر نہیں ہو سکتا۔ لالہ جی نے شاید کسی اور گھر کی طرف
اشارہ کیا ہو۔ اتنے میں اندر سے ایک شخص باہر نکلا۔ نیچے لڑو والی دھوتی۔ اوپر ننگا بدن۔
گلے میں جینٹو۔ سر پر اتنی لمبی گھنی بودی۔

میں نے کہا ”ہمارا ج، یہاں مسلمان کا کوئی گھر ہے؟“

بولا ”اوں، ہمارا ج۔ یہی تو ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔“

حیرت سے میرا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔

یا اللہ! یہ کیا تماشا ہے! یہ گوبر کا چوکا، یہ جینٹو، یہ بودی اور مسلمان! ”مُ
مسلمان ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی“ وہ بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی، رام دین“

نہ جانے کتنی دیر میں پٹی پھٹی آنکھوں سے رام دین کو دیکھتا رہا۔
وہ پہلا دن تھا جب میں نے رام دین کو دیکھا۔

پھر اس علاقے میں گھومتے پھرتے ہیں نے بیسیوں رام دین دیکھے اور مجھے احساس ہوا کہ رام دین فرد واحد نہیں بلکہ ایک قوم ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقے کی تخلیق کردہ قوم۔

اگر پاکستان نہ بننا تو یہ بات خارج از امکان نہیں کہ آج میں بھی ایک رام دین ہوتا۔ صرف میں ہی نہیں شاید آپ اور ہم سب رام دین ہوتے۔ ہمارے سروں پر چوٹیاں نہ ہوتیں، گلے میں جینو نہ ہوتے، گھروں میں گوبر کی لپائی نہ ہوتی، اس کے باوجود ہم رام دین ہوتے۔ رام دین ایک ذہنیت کا نام ہے جو خود اختیار نہیں کی جاتی بلکہ جسے اکثریت ایک منصوبے کے تحت پیدا کرتی اور جو ذہن سے آہستہ آہستہ لباس گفتگو اور جسم تک پہنچتی۔ لیکن ٹہریے۔ رام دین پرہیزی نہیں۔ اگر رام دین نہ ہوتا تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ سچی بات یہ ہے کہ رام دین پاکستان کا اولین بانی ہے۔

ہمارے آج کے نوجوان رام دین سے واقف نہیں، لہذا ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کیوں وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کی آئی ڈیا لوجی کیا ہے۔ میں ان نوجوانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کے ایل گاہا کی تصنیف ”پیسو وائلسنز“ پڑھیں۔

اس کتاب میں گاہا نے بھارت کے رام دینوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے جذباتی باتیں نہیں کیں۔ کسی کو برا بھلا نہیں کہا۔ کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔

گاہا ایک مشہور قانون دان ہیں۔ پہلے وہ ہندو تھے، پھر مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اس پر ان کے عزیز واقارب سیخ پا ہو گئے۔ ماحول پیری ہو گیا۔ انھوں نے گاہا پر تمام دروازے بند کر دیے۔ ان کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ انھیں اس قدر ہراساں کیا کہ زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ ان کی آپ بیتی ایک طویل دُکھ بھری داستان ہے۔

بہر حال، مسٹر گاہا نے اپنی اس تصنیف میں جذباتی باتیں نہیں لکھیں، بلکہ

خشک حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسے حقائق جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو کس طرح رام دین بنایا جاتا ہے۔

چونکہ مسٹر گابا قانون دان ہیں، اس لیے انھوں نے اپنی تصنیف میں صرف شماریات پیش کیے ہیں۔ مثلاً دفنوں میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے۔ برنس میں مسلمان تاجروں کی اوسط کیا ہے۔ کالجوں میں مسلمان طلبا کتنے ہیں۔ شہروں میں چلنے والی لاکھوں موٹر گاڑیوں میں سے کتنی گاڑیاں ایسی ہیں جن کے مالک مسلمان ہیں۔ کل ٹیلی فون کتنے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس کتنے ہیں۔

بھارت نے مسٹر گابا کی اس کتاب کو ہند میں چلنے نہیں دیا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھارتی مسلمان رام دین سے ناواقف نہیں۔ بلکہ وہ تو رام دین بیٹ رہے ہیں۔ اہل یورپ رام دین کے مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چاہے کوئی جذباتی رنگ میں بیان کرے یا شماریات میں پیش کرے یا منہق کا سہارا لے۔ ان کے ذہنوں میں سماجی تفریق کا خانہ ہی خالی ہے۔

عرب ملک عرب اور غیر عرب کے چکر میں پڑے ہیں۔

پاکستان واحد ملک ہے جسے رام دین سے گہرا تعلق ہے، کیونکہ وہ صرف اس لیے وجود میں آیا کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ رام دین بن کر جیتیں۔

دقت یہ ہے کہ وہ لوگ بھٹوں نے پاکستان بنانے کے لیے جدوجہد کی تھی، وہ تولد لگے۔ پرانے پتے موڑ کر جھڑ گئے۔ ان کی جگہ نئی کونپلیں بھڑی ہیں، جنہیں رام دین کا شعور نہیں۔ کیسے شعور ہو؟ پاکستان میں لاکھوں ہندو مقیم ہیں۔ ان میں تو کوئی بھی اسلام چنڈر نہیں۔ پھر وہ رام دین کو کیسے سمجھیں؟

حال ہی میں مجھے سندھ میں تھریار کر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گوٹ کے گوٹ آباد ہیں۔ گوبر کی لپائی ہے۔ چوکے ہیں۔ بُت ہیں۔ پوہا ہے۔ مندر ہیں۔ آشرم ہیں پٹیل ہیں۔ سمجھی کچھ ایسے ہے جیسے تقسیم سے پہلے تھا۔

وہی شادی غنی پریل جول۔ لینا دینا۔ کھانا کھلانا۔ بھاجیوں کی بانٹ۔ نیرندے۔ سلامیاں۔
مُغھ دکھائیاں۔

تھر کے قصوں، شہروں اور گاؤں میں سارا کا دوبارہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے، جس طرح
تقسیم سے پہلے مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی سارا کا دوبارہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہندوؤں پر
ہندو براجمان تھے۔ کوئی مسلمان منڈی میں جا بیٹھا تو چند دنوں کے بعد یوں باہر نکال دیا جاتا جیسے
دودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔

ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ بے شک وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ لیکن دین کے کھرے
ہیں۔ تول کے سچے ہیں۔ قول کے پکے ہیں۔ پٹی پٹی جوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صبر و تحمل، سادگی،
برادری، بے شک ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ان میں کسی اقلیت کو
برداشت کرنے کی توفیق نہیں اور مسلم کشی کا جذبہ ہرگز گہرا ہے۔ یہ جذبہ اس حد تک کاملاً اثر کرتا
ہے کہ نظر نہیں آتا۔ پھر ہمارے نوجوان بات کو کیسے سمجھیں؟

صرف نوجوان ہی نہیں، عام مسلمان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہیں سمجھتا۔ دیکھ کر
بھی نہیں سمجھتا۔ ریت کر بھی نہیں سمجھتا۔

ایک تو مسلمان کا خیر ہی کچھ ایسا ہے کہ دل خراش حقائق پتے نہیں باندھتا۔ بلکہ انہیں
بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ دلخراش حقائق کے پیچھے جو مجید چھپا ہے کہیں سمجھ میں
نہ آجائے۔

دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے مسلمان طبعاً اس قدر وسیع القلب ہے کہ دشمنوں کے مسلم کشی
کے منصوبوں جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مائدہ کرنا اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔

غصے میں ضرور آتا ہے۔ بار بار آتا ہے۔ لیکن اس کا غصہ سوڑے کی بوتل کا اُبال ہوتا ہے۔
آیا اور گیا۔ غصے کو پی کر دل میں بٹھالینے کی خصلت سے عاری ہے۔

تیسرے یہ کہ اسلامی دُنیا کے گرد و پیش بڑی قومیں مسلسل کام کر رہی ہیں۔ مسلسل تنگ دود

میں لگی ہیں کہ کہیں مسلمان سمجھ نہ جائے۔ مل نہ بیٹھے۔ یہ جن افتراق و تفریق کی بوتل سے باہر نہ نکل آئے۔

یہ قوتیں بڑی طاقتور ہیں۔ بڑی فعال ہیں۔ بڑی سیانی ہیں۔ بڑی دُور بین ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ مسلمان سمجھ گیا، مل بیٹھا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ ان کا طریق کار بڑا منفرد ہے۔ پُر اثر ہے۔ وہ اپنی فیکٹریوں میں ہیکیلے خیالات، جاذبِ نظر نظریات اور پُر کشش، انوکھی ذہنی پھلجھڑیاں بناتے ہیں، ایسی جو ہمارے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانش ورؤں کو چکا چوند کر دیں۔ اور پھر انھیں ہمارے ملکوں میں بھیج دیتے ہیں۔ ان ذہنی پھلجھڑیوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ذہنوں کو مسح کر لیں۔ تاکہ مسلمانوں کا دُرخِ اسلام کی طرف نہ ہو جائے۔ فروعیات میں ہی پھنسا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ادیب، فنکار اور دانش ور اذیتیں میسر نہ ہوتے ہیں، جو خیالات کی دنیا میں نئے نیشن چلاتے ہیں۔ اس لیے ان کا دُرخ بگاڑنے سے عام پڑھے لکھوں کا دُرخ خود بخود بگاڑ جائے گا۔ دانش ورؤں کے علاوہ یہ قوتیں طلباء پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو معصوم ہوتے ہیں اور نئی چیزوں کے متلاشی، جن کی ہنڈیا میں اُبال لانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

پھر ایک تیسرا گروہ ہے جنھیں یہ قوتیں کام میں لاتی ہیں۔ یہ گروہ مذہبی دیوانوں کا ہے۔ ایک تو یہ گروہ بہت پُر اثر ہے، دُوسرے ان کا اپنا مسلک بھی یہی ہے کہ مسلمان فروعیات میں پھنسا ہے۔ اصل کی طرف توجہ نہ کرے۔ آنا پھنسا رہے کہ بات سمجھنے کی مہلت نہ ملے۔

میرے ایک دوست یورپ میں چند سال مقیم رہنے کے بعد وطن لوٹے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایسی ۲۶ تنظیموں سے واقف ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان سمجھ نہ جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان تنظیموں نے بہت سے حربے چلا رکھے ہیں۔ مثلاً:

- (۱) ماڈرن دُنیا میں اسلام کے خلاف تحقیر کی دھار کندہ ہونے پائے۔
- (۲) ایسی صورتِ حالات پیدا کی جائے اور اسے قائم رکھا جائے کہ نوجوان مسلمان اپنے مذہبی جذبے پر شرمساری محسوس کریں۔

(۳) ایسی صورتِ حالات پیدا کی جائے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔

(۴) سیکڑ نقطہ نظر کو اُچھالا جائے۔ جمہوریت کے گُن گائے جائیں۔

میرے دوست نے بتایا کہ ان تنظیموں میں چند ایک ایسی بھی ہیں جن کا سالانہ بجٹ پاکستان کے بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ مساوات ان کی گتھی میں پڑی ہوئی ہے۔ جذبہ مساوات میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ دل میں تعصب پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کے برعکس زندگی میں اپنے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ انسان چند ایک مثبت تعصبات پیدا کرے۔ مثلاً اپنے دین کے حق میں تعصب، اپنے وطن کے حق میں تعصب، اپنے آباء و اجداد کے حق میں تعصب۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دین پر فخر کرے۔ اپنے وطن پر فخر کرے۔ قوم پر فخر کرے۔ خاندان پر فخر کرے۔

دشمنانِ اسلام ہمیشہ اس بات سے خائف رہے کہ کہیں مسلمان اپنے دین پر فخر کرنا نہ سیکھ لے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے انھوں نے ایسے خیالات فضا میں پھوڑ دیے جو دین اور وطن کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ مذہب آدمی وہ ہے جو ہنسی پیٹڈ ہو۔ جو تعصبات سے پاک ہو۔ جسے مذہب کا لحاظ ہو نہ وطن کا۔ جس کا نقطہ نظر خادجی ہو۔ آجیکٹو ہو۔ جذبات سے آلود نہ ہو۔ سیکولر ہو۔ یعنی جو مذہب کا دیوانہ نہ ہو۔ وطن کا غلام نہ ہو۔ آج کا مسلمان نوجوان مغرب کے چنگل میں پھنسا ہے۔ وہ اس کوشش میں لگا ہے کہ مذہب سمجھا جائے۔ اس حد تک سیکولر بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ دل کی گرا میوں میں رچے بسے دینی جذبے کو تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ وہ وطن کی محبت کو ایک منفی لُغض سمجھنے لگا ہے، اور اپنے دین پر نادم ہے۔

ڈاکٹر عفت سے ایک غیر ملکی کرنل نے پوچھا ”آپ کے مذہب میں سور کھانا کیوں حرام ہے؟“
ڈاکٹر عفت نے کہا ”یہ ایک حکم ہے۔ میرا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ کرنل صاحب، محکم

کی وجہ جاننا ضروری نہیں۔ اسے ماننا ضروری ہے۔“

کرنل ہنسلا۔ بولا ”جس حکم کو آپ سمجھتی نہیں اس پر عمل کرنے کا مقصد؟“

ڈاکٹر عفت ہنسئیں۔ بولیں ”حیرت ہے، کرنل صاحب کہ آپ فوجی افسر ہوتے ہوئے حکم کے مفہوم سے واقف نہیں۔“ کرنل کھسیانا ہو گیا۔

عفت بولیں ”کرنل صاحب، ہر کلب کے اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ مذہب بھی ایک کلب ہے۔ یا تو آپ کلب کے ممبر نہیں یا نہ نہیں۔ یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن رکن بن جائیں تو پھر چون و چرا کی گنجائش نہیں رہتی۔“

ہماری مشکل یہ ہے کہ مغرب کے زیر اثر ہم عقل کے اس قدر دلوں بنے بیٹھے ہیں کہ کچھ حد نہیں۔ حالانکہ ہر فرد جسے عقور طہی سی سوجھ بوجھ بھی حاصل ہے، اس حقیقت کو جانتا ہے کہ زندگی میں بہت کم باتیں ایسی ہیں جن پر عقل حاوی ہے، اور بہت زیادہ باتیں ایسی ہیں جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، عقل کو ہم نے بت بنا رکھا ہے، اس حد تک کہ یہ مانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، ہم عقل کے معیار کو اللہ تعالیٰ پر بھی عائد کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ہم سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے پیچھے ضرور کوئی ایسی حکمت ہوگی جو ہم عقل کے زور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اس کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر کامیاب نہ ہوں تو حکم پر شک کرنے لگتے ہیں۔

خیر یہ تو مجبہ معترضہ تھا۔

میں دین اور وطن کے لیے مثبت تعصبات کی بات کر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندو قوم بحیثیت قوم ہم سے بہتر ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے دھرم اور دیش کے لیے تعصبات پال رکھے ہیں۔ ان کے دلوں میں جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور جس قوم میں انتقام کا جذبہ نہیں وہ قوم قیام سے محروم رہتی ہے۔

تقسیم کے وقت جو کچھ مسلمانوں پر بیتا تھا، وہ اگر ہم یاد رکھتے تو بہت دُنیاتک

جذبہ انتقام ہم میں شگلتا رہتا۔ لیکن ہم اسے بھول گئے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رکھنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندو اس بات کو نہیں بھولا کہ ان کے ملک کا بٹوارہ کر دیا گیا ہے۔ وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آپ اسے جو بھی چاہے سمجھیں، میں اسے ہندو قوم کی عظمت کی دلیل سمجھتا ہوں۔

گزشتہ تیس برس میں ایک اندازے کے مطابق، بھارت میں بیس ہزار ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں۔ اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایک بھی فساد نہیں ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بھارتی بھائیوں سے کہتے ہیں: دوستو! بے شک مسلمانوں کے خون سے ہوئی کھیلو۔ ہم مذہب لوگ ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل میلا نہیں کرتے۔ الحمد للہ کہ ہم منتقم مزاج نہیں ہیں۔

گزشتہ صدیوں میں بھارت میں جس نئے مذہب نے سر اٹھایا، ہندوؤں نے اسے بڑی سوجھ بوجھ سے ہندومت میں جذب کر لیا۔ بدھ ازم ایک عظیم مذہب تھا جس کے اصول ہندو مت سے مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ہندوؤں نے بدھ ازم کو گلے لگایا، اس کا مٹھ چوما، گود میں بٹھایا اور بالآخر اس کے سر پر چوٹی رکھوا دی، ماتھے پر ٹیکا لگا دیا۔ حتیٰ کہ وہ ہندومت کے رنگ میں رنگا گیا۔ جین مت بھی یونہی ہندومت میں جذب ہو کر رہ گیا۔ پھر سکھ ازم تھا جو ایک طاقتور جوشیلا، مارشل، سادہ اور مخلص مذہب تھا، جو ہندومت کے مزاج سے یکسر مختلف تھا۔ لیکن ہندوؤں نے اسے بھی رام کر لیا۔

لیکن اسلام ایک ایسا کوکڑو نکلا جو صدیوں کی آج کے باوجود ہندومت کی دیگ میں گلی نہ سکا۔

بے چارہ ہندو حیران ہے۔ ہے رام! یہ مسلمان کیا شے ہے جو کسی طور رام نہیں ہوتا۔ اچھا، یوں قابو میں نہیں آتا تو دُوسری۔ ذرا فرنگی کو جا لینے دو۔ پھر دیکھ لیں گے۔ فی الحال ایک

اور دائر چلا دیکھو۔

ہندو نے خود کو مور کے پر لگا لیے اور اعلان کر دیا کہ ہم ہندو نہیں، کانگریسی ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر سیکولر ہے۔ ہمارا مقصد شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانا ہے۔ پھر جب یہ حربہ بھی نہ چلا اور پاکستان وجود میں آ گیا تو ہندو کا جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ اور بھڑکا اور اس کی سیاست اکھنڈ بھارت پر مرکوز ہو گئی۔

اگر آج تک ہم بھارت کی دست برد سے بچے ہوئے ہیں تو میری دانست میں اس کی دو وجہیں ہیں :

ایک تو ہمارے عوام میں مثبت جذبہ موجود ہے، اور دوسرے ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان کو تاخیر ایزدی حاصل ہے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد

پلوٹھو ہار کے دو جڑواں شہر

مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن دراصل ایک دوسرے سے بہت دور دو شہر واقع ہیں۔

دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔

ایک شہر اچھیلے، دستار سجائے، لہتے ہیں پھڑی پکڑے کھڑا ہے۔ دوسرا ہارڈ کارنگلے، ”بو“ سجائے ہیٹ لنگٹے کھڑا ہے۔

ایک رشتوں کی دلدل میں لت پت شور و شغب کا متوالا، بھڑکی طرح جذبات کی شدت سے ”جھن جھن“ کرتا ہے۔ دوسرا رشتوں سے بے نیاز، خاموش، متوازن، کسے را با کسے کا سہے نہ باشد کا متوالا۔

ایک دل ہی دل ہے، دوسرا مغز ہی مغز

ایک ”اساں“ ہی ”اساں“، دوسرا میں ہی میں

ایک میلا میلا آوارہ منش عاشق مزاج

دوسرا اُجلا اُجلا، محبوبیت سے سرشار

ایک اصل ہی اصل، دوسرا نقل ہی نقل

ایک قدیم، دوسرا جدید

دونوں شہروں میں صرف ایک بات مشترک ہے کہ وہ پوٹھوہار میں واقع ہیں۔
بنیادی طور پر پوٹھوہار ایک گلی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی گلی۔ یہ گلی گزرگاہ
کا کام دیتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ صغیر کی عالی شان ماڈی کی ڈیوڑھی ہے۔

بدقسمتی سے یہ گزرگاہ گلی بڑی ہری بھری تھی۔ جاذبِ نظر تھی۔ ہر گزرنے والا اسے دیکھ کر واہ
کھینے پر مجبور ہو جاتا اور پھر گزر جانے کی بجائے رُک جاتا۔ سستانے کا فیصلہ کر لیتا۔ اس کی جاذبیت
صرف سرسبز کی دجہ سے نہیں تھی۔ ایک تو منظر کا حسن، دوسرے ٹھنڈے اور شیریں چشمے، دروہل آنے
والی خنک ہوا، گل بوٹے اور پھل۔

بس اس ایک بات کی دجہ سے پوٹھوہاریوں کے لیے مشکلات پیدا ہو گئیں۔
طرح طرح کے لوگ اس گلی سے گزرتے رہے: حملہ آور، صوفیائے کرام، سیاح، طالع آندہ
اور طلبِ علم کے مارے ہوئے۔ ایک دور میں اس علاقے میں کئی ایک معروف درس گاہیں قائم تھیں،
جہاں دنیوی اور دینی دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔

اس گلی میں آمد و رفت کی گہما گہمی لگی رہی، جو یہاں کے باسیوں کے لیے افراتفری کا باعث
بن گئی۔ ذاتی تحفظ کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہا۔ لوگ طبعاً جنگجو بن گئے پھر آپس میں لڑائیاں چھیڑ لیں۔
مؤرخ بال کی کھال اُتارنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ اب تک اس گلی کے طول و عرض پر
جھگڑ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، یہ راہ داری یہاں سے وہاں تک تھی۔ کوئی کہتا ہے، نہیں، یہ راہ داری
تو وہاں سے یہاں تک تھی۔

پھر اس کے نام کے بارے میں بھی کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ پہلے یہ علاقہ
بے نام تھا۔ ایک مرتبہ شہنشاہ جہانگیر ادھر آ نکلا۔ کہنے لگا: یہ علاقہ تو ادھل کی پیٹھ جیسا ہے۔ کہیں
ادھان کھیں نہ ان کھیں کو ہاں۔ اس پر اس علاقے کا نام ”پیٹھ ہار“ پڑ گیا۔ یعنی پیٹھ جیسا جو بعد میں بگڑ کر
پوٹھوہار ہو گیا۔

آج بھی اس راہداری میں کئی ایک مقام ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی

ہے۔ صن ابدال پہاڑیوں سے گھرا سرسبز پیالہ ہے۔ باغات اور چشموں کا سنگم واہ ہے
اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے صحرا بھی تھے۔ مثلاً ٹیکسلا کا نام پہلے صحرائے کالا تھا۔
ان ریگ نواروں میں ایک جگہ تھی جہاں ایک ہندو راول نے ایک آبادی قائم کی اور اس کا
نام پنڈی رکھا۔ مطلب ہے چھوٹا گاؤں۔

یہ چھوٹا گاؤں آہستہ آہستہ ایک اڈا بن گیا۔ کیونکہ یہاں سے کشمیر کو سڑک جاتی تھی۔ گھوڑوں
کا اڈا۔ کیوں کا اڈا۔ بار برداری کے جانوروں کا اڈا۔ یہاں سے تانگے سرنگر جاتے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ
پڑاؤ آتے جہاں گھوڑے اور گاڑی بان بدل جاتے۔ یعنی پنڈی کی واحد اہمیت مواصلاتی تھی۔
پھر انگریز نے دیکھا کہ یہ جگہ چھاؤنی کے لیے موزوں ہے۔ انھوں نے شہر کے پاس چھاؤنی بنا
دی چھاؤنی میں بیرے خانساے اور غنہ گاراگئے۔ پھر پٹھوں نے تجارتی امکان کو دیکھ کر یہاں بودو باش اختیار
کر لی۔

پنڈی کی تین باتیں مشہور ہیں : زمین ہوار نہیں۔ درخت پھلدار نہیں۔ موسم کا اعتبار نہیں۔
موسم کے لحاظ سے پنڈی ایک خاتون ہے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ محترمہ کب مسکرائے چھوڑ کر گھوڑنا
شروع کر دیں۔ اگرچہ میں اسے بڑے لگیں یاد سبر میں سن سڑوک ہو جائے تو باعث تعجب نہ ہوگا
پنڈی میں مستقل رہائش اختیار کر لو تو دو اثبات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک پیٹ پھول جاتا
ہے، باؤگڑہ گھومنے لگتا ہے۔ دوسرے قبل از وقت بال سفید ہو جاتے ہیں، جھڑنے لگتے ہیں اور نیچے
ٹانٹ نکل آتی ہے۔

چھوٹے ہوئے پیٹ اور چمکی ہوئی ٹانٹ کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ شکل و صورت سے
آپ معتبر نظر آنے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ معتبری ادب پر ہی اوپر کی ہوتی ہے۔ پھر بھی معتبری تو ہوتی ہے۔ اور وہ
بھی مفت کی۔

پتا نہیں کیوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں کے مقامی لوگ معتبر نظر آنے کے بڑے
متوالے ہیں۔ چاہے وہ ادب پر اوپر کی ہو یا بھیر کی۔ وہ رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور معتبری رکھ رکھاؤ میں
بڑی مدد و معاون رہتی ہے۔ بہر حال، یہ خصوصیت یہاں کی آب و ہوا کا تحفہ ہے۔

ہوا تو یہاں کی بڑی عمدہ ہے نہ اس میں دھواں ہوتا ہے اور نہ کارخانوں کی پیدا کردہ آلودگی۔ چونکہ پہاڑیوں سے آتی ہے اور پہاڑیاں چیل کے درختوں سے چھان کر بھیجتی ہیں لہذا تازہ ہوتی ہے، پاکیزہ ہوتی ہے۔

داہلپنڈی کا پانی بہت پتلا اور خشک ہے۔ اعلیٰ کا کہنا ہے کہ یہ پانی شورہ ہی شورہ ہے۔ اس میں بوٹیاں نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے معدے میں جا کر شور شرابا پیدا کرتے ہیں۔

پندرہ بیس سال پہلے یہاں دونوں پانی دستیاب تھے۔ شورے والا بھی، بوٹیوں والا بھی اور یہ پنڈیوں کی مرضی پر موقوف تھا کہ چاہیں تو شورے والا پیئیں، چاہیں تو بوٹیوں والا۔

اُن دنوں پہاڑیوں کی جانب سے بہت سے نالے پنڈی کی طرف بہتے تھے۔ ان میں برساتی بھی تھے اور چشمے بھی۔ چشموں کا پانی نہ شور تھا اور نہ خشک۔ اس میں دھاتیں تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا تھا۔ بوٹیاں ہی بوٹیاں۔ ہم نے ترقی کے جذبے کے تحت جلد بازی کی اور سارے نالے اور چشمے داول ڈیم میں ڈال دیے۔

پنڈی کی مٹی میں پکڑ نہیں۔ قیام نہیں۔ بڑی بھجڑی ہے۔ جیسے نوجوان کی طبیعت ہوتی ہے۔ ذرا سا پانی چلے تو یہاں کی مٹی اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑتی ہے۔ اتنی ہرجائی ہے کہ بارش کا ہر قطرہ اسے انگلی لگائے پھرتا ہے۔

مٹی کی اس خصوصیت کی وجہ سے جیالوجی کے ماہر بڑے فکر مند ہیں۔ انھیں خوف دہن گیر ہے کہ اگر پہاڑیاں یونہی شدت سے بتاشے کی طرح گھلی گئیں تو جلد ہی پہاڑیاں سبٹ میدان بن جائیں گی۔ صرف چند ایک ہزار برس ہیں۔

پنڈی کی مٹی کی اس خصلت نے بلدیہ کو زچ کر رکھا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں میٹھ جاتی ہیں، پُل ننگے ہو جاتے ہیں اور باغیچوں کی سجاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔

اسی وجہ سے پنڈی کے مُردوں کی کیفیت بڑی تکلیف دہ ہے۔ مٹی میں پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے یہاں لحد والی قبر نہیں بن سکتی۔ سلاخی والی قبر بنتی ہے۔ مُردے کو نیچے ٹاڈتے ہیں۔ اُوپر پتھروں کی سیل رکھ کر

بکس بنا دیتے ہیں۔ پہلی ہی بارش میں اطراف کی مٹی گھل جاتی ہے اور سسلیں نیچے گر پڑتی ہیں۔ سب چوڑوں کا غذا بھلا کرے، درنہ روز قیامت تک مُردوں کی چھاتیوں پر پتھر کی سلوں کا بوجھ پڑا ہے۔

پنڈی کے بہنے والے شاید اسی مٹی سے بنے ہیں، اس لیے ان کی طبیعت بھی بھر بھری ہے۔ اس میں استحکام نہیں۔ جذبے کی لہر رتی ہے اور ان کی اُلگی پکڑ کر ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے۔

عذبات ہی ان کا اوڑھنا بھونا ہے۔ تعلیم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ تہذیب نو انھیں اپنے رنگ میں رنگ نہیں سکی۔

پانی کے شور سے کی وجہ سے پنڈیوں کی طبیعت میں شور اٹھ رہی ہے۔ پیار میں شدت، غصے میں شدت، نفرت میں شدت۔ دوست بن جائیں تو تن من دھن سے بنیں گے۔ مدد کرنے پر تنگ جائیں تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ انتقام لینے کی ٹھان لیں تو یہ جذبہ پشت در پشت چلے گا۔

پنڈیئے نام کے راجے نہیں، مزاج کے راجے ہیں۔ رکھ رکھاؤ پر جان دیتے ہیں۔ گھر میں کھانے کو ہونہ ہو مہمان بچ کر نہ جائے۔ یوں نوازیں گے جیسے حاتم ثانی ہوں۔ دوست مشکل میں پڑ جائے تو اس بات کا انتظار نہیں کریں گے کہ وہ مدد کے لیے پکارے، یوں چھاتی ٹھونک کر باہر نکلیں گے جیسے اپنے زلمے کے واحد مشکل کشا ہوں۔

چاہے زندگی حرام ہو جائے، چاہے سارا دھن ٹٹ جائے، چاہے جان سے جانا پڑے لیکن عزت پر حرف نہ آئے۔ برادری میں سر اُٹھنا ہے۔ موچھ اکڑی رہے۔ طرہ لہراتا ہے۔

پنڈیوں کا سب سے بڑا جذبہ گھری عزت ہے۔ اگر گھری عزت ایک ہزار روپیہ ماہوار خرچنے سے قائم ہو سکتی ہے تو وہ ایک ہزار روپیہ کمانے کے لیے تن من کی بازی لگا دیں گے لیکن ایک ہزار کمانے کے بعد اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں گے۔ گیارہ سو کمانے پر کسی صورت تیار نہ ہوں گے۔ ”ہٹاؤ، کون مشقت میں پڑے“

جب گھری عزت کا انتظام ہو جاتا ہے تو ان کے اندر کا محنت کش معدوم ہو جاتا ہے اور راجا باہر نکل آتا ہے۔ محنت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے طرے کو ماد لگا لیتا ہے اور موچھ مڑنے لگتا ہے۔

پنڈیے خوش باش لوگ ہیں۔ انہیں کھانے سے دلچسپی ہے، کھلانے سے دلچسپی ہے۔ ملنے لانے سے دلچسپی ہے۔ محفل سجانے سے دلچسپی ہے۔ کھیل تماشے سے دلچسپی ہے۔ خاندانی جھگڑوں کی لت لگی ہے۔ دوستیاں بھی بہت، دشمنیاں بھی بہت۔ روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنا لباس پہنتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے رسم و رواج پر شرماتے نہیں، اُلٹا فخر کرتے ہیں۔

پنڈیے کا ناسننے کے بہت شوقین ہیں۔ زندہ ناچ گانا ہو تو کیا بات ہے۔ ویل دینے کی رسم چل نکلے تو اپنے رنگ میں آجاتے ہیں۔ پھر چاہے گانے والا ہو یا والی۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس یہی دھن سوار ہو جاتی ہے کہ ویل دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

پُرانے زمانے میں پنڈی ایک قصبہ تھا جس کے ارد گرد دھوڑے ٹھہڑے گاؤں آباد تھے۔ ایک طرف ”دلتہ“ تھا دوسری طرف ”سرریٹ“ تھا اس سے پرے ”جھنڈا“ اور ”دور“ ڈھیری۔

اس زمانے میں پنڈی شہر میں سب سے اہم جگہ راجا بانا راجی جہاں راجے موکھ مروڑے، طرہ لہراتے گھومتے پھرتے تھے۔ اس بازار میں کھانے پینے کی دکانیں عام تھیں جہاں بڑے بڑے کھاٹ اور تخت بچھے رہتے جن پر بیٹھ کر تھوہ پیا جاتا، گوشت کے چپلی اور سیرج کباب نوش کیے جاتے۔

دوسری اہم جگہ ایک سڑک تھی جسے مری روڈ کہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ شہر پھیلا گیا۔ گرد و زواج کے گاؤں شہر کے محلے بن گئے۔ مری روڈ پر تانگوں کے ساتھ ساتھ بسیں چلنے لگیں۔

پھر پاکستان کے قیام کے بعد دفعتاً مری کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس سے پہلے مری ایک ہل اسٹیشن ضرور تھا لیکن صحت افزا مقام نہ تھا، کیونکہ بہت گیلیا تھا، بارشیں زیادہ ہوتی تھیں، ہوائی سے بھری رہتی تھی۔

تقسیم سے پہلے برصغیر میں بہت سے ہل اسٹیشن تھے جو ہل اسٹیشن ہونے کے علاوہ صحت افزا مقام بھی تھے۔ لہذا ہل اسٹیشنوں میں مری کی حیثیت شو دھرائی کی سی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دفعتاً یہ شو دھرائی باہمی بن گئی۔ چونکہ مری واحد ہل اسٹیشن تھا جو ہمارے حصے میں آیا تھا لہذا مری کی اہمیت

بڑھ گئی۔ ساتھ پنڈی کی حیثیت بھی بڑھی۔

پاکستان کے لیے مری ایک ”ہالیڈے ریزارٹ“ بن گیا۔ لوگ دُور دُور سے آنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ مری کی مال روڈ پرفیشن پریڈ ہونے لگی جو آج تک جاری و ساری ہے۔ مگر اس پریڈ میں کبھی کسی مقامی خاتون نے شرکت نہیں کی۔ مقامی آبادی اس پریڈ کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ پوچھو باری خاتون کی عظمت کی دلیل ہے۔

عام طور سے ایسے علاقے جہاں ”ہالیڈے میکرز“ کا اجتماع ہوتا ہے، ہالیڈے موڈ میں رہ جاتے ہیں اور عیاشی کی فضا کی لپیٹ میں آکر ان کے اخلاق گر جاتے ہیں لیکن مری کے لوگوں نے آج تک اس ہالیڈے اسپرٹ کے اثر کو قبول نہیں کیا۔

عام طور پر یہ اصول ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں رہنے والی خواتین جنسی لحاظ سے گم ہوتی ہیں اور ان میں ضبط کے عنصر کا فقدان ہوتا ہے۔ مثلاً کانگرہ ہے، چھبہ ہے، شملے کے زیریں علاقے ہیں۔ لیکن پوٹھوہار اور آزاد کشمیر اس اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ غالباً اس لیے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کی خوشبو ہے اور وہ عزت کو سب سے بڑا وصف سمجھتے ہیں۔

تقسیم کے بعد بھارت نے کشمیر کو ہتھ لیا جس کی وجہ سے کشمیر کا راستہ بند ہو گیا۔ تجارتی نقطہ نظر سے یہ پنڈی پر بہت بڑی ضرب تھی۔ اس ضرب تلے پنڈی کی ترقی رک گئی اور یہ شہر کئی سال تک بیٹھا ادنگھٹا رہا۔

پھر دفعۃً پوٹھوہار میں ایک بھونچال آگیا۔

صدر ایوب نے پوٹھوہار میں اسلام آباد کو پاکستان کا دارالخلافہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس پر صاحبوں، افسروں اور کلرکوں کی اسپیشل گاڑیاں دھڑا دھڑ پنڈی پہنچنے لگیں۔ چک لالہ کی باکیں اور پنڈی کے مصافحات لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئے۔

پھر پنڈی کے شمال میں مرگلہ پہاڑیوں کے قریب اسلام آباد نے سر اٹھایا، مغربی طرز کے خوبصورت بنگلے، فینٹس، کوارٹر، مارکیٹیں، ہموار مٹلی کارپٹ سڑکیں، عجیب و غریب وضع کے

عالی شان دفتر، انوکھی وضع کے روایت سے بہت کم مسجدیں اور چاروں طرف درخت ہی درخت، بوٹے ہی بوٹے۔ ایسے درخت اور بوٹے جو پاکستان میں کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

اسلام آباد کا شہر اک معجزہ بن کر رہنا ہوا۔

نورپور اور سید پور کے درمیان کا وہ زیریں علاقہ جہاں اسلام آباد تعمیر ہوا ہے، ایک بنجر دیرانہ تھا جہاں کلّ زدہ زمین اور خادار بھارتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لوگوں کا کناٹھا کہ کلّ کی وجہ سے یہاں کچھ اگ نہیں سکتا۔ اس خطے میں کرلے سانپ رہتے تھے۔ بڑے بڑے کرلے تھے۔ نیولے تھے۔ اس علاقے میں دور بن جیسی پتلی سڑکیں بنی ہوئی تھیں جو پنڈی سے نورپور اور سید پور جاتی تھیں۔ یہاں حشرات الارمن کی وجہ سے لوگ پیدل چلنے سے گریز کرتے تھے۔ اس علاقے میں آج ایک خوبصورت شہر پھولوں سے مزین سڑکیں اور باغات اور لاکھوں درخت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اسلام آباد ایک معجزہ ہے۔ واقعی سی ڈی کا کام قابلِ تحسین ہے۔ اس شہر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ نام کے سوا اس میں نہ اسلامی رنگ ہے نہ پاکستانی رنگ۔

درحقیقت اسلام آباد ابھی تک شہر نہیں بنا۔ اس میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک یہ شہر مغرب زدہ اہل کاہنوں کی ایک کالونی ہے۔ یہاں فالتوں کی باتیں ہیں۔ گریڈوں کے تذکرے ہوتے ہیں۔ دفتری سیاست کی سرگوشیاں اور سٹیٹس کی ذات پات رائج ہے۔ یہاں پاکستانی کلچر ڈرامٹک دوسرے ممالک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اہل کاہنوں کے بیٹے بیٹیاں مغربی دھنوں پر امپورٹڈ ناچ ناچتے ہیں۔ اسلام علیکم کی جگہ لاٹی اور خُدا حافظ کی جگہ بائی کیستے ہیں۔

اسلام آباد کے قیام کے بعد پنڈی کی کاپیاہلی دیکھتے ہی دیکھتے مری روڈ گویا نالی سے دریا بن گئی۔ اتنی فراخ ہو گئی کہ ڈبل روڈ بن گئی۔ دیکھیں دونوں شہروں کے درمیان یوں چلنے لگیں جیسے وال کھلاک کا پنڈولم چلتا ہے۔ سڑک کے کنارے مارکیٹیں اور اسٹور بن گئے۔ دونوں شہروں کے درمیان ویران علاقہ آبادیوں میں بدل گیا۔

آج ہم آباد ایک انٹرنیشنل شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

آج پنڈی ایک اونگھتا ہوا شہر نہیں، ایک جاتی وچوند رو بہ ترقی سٹی بن رہا ہے۔

پنڈی اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں تو خوشی سے بھولے نہیں سماتے۔ البتہ صاحبیت کے چڑھتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر سسے سسے نظر آتے ہیں۔ پنڈی کو دورِ جلدی کی ترقی کی لپیٹ میں دیکھ کر گھبرائے ہوئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خائف ہیں کہ کہیں ترقی کی رو میں بہ نکلنے سے روایت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

انہیں اپنے رہن سہن اور لوک درٹے سے اتنا لگاؤ ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

پوچھو لاریے جو سالہا سال مری کی فیشن پر یڈ کو دوسے دیکھتے رہے، دامنِ ترنم ہشیار ہاش کی نظر سے دیکھتے رہے، گمانِ غالب ہے کہ وہ صاحبیت کی اس یلغار سے متاثر نہیں ہوں گے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ مستقبلِ بعید میں ایک روز پنڈیئے اسلام آباد پر یلغار کر کے اسے شہر بنادیں اور اس شہر پر پوچھو لار کا رنگ چڑھا دیں۔

پہلے پنڈیئے اسلام آباد کو پنڈی کا ایک مضاف سمجھتے تھے لیکن اب وہ پنڈی کو اسلام آباد کا ایک محلہ سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام آباد پر وہ فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ شاید اس لیے کہ پوچھو لار کے معروف بزرگ امام شاہ بری لطیف نے ڈھانی سو سال پہلے فرمایا تھا کہ نور پور کے گرد و نواح میں ایک شہر آباد ہو گا جو اسلامی دنیا کا مرکز بنے گا۔

کاش کہ اسلام آباد کے معماروں کو شاہ بری لطیف کی عظمت کا احساس ہوتا اور وہ ان کے روہنے کو "اڈٹ آف ہاؤنڈز" نہ کرتے بلکہ اسے اسلام آباد کا مرکز مان کر اس کے ارد گرد شہر پلان کرتے۔

عورت کا المیہ

آج کل عورت کا تذکرہ عام ہو رہا ہے۔ اخباروں میں، گفتگوؤں میں، جائزوں میں، بحثوں میں، چائے خانوں میں، مسجدوں میں، ادبی محفلوں میں۔

جب سے اسلامائزیشن کی بات چلی ہے، عورت کا تذکرہ بھی چل نکلا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اسلامائزیشن کے عس کا عورت سے خصوصی تعلق ہے۔

چند ایک دانشور چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ عورت کا ذکر چل نکلا۔ ایک نے کہا: عورت کی تمام تر توجہ بننے سنورنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ دوسرا بولا: عورت بڑی باتونی ہے۔ کٹر کٹر باتوں کے ڈھیر لگانے کی شوقین ہے۔ تیسرے کہا: عورت کی سوچ کبھی ذات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ چوتھا بولا: مرد کی ذہنی اڑان میں عورت واحد رکاوٹ ہے۔ وہ سب عورت کے عیب گننے میں مصروف تھے۔ پھر کسی تفصیل پر بحث پھر گئی۔

ان کے قریب ایک شخص چپ چاپ بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک دانشور نے اُس شخص سے مخاطب ہو کر پوچھا کیوں صاحب، اس موضوع پر آپ کی کیا رائے ہے؟ وہ شخص بولا ”جناب، سبحان اللہ! کیا موضوع ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے آپ اس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ ذرا نہیں اکتائے“

شکر ہے عورت میں اس موضوع کی عظمت کا شعور پیدا نہیں ہوا، ورنہ ہم مردوں کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔

عورت کا المیہ یہ ہے کہ وہ بات کی عیب جوئی پکڑ تو جڑ دیتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی بات کس ذوق و شوق سے ہو رہی ہے۔

جب کڑی لگا ہیں اس کا جائزہ لیتی ہیں کہ دوپٹہ سر کا ہوا تو نہیں، جسم کے بیج و خم اُبھرے ہوئے تو نہیں، بال جال بنے ہوئے تو نہیں۔ عورت لگا ہوں کا کڑا پن دیکھتی ہے یہ نہیں دیکھتی کہ نظریں جائزہ لے رہی ہیں۔ آخر جائزہ لینے کے لیے کوئی بہانہ تو ہونا ہی چاہیے۔ بہانے کا سہارا لیے بغیر بے باکانہ جائزہ لینا — اُونہوں! مرد فطری طور پر ایسی جسارت سے محروم ہے۔

عورت نے ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ ہم مرد لوگ اس کی باتیں کرنے اور اس کا جائزہ لینے پر مجبور ہیں اور اس کے لیے بہانے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ پہلی غلطی تو ارسطو نے کی۔ سوچے سمجھے بغیر اعلان کر دیا کہ انسان عقلی حیوان ہے۔ بے شک عقل کا آنا جانا تو ہے لیکن عقل کا قیام نہیں۔ عقلیہ بات سوچنے کی صلاحیت تو ہے لیکن کیا خواہش بھی ہے؟ کبھی کبھار مُخھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہم عقل کو اپنا لیتے ہیں۔ ویسے بنیادی طور پر انسان عقلی نہیں، جذباتی حیوان ہے۔

ارسطو کی اس بات نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ کچے پھل کو یہ زعم ہو گیا کہ وہ پکا ہوا ہے۔ اس پر وہ مارے خوشی کے ڈال سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔

دوسری غلطی سائنس دانوں نے کی۔ اُنھوں نے بن سوچے سمجھے کہ دیا کہ مرد اور عورت ایک مخلوق ہیں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ دونوں دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ دونوں کے بازو ہیں ٹانگیں ہیں۔ دونوں کے شانوں پر سر رکھا ہوا ہے۔ اور سر پر مُخھ ہے، خود خال ہیں۔ لہذا یقیناً وہ ایک سپیشی (SPECIE) ہیں۔ سائنس دانوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ سطحی مشاہدے کے بل بوتے پر فیصلہ دے دیں گے۔ اُنھوں نے اس حقیقت کو نہ جانا کہ اگرچہ دونوں ایوان باہر سے ایک جیسے ہیں لیکن اندر سے قطعی طور پر مختلف اور متضاد ہیں۔

سائنس دانوں کی اس خوش فہمی نے فرد اور عورت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے، اس مفروضے کی بنا پر کہ دونوں ایک ہی مخلوق ہیں۔ مرد سمجھتا ہے کہ میں عورت کو سمجھتا ہوں۔ عورت سمجھتی ہے کہ میں مرد کو سمجھتی ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ مرد عورت کو سمجھتا ہے اور نہ عورت مرد کو سمجھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش یا خواہش ہی نہیں ہے۔ کیسے ہو، جب پختہ یقین ہو کہ ہم ایک ہی مخلوق ہیں؟ میری دانست میں عورت مرد کی نسبت برتر مخلوق ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان کی عظمت جذبے سے ہے عقل کی بنا پر نہیں تو عورت یقیناً بہتر مخلوق ہے۔

جذبے کی عظمت سے انکار کرنا ممکن نہیں، کیونکہ محبت، خدمت، قربانی، میل ملاپ، رشتے، یہ سب اوصاف جذبات پر استوار ہوتے ہیں۔ جذبات جوڑتے ہیں۔ عقل کاٹتی ہے۔ یہاں تک کہ ایمان بھی جذبے کے زور پر پیدا ہوتا ہے۔ عقل تو شکوک و شبہات کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

سب سے پہلی عقل کی بات یا دلیل ابلیس نے کی تھی۔ کہنے لگا: یا بادی تعالیٰ! میں اسے سجدہ کیسے کروں؟ میں برتر ہوں۔ یہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے۔ اگرچہ مرد اور عورت دونوں میں جذبات موجود ہیں لیکن عورت کے جذبات زیادہ لطیف ہیں۔ ان میں قیام ہے معصومیت ہے۔ روانی ہے۔

مثال کے طور پر مرد کے جذبات ہارمونیم کی سُر سے مشابہت رکھتے ہیں۔ پردے کو جتنی دیر دبائے رکھو گے، سُر پیدا ہوتی رہے گی۔ چھوڑ دو گے تو ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس عورت کے جذبات کو تاروں والے ساز مثلاً سارنگی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ کسی تار کو چھیر دو تو اس کے ساتھ کے تار بھی لرز مٹ میں آجائیں گے۔ مضراب ہٹا لینے کے بعد بھی سُر یہی گونجتی رہیں گی۔ تموجات جاری رہیں گے۔

عورت کا جذبہ جسم کے بند بند میں رچا ہوتا ہے۔ اور اس رچاؤ میں ایک مٹھاس ہوتی ہے۔ ایک روانی۔ ایک لطافت۔

عورت میں سنسیٹیویٹی یا حساسیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر کاریسور زیادہ حساس ہوتا ہے۔ لہذا وہ مرد کی نسبت زیادہ جیتی ہے۔ خوشی اور غمی دونوں کیفیتیں اس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کیفیتوں کے متوجہات دیر پا اور گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مرد پر یہ کیفیتیں سطحی اور وقتی اثرات رکھتی ہیں، جیسے کسی تالاب میں ایک پتھر پھینک دو تو نتیجتاً جو لہریں پیدا ہوں گی وہ عورت کے جذبات کی آئینہ دار ہوں گی۔ گہرائیوں سے اُٹھیں گی اور سطح پر چاروں طرف پھیل جائیں گی۔

اسی حساسیت کی بنا پر عورت مرد کی نسبت زیادہ جیتی ہے۔ چونکہ زندگی میں دکھ کا عنصر زیادہ ہے اس لیے عورت کی زندگی میں دکھ زیادہ ہوتا ہے۔ ہم مرد لوگ دکھ اور سکھ کے مفہوم سے اتنی گہری واقفیت نہیں رکھتے جتنی عورت رکھتی ہے۔

عورت کو فطرت کی سب سے بڑی دین مٹا ہے جو انسانی نسل کے تحفظ اور پرورش کا ذریعہ ہے۔ جو ایک ایسا دھارا ہے جس سے بہت سے مثبت جذبات پھوٹتے ہیں۔

دقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نئی روش کے تحت عورت نے لڑکی بن کر جینے کو اپنا لیا ہے۔ وہ عورت بن کر جینے سے الرجک ہو گئی ہے۔ پُرانے زمانے میں عورت کا میاں صحت مند مُمیئار ہوا کرتی تھی۔ اب پچکے ہوئے کالوں والی زرد رو اینمک لڑکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورت میں مٹا کا دھارا سُکھتا جا رہا ہے۔

وہ بچوں کو اپنانے سے شرمانے لگی ہے۔

اسے اماں کہلوانے سے چڑ ہو گئی ہے۔ کہتی ہے: مجھے آپاکہ کر بلاؤ۔ باجی کہو۔

ماں نہ کہو۔

وہ بچوں کو دودھ نہیں پلاتی۔ اس سے بگڑ خراب ہو جاتی ہے۔ بچے کو دودھ نہ

پلانے کی وجہ سے بچوں سے ماں کا رشتہ کمزور رہ جاتا ہے۔

ممتا کے جذبے کا صرف بچوں سے ہی تعلق نہیں ہوتا، میاں سے بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ظاہری پھوپھاں اور میں کے باوجود میاں درحقیقت ایک بچہ ہوتا ہے، اس لیے سہاگ اپنے قیام کے لیے بڑی حد تک ممتا کا محتاج ہے۔ پنجابی میں مثل مشہور ہے کہ دو ہٹی گئی ماں ہوندی اسے۔ مطلب یہ کہ بیوی درپردہ ماں ہوتی ہے۔

یہ لڑکی پن کا جنون کیسے پیدا ہوا؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ جنون روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

چند مشاہیر نفسیات کا مفروضہ ہے کہ چونکہ عورت کی سب سے بڑی خواہش توجہ طلبی اور چاہا جانا ہے، اس لیے اس کا روپ بہرہ مرد کی خواہش کے تابع ہے۔ اگر مرد موٹی عورت کو پسند کرنے لگیں تو عورتیں موٹی ہوتی جائیں گی۔ اگر مرد بھینگی عورتوں کو پسند کریں تو عورتیں بھینگی ہو جائیں گی۔ اگر مرد اٹیمک عورتوں کو پسند کرنے لگیں تو عورت کا جسم خون بنا نابند کر دے گا۔ پرانے زمانے میں گلاب سے گالوں کو پسند کیا جاتا تھا۔ آج کل پچکے ہوئے گالوں کو پسند کیا جاتا ہے۔

پتا نہیں یہ مفروضہ کس حد تک درست ہے۔ بہر صورت یہ امر مسلمہ ہے کہ آج کل ہمارے ہاں عورت پر لڑکی بن کر جینے کا جنون طاری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیشن زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا، کیونکہ یہ فطرت کے منافی ہے۔ اور فطرت کو بقائے نوع انسانی مقصود ہے۔ فطرت کا منشا ہے کہ عورت ماں بن کر رہے۔

عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ محبت سے متعلق ہے۔ مرد اور عورت کی محبتوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔

مرد محبت کرنا چاہتا ہے۔ محبت کرنا اس کے بس میں ہے۔ جسے چاہے، جب چاہے، کرے۔ محبت کرنے کا طاپ یا دصال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس

عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ چاہی جائے۔ یہ فعل اس کے بس میں نہیں۔ اس کا انحصار دوسرے پر ہے۔ دوسرا چاہے، نہ چاہے۔

آج کل آزادی کے دور میں یہ بات اور بھی پیچیدہ ہو گئی ہے، کیونکہ عورت خالی چاہے جانے کی متمنی نہیں بلکہ اس بات کی خواہاں ہے کہ جو مرد اُسے پسند ہے، وہ اُسے چاہے۔ پتا نہیں کیوں ہم مردوں نے یہ خوش فہمی پیدا کر رکھی ہے کہ عورت کی چاہے جانے کی خواہش جسم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عورت سے جسمانی ملاپ کر لو تو وہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ یہ مفروضہ قطعی طور پر غلط ہے۔ عورت کو درحقیقت ایک محبت بھری گود چاہیئے۔ محبت بھرا ماحول۔ محبت بھری دفا۔

بنیادی طور پر وہ جسمانی ملاپ اس لیے گوارا کر لیتی ہے تاکہ محبت بھری فضا قائم رہے۔ ٹوٹنے نہ پائے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی ہیں جن کا مقصد صرف جسمانی ملاپ ہے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اتنی کم کہ آپ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ صورت حال نادرل نہیں۔ آپ اسے بیماری سمجھ سکتے ہیں۔ ہومیو پیتھی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو اس بیماری سے شفا دے سکتی ہیں۔

البتہ ایک بات اہم ہے۔ وہ یہ کہ ناگواری کی صورت میں بھی، جسمانی قرب کے دوران، ایک مقام ایسا آتا ہے جب عورت کا جسم جاگ اُٹھتا ہے۔ ذہن مغلوب ہو جاتا ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلی عورت میں فطرت نے ٹانک رکھی ہے۔

بہر طور ایک بات مسلمہ ہے کہ محبت کے جذبے کے تحت مرد میں جسم کی طرف رجحان عورت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ شہوانی عورتوں کے مقابلے میں ایسی عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جنہیں جسمانی ملاپ سے قطعی رغبت نہیں۔ بلکہ جن کے لیے جسمانی ملاپ

تکلیف دہ ہے۔ اور وہ اس تکلیف کو صرف اس لیے برداشت کر لیتی ہیں کہ محبت کی فضا سے محروم نہ رہ جائیں۔

اگر ایسی عورتوں کو ناعورت کہا جائے تو شہوانی عورتوں کی نسبت ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بلکہ نامرد مردوں کی نسبت بھی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

عورت کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ وہ اظہارِ محبت کر دیتی ہے، اور یوں دل سے اُتر جاتی ہے۔

دیسے ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ عورت میں جذب کر لینے یا سہ جانے کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مرد میں کرنے کی طاقت زیادہ ہے۔ اسی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر وہ لالچی بنا پھرتا ہے، اور بھینس پر حکومت کر رہا ہے۔

سہ جانے یا جذب کر لینے کی طاقت افضل تر طاقت ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اس طاقت کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ انسان کو مذہب ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ لیکن آج بھی لالچی کی طاقت کا راج ہے۔ اس کے باوجود جذب کرنے اور سہ جانے کی طاقت مذہب کے، تہذیب کے اور روحانی ارتقاء کے لحاظ سے افضل صلاحیت ہے۔ عورت کی اس خصوصیت کو بد نظر رکھتے ہوئے چاہیے تو یہ کہ وہ محبت کو بھی جذب کرے، اس کا اظہار نہ کرے اور مرد کے دل سے نہ اُترے، کیونکہ مرد تو بے پروا، بے نیاز اور بے دفاع عورت سے محبت کر تلے۔ یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ہتھیار ڈال دینے والی یا خود کو حوالے کر دینے والی عورت اس کے دل سے اُتر جاتی ہے۔ مرد کو تو چیلنج چاہیے۔

بے شک عورت محبت کو جذب کیے رکھتی ہے۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ محبت عورت کے روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے۔ لہریں لے رہی ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کا اظہار نہ بھی کرے تو بھی اس کا انگ انگ بوتا رہتا ہے۔ محبت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ آرتی میں پھول سجائے دیوتا کے گرد پھرتا رہتا ہے۔ دیوتا کو بتائے بنا پتا چل جاتا ہے کہ بجان تو مر چکی۔

سپردگی کا یہ احساس مرد کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ لہٰذا پجاریں اس کے دل سے اُتر جاتی ہے۔

ہمارے ہاں ہمت سے گھرانے ایسے ہیں جہاں بیوی نے اپنی قدر و منزلت کھو دی ہے، صرف اس لیے کہ وہ میاں پر مڑی۔

اپنی عظمت قائم رکھنے کے لیے عورت کے لیے سب سے بڑا حربہ فاصلہ ہے۔ مغرب کی عورت نے جوشِ آزادی میں اس حربے کو ترک کر دیا ہے۔ خود کو عام کر دیا ہے۔ اور اپنی قدر و قیمت کھو دی ہے۔ اسی وجہ سے وہاں شادی کی آہٹیں ختم ہو چکی ہیں۔ جنسی ملاپ کی تقدیس ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اختلاف گائے بھینسوں کے ملاپ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنسی جس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مرد نامرد ہوتے جا رہے ہیں۔ ملاپ میں لذت کا عنصر ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام میں فاصلے کی تاکید اسی لیے کی جاتی ہے کہ عورت اور جنس کی تقدیس قائم رہے۔

ڈاٹ کام

پاکستان

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی، ان دنوں میرے دل میں پاکستان کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا۔ نہ مثبت نہ منفی۔ میرے لیے پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میرے لیے ایک ایسا ڈراما تھا جو سامنے مگر دُور، بہت دُور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، ذہنی طور پر اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہیں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کُورا تھا۔

اُسی دور کی بات ہے، میرا ایک دوست تھا جمید ملک۔ تھا تو مغرب زدہ لیکن قیام پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھا۔ ایک روز میں نے ملک سے پوچھا ”بھئی، سمجھ میں نہیں آتا کہ قیام پاکستان کے لیے تم اتنے دُکھی کیوں ہو رہے ہو؟“

وہ ہنسا۔ بولا ”ظاہر ہے۔“

میں نے کہا ”ظاہر تو کچھ بھی نہیں۔“

بولا ”بھئی، اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔“

اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا ”بھائی میرے، نہ تم غماز پڑھتے ہو، نہ روزہ

رکھتے ہو، نہ تمہارے رہن سہن میں اسلامی جھلک ہے۔ پھر تم مسلمان کیسے ہوئے؟“

جمید ملک نے کہا ”اس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں تو میں یہ پوچھوں گا کہ بات کیا ہے، یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون بھوٹا یا قصور کس کا ہے۔ پوچھے بغیر میں ہندو کو پکٹنا شروع کر دوں گا۔ مسلمان ہونے کی ہی ایک نشانی ہے۔ اور میں تو بھی خالی مسلمان ہی نہیں پکٹا مسلمان ہوں، پکٹا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لیے اس نے سوچا۔ پھر بولا ”مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اوپر سے ایک تخت اتر گئے۔ تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو، فرشتہ مجھ سے کہے کہ اللہ میاں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، فرمایا ہے کہ جاؤ جمید ملک پر اس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے، تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ میاں سے میرا سلام کنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا۔ شکریہ۔ لیکن جمید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔“

جمید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گہری سوچ میں پڑا رہا۔

شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا۔ نہ اسلام کے لیے نہ پاکستان کے لیے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب مچھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے، میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیام پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے؟ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے؟ سڑکوں پر اور گلیوں میں نیتے راہ گروں کو زخمی مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جاسکتا ہے؟ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کی سٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے رُوح رواں پُرعتوی تاج تھے۔ پُرعتوی راج کو میں ایک عظیم فن کار سمجھتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کے لیے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھے گیا۔ پیش کش اعلیٰ تھی۔

اداکاری عمدہ تھی۔ لیکن پراپیگنڈہ بھونڈا تھا۔ کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ تماشاخیوں کے باہر نکلنے کے لیے ایک خصوصی راستہ کھولا گیا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا جس میں سے صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ اس لیے تماشاخی ایک دوسرے کے پیچھے لمبی قطاریں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ گلی کے ایک فراخ گوشے میں پرتھوی راج تھیٹر والی میک اپ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر عجربہ و احترام سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دامن کو جھولی بنا کر تمام رکھا تھا۔ جھولی نورٹوں سے بھری ہوئی تھی جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیام پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کے لیے ”دان“ مانگ رہا تھا۔ پرتھوی راج کو عجربہ کی تصویر بنے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریل اٹھا، لیکن جھولی دیکھ کر غصہ آ گیا۔ یہ شخص کیا توقع رکھتا ہے مجھ سے؟ جی چاہا کہ جیب سے ہاتھ نکال کر پرتھوی راج کو مٹکا دکھاؤں اور دانت پس کر کہوں ”اتنی جسارت!“ لیکن طبعاً میں ایک کمزور آدمی ہوں اور مٹھل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا ہاتھ مٹکا نہ بن سکا۔ اٹھا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتھوی راج کی جھولی ڈال دیا۔

اس رات غصے کی دجہ سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا؟ کیوں؟ میں نے پرتھوی راج کو مٹکا کیوں نہ دکھایا؟ اس کے بعد جب بھی خبر آتی کہ کسی غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں پتھر اچھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈا میرے ان پانچ روپے کے عوض کرائے پر لیا گیا تھا۔ میرے اس پانچ روپے کے نوٹ کی دجہ سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے پتھر کے دستے پر میرا نام کندہ تھا۔

پتھر اچھلانے کی وارداتیں براہی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی دجہ سے میں غنڈوں کی طرف سے پیچھے ہٹا گیا۔ پاکستان کے قریب، ادر قریب ادر قریب۔ بھارت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی دجہ سے تھی جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب تھا اور یہ نفرت کبھی کبھار

اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میراجی چاہتا، بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں ”اللہ اکبر! پاکستان زندہ باد“

اُس روز احمد بشیر اور میں بمبئی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مگر میرا ساتھی احمد بشیر طبعاً خطرے سے دوچار ہونے کا دلدادہ ہے۔ وہ پیدائشی پاکستانی ہے۔ ڈراور خوف سے بے پروا۔ خطرے کا پروانہ۔ وہ مجھے زبردستی ایسے مقامات پر لے جاتا تھا۔ دفعۃً ٹریفک رُک گئی۔ چوک میں ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ ”سب پیدل چلنے والے بائیں لہٹ کی پٹری پر آجائیں۔“ کسی نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا۔ تمام لوگ پٹری پر اکٹھے ہو گئے، اور باری باری کیو میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ پٹری پر ایک میز رکھا تھا۔ ایک آدمی رجسٹر سامنے رکھے کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ راہ گیر رجسٹر پر اپنا نام اور دلالت لکھوا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھنے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹنا ہے۔ ”آرتھر“ میں نے با آواز بلند احمد بشیر سے کہا۔ پہلے تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر سمجھ گیا۔ ”آرتھر، یہ سب کیا ہے؟“ میں نے دہرایا۔ ”کچھ بھی نہیں، مائیکل!“ اس نے با آواز بلند کہا اور ہنسنے لگا۔ گورنمنٹ کے نام کوئی عرضداشت بھیجا جا رہی ہے، جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔ کیوں مسٹر؟ اس نے ساتھ کھڑے لالہ جی سے پوچھا ”اد کے؟“

جب میں رجسٹر پر دستخط کرنے لگا تو مجھ پر ایک وحشت سی سوار ہو گئی۔ جی چالاکہ بیچ بیچ کر کمروں میں محمد متاذا ہوں، محمد ممتاز۔ میں مسلمان ہوں۔ میرے پیٹ میں ٹھہرا ہوا نمک دد۔ وہی ٹھہرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چندے کے طور پر دیے تھے۔ میں نے پاکستان کے خلاف جرم کیا ہے۔ یہی میری سزا ہے۔ لیکن میرے ملے میں آواز نہ مٹی کسی نے میرا اعلان نہ سنا اور میں نے چپکے سے مائیکل موٹی ولد جان موٹی بقلم خود رجسٹر میں لکھ دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرأت نہ تھی۔ لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حامل تھی۔ جرأت کی دیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کانگریس مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دے رہی تھی۔ پرتھوی راج اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب بھڑے تھے۔ صرف دو افراد سچے تھے۔ صرف دو۔ ان میں غلوس تھا۔ وہ پاکستانی جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتا تھا اور وہ غنڈا جو مسلمان راہگیر کے پیٹ میں پھرا بھونکتا تھا۔ ادریں۔ بے شک میں بزدل تھا۔ میرا دل جذبے سے خالی تھا۔ لیکن میں بھڑانا نہ تھا۔ نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا، نہ اپنے آپ کو۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کا دن آگیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لیے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سید کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر سیکنڈ ٹیون بچ رہی تھی۔ دت کی ملک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی، جیسے طبل جنگ بج رہا ہو۔ اُدھنے سڑوں میں طوطی لگا رہی تھی۔ لیکن میرے لیے اس سیکنڈ ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ دفعتاً اعلان ہوا: ریڈیو پاکستان۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ سارے بدن پر چوٹیں لہینگنے لگیں۔ دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لیے یہ پہلا مثبت جذبہ تھا، جس نے ان جانے میں میرے بند بند کو جھنجھوڑ دیا۔ جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ ساز و سامان، جس کے حصول کے لیے ہم بمبئی گئے تھے، اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ لہذا احمد بشیر اور میں جوں توں پاکستان آ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر صرف ایک فکر دامن گیر تھا کہ اپنے عزیز و اقارب

کو منع گورداسپور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔ پاکستان ہمارے لیے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لیے مسلمانوں کے لیے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں۔ چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی۔ چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں۔ چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں۔ بہر حال میں مسلمان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے کمپوں میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر مشرقی پنجاب میں کشت و خون کے واقعات کے بارے میں سن سن کر، بھارت کے روئے کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے۔ لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ یہ جذبہ حفظ و اتمام کے لیے تھا۔ اپنی ذات کے لیے محدود تھا۔ ضرورت وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرز عمل کا رد عمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔ آٹھ سال گزر گئے۔

اس عرصے میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو وہاں ایک مہتمم آدمی خواجہ صاحب بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اپنی بات کہنے کے بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب میں بزرگ کی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جٹا دھاری ہوں۔ جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو۔ جو ڈانس بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پند و نصیحت سے شغف رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں ایسی کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ عام دنیادی مسائل پر وہ بڑے ذریک انداز میں دنیادی نقطہ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ

پڑ جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے کچھ سیکھ سکتا ہوں، کیونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جانکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رُک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسب دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے ”کیسے، کیا حال چال ہے؟“ میں نے کہا ”جی، کوئی خاص اچھا نہیں۔ بس غم کھا رہے ہیں۔“ بولے ”کیوں؟ غم کس بات کا؟“ میں نے کہا ”خواجہ صاحب، پاکستان کا کیا بنے گا؟ یہ کشتی تو ڈول رہی ہے۔“ میں نے یہ بات تھریٹھا کر دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کے لیے کوئی خاص لگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے ”مفتی صاحب“ وہ بولے ”پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں، جب کہ پاکستان کا غم کھانے کے لیے بڑی بڑی استیاں موجود ہیں؟ آپ کوادر تجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟“ ایک ساعت کے لیے وہ رُک گئے پھر بولے ”اس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ؟“ میں نے اُس جانب دیکھا جہاں خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ وہاں کوئی بڈھا نہ تھا۔ کیا وہ اس قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس پر وہ ابھی فائتہ پڑھ کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے ”اس بڈھے نے اپنی تمام زندگی قیام پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ بوڑھا اسی بڈھے کا لگا گیا اُٹھو ہے؟“

”مفتی صاحب“ وہ مسکرا کر کہنے لگے ”پاکستان کے لیے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ کیوں غم کھاتے ہیں؟“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ میں نے اذراہ مذاق کہا۔

”آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کہ کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔“

پاکستان تو بہر صمدت پھلے پھولے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ عیش عیش کریں گے۔ انشاء اللہ!

خواجہ صاحب کی بات سُن کر تجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ انھوں نے تو کبھی بڑے ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر پرستی کے حتی میں نہ تھے۔ پھر وہ بڑھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا؟ وہ بڑی استیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں؟ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں؟ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی۔ اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔ ان کی بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ ان کے کردار کی طرف نظر جاتی تو از سر نو شش و پنج میں پڑ جاتا۔ خواجہ صاحب کی زیرکی۔ ان کی راست گوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس بیٹھا ہو، اور اللہ کا ایک خصوصی پروردگار ہو، اور وہ کُن کہ کر تخلیق کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحے محنت مشقت اور مز دوری کرنے والا ہو، جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے جھڑے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مز دور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بڑا قائل تھا۔ میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں؛ اس کی عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اسے رب العالمین سمجھتا تھا، رب المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکلر تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک مضابطہ عمل تھا جو صرف بنی نوع انسان کے لیے باعث فلاح تھا جس کے لیے اللہ کو اپنے طرز عمل میں رد و بدل گوارا نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے

نقطہ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنی؟ ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی، میرے دل میں گو گو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں اک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آجاتا، اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔ صاحب نے مجھے بلایا۔ بولے ”آپ کام شروع کریں“ میں نے کہا ”سر“ بولے ”اس صندوق میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں۔ موضوع کے لحاظ سے انہیں ترتیب دیں اور سمری بنادیں۔ جو خط خصوصی تو جیر کے قابل ہو اسے الگ کر دیں“ میں ”سر“ میں نے کہا۔ ”پھر اسی صندوق میں آئے گا“ وہ بولے۔ ”آل رائٹ سر“ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا خط کھولا۔ لکھا تھا: اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی۔

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا: عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو ادبھی حیران ہوا۔ لکھا تھا: خبردار! دیکھ پاکستان میں آٹا ہنگامہ ہونے لگیو۔ تیسرے خط میں لکھا تھا: وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہوگا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے، سبحان اللہ!

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ تو بڑے حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ کیونکہ زیادہ تر خطوں میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دھاگو، خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کاغذ کے پُرزدوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور انداز بیان دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود

تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کیے تھے۔ وقت کیوں صرف کیا تھا۔ پھر میں نے ایک طویل خط اٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر طائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب صحیح تھا جو ۲۰ سال پیشتر ایک حادثے کی وجہ سے اپنا بیچ ہو چکا تھا اور گزشتہ بیس برس سے صاحبِ فراموش تھا۔ ان ۲۰ برس میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ میں یہ خط تمہارے لیے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہوگی اور پھر پاکستان دُنیا کے اسلام کا ایک مرکز بن جائے گا۔ ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کونسی دُنیا تھی؟ یہ کس قسم کے لوگ تھے؟ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب مذہبی ہسٹریا کے مریض تھے؟ جنوبی تھے؟ مجذوب تھے یا جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تھے؟ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توقیر و تعظیم نہ ملتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظلِ الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا مضمون پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت۔ پاکستان سے رسول اللہ کا التفات۔ پاکستان پر اللہ کی برکت و رحمت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ لوگ کون لوگ ہیں؟ یہ دُنیا کون سی دُنیا ہے؟ پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا امتیاز حاصل ہے؟ کیوں حاصل ہے؟

طبیعت کے لحاظ سے میں ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعے کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اُٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے تو میں سوچتا رہا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے، جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری میں ڈگمگانے لگی۔ دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرا انوردی کرتا رہا۔ پھر طوفان تھا تو میں سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جنابِ عالی! یہ خط میرے بس کا روگ نہیں

ہیں۔ مجھے کوئی سنجیدہ کام دیجیے جسے عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں تو میں جا کر ان سے بات کروں۔ عین اس وقت صاحب کا چہرہ اسی آگیا۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہوا۔ اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے ہوں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چہرہ اسی نے آکر کہا ”جی، صاحب بلا تے ہیں۔“ صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کر لیں تو پھر میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا ”آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کے لیے مصر ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ کہیں کوئی میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر رہے تو اسے جانے نہ دیں بلکہ مجھے اطلاع دیں۔ میں اس سے ملوں گا۔“

”یس سر“ — صاحب کی بات سن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔ ”اور دیکھیے“ صاحب بولے ”سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں۔ علیحدگی میں سمجھے؟“

”یس سر“ — اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے سوچا، واپسی پر بات کر دوں گا۔

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ صاحب کا نام میں مصروف ہیں“ میں نے کہا ”انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتادیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو۔“

میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا ”بابو جی، میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آ رہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک ساندوچی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا : میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔

صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ ساندنی سوار بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آگیا۔ لیکن پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سُننے۔ اپنی ہی کسے جاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”آپ پیغام مجھے دے دیں۔ میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔“ ساندنی سوار نے مجھ سے کہا تھا ”وہ بولا کجا کر اس سے کہ دو کہ جو کا غزوہ لکھ رہا ہے، وہ غلط ہے، اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے، وہ صحیح ہے۔“

”عجیب حمل سا پیغام ہے!“ میں نے سوچا ”نہ سرن پاؤں۔ ساندنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ! اور پھر ساندنی سوار یہاں کہاں! میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی ساندنی سوار نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سُن کر مسکرا دیں گے اور مجھ پر کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ لیکن ایک ساعت کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر نہایت سنجیدگی سے لمبے ذرا یہ ویسٹ پیئر باسکٹ تو اٹھائیے!“ میں نے ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چُھنے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیا صاحب ساندنی سوار کی بات سچ مان بیٹھے ہیں؟

صاحب نے وہ پُرزے میری جانب بڑھا دیے۔ بولے ”اگر آپ کو فرصت ہو تو انھیں جوڑ دیجیے۔“ ”یس سر“ میں نے کہا۔ صاحب نے وہ نوٹ اٹھا لیا جو وہ لکھ رہے تھے اور اسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور ذریک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کے لیے منہ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ لیتا ہے، یہ شخص جو ہر ایک کی بات سُننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے، جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے، جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دُور رہتا ہے، جسے توہمات سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، یہ شخص ایک مبہم ساندنی سوار کی بات کو یوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ سے اسے ایسے ساندنی سواروں

سے واسطہ رہا ہو۔ جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو۔ یہ کیا بھید ہے !
میں نے کاغذ کے پرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک اہم شق
تھی، جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں اندر لہذا ان خطوں
کی الف لیلیں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے۔ لیکن عام طور
سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا: پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، ذخیرہ
مستقبل۔ آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ شاید یہ
چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے
ہوں۔ آخر وہ مالکِ ارض و سما ہیں۔ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھالیا تاکہ
دیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑا اسی آیا۔ صاحب سے
کہنے لگا ”سر میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کے لیے ایک
پیغام لایا ہے۔ حکم ہو تو اسے بلا لوں۔“

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپڑا اسی کی بات سنی۔ بولے ”بلاؤ۔“ انھوں نے اپنا
کام ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھ کر بڑھے سے مصافحہ کیا اور بڑے غور اور احترام سے اس کی
بات سُننے لگے۔

تمہید کے بعد بڑھے نے کہا ”جناب، وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فرج میں سپاہی تھے۔
بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ دہل سے مدینہ شریف میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ بس وہیں
بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ روضہ مبارک کے چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ
ہے، جناب۔ انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔“

صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

بڈھے نے بات شروع کی ”انھوں نے فرمایا کہ سن ۶۶ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک بیل بھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دوڑ نکل گئی، اور اس کے پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔“

صاحب نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”چار ایک سال کے بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مڑجھا گئی تھیں۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سر سبز ہو رہی ہے پھر سے کوئیں نکل رہی ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ہماری طرف سے جا کر مبارک باد دینا، اور ہمارا پیغام دینا۔ کہنا، بھیڑوں کے رکھوالے خود سائے میں نہیں بیٹھتے۔“

جب تک وہ بڈھا بات کرتا رہا، کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا کہ ہماری طرف سے مبارک باد دینا تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید سہرا بھرا نظر آنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوڑتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاکھ لہولہ پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا، لیکن بے سود۔ الف لیلا کی اس دنیا میں ایک عجب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ہلاکت کرتی، لیکن مجھے اس نشہ کی لت پڑ رہی تھی۔ پھر اللہ میاں میرے روبرو ایک سٹول پر آ بیٹھے۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے۔ وہ کامیں منہمک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرابور تھے۔ وہ تعبیر میں منہمک تھے۔ پاکستان کی تعمیر۔ یہ میرے اللہ میاں تو نہ تھے۔ یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ میاں تھے۔ میرے اللہ میاں جو دور بہت دور، اُد پر بہت اُد پر تخت پر بیٹھ کر کُن کہا کرتے تھے۔ جو عظیم تھے بے نیاز تھے۔ دور تھے اُونچے تھے وہ اللہ میاں پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا۔ خوف سے میری گھٹکتی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک در دست نے فون کر کے انھیں بلایا۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں ایک درویش آئے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولیس تھے، پھر بلاوا آ گیا۔ سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اس درویش کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچا، خوفناک آنکھیں، کرخست آواز۔ صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب ادرہ درویش جو مجھے سرسری ہوئی مرج دکھائی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں لمحہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔ دفعۃً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ لمحہ کمرے میں مرج انگریزی بول رہا تھا۔ کد رہا تھا "فلے یو الائیو۔ پٹ برین آن یو اینڈ پلیس یو ان دی سن" اسے! یہ کیا صاحب سے کہ رہا ہے؟ یہ درویش ہے یا قصائی؟

"میں یہاں صرف اس مقصد کے لیے آیا ہوں" اس کی کرخست آواز پھر گونجی "کہ تمہیں وارننگ دلوں تمہیں بتا ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی۔ جو کوتاہی کرے، اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ رد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اس لیے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی، اور ننگ لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا۔" یہ سن کر خوف سے میرا خون جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب ادرہ مرج اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو ان کا منہ زرد تھا، جیسے تمام خون چوس لیا گیا ہو۔ وہ لمبہ شکل چل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب ادرہ میں دوسرے پرکراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سنٹرل جیل گئے۔ صاحب کو دہلیں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوئے تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے آکر سلوٹ مارا۔ بولا "حضو، ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے۔ کتا ہے اُسے بولا۔"

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاح دار کمرے میں ایک ہیچرا بند

تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ”تالا کھولو“ صاحب بولے۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گئے اور گارڈ سے بولے ”تم جاؤ“ گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا ہیمچرے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصے سے کہا ”مجھے خبردار کرنے کے لیے میں قید ہونا پڑا۔“

یہ سنستے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلے تو انکی وہی حالت تھی جیسے مرج سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی یا اللہ! یہ کیا اسرار ہے۔ میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا۔ لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے اس کے کوائف پوچھے۔ پتا چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں دنکا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لا کر کمرے میں بند کر دیا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا ہے۔

ان واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پُر اسرار ہو گیا۔ لیکن اُن جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ اور اللہ میاں اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں جگہ جگہ ایٹمیس رکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمے کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گا ہے گا ہے بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دور یاد آ جاتا۔ میرے جسم پر چوینٹے سے ریشمٹے اور ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سانپ گزر چکا تھا لیکن کیر باقی تھی۔ اور وہ کیر روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کیر نے گویا زبردستی میرا ذوق نگاہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ نہ گھر کا نہ گھٹ کا۔ پاکستان کے لیے میرے دل میں خواہ مخواہ عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا تھا، اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ کس کا انتظار؟

یہ مجھے علم نہیں۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا، ایک ٹیکسی میرے قریب آکر رُک گئی۔ میرے ایک پُرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سمر نکالا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا "اے! تم تو یورپ گئے ہوئے تھے؟" میں اسی ہفتے واپس آیا ہوں" احمد بولا "یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "بری شاہ لطیف جا رہا ہوں" وہ بولا۔ احمد کی زبان سے شاہ لطیف کا نام سُن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ احمد تہذیبِ جدید کی پیداوار تھا۔ "تم دہلی جا کر کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔ "آٹریا" وہ بولا "میرے ساتھ چلو۔ ابھی واپس آجائیں گے۔"

جب ہم مزار پر پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا "یار، بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر صاحبِ نظر ہوتے ہیں؟ ڈاکٹر ریٹ کے سلسلے میں میں یورپ کی متعدد دلائبریریوں میں گیا۔ دہلی ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ شاہ لطیف نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دنیا کے اسلام کا مرکز بنے گا، اور یہ نسخہ دو ڈھائی سو سال پُرانا تھا۔ دیکھو لو، اسلام آباد نورپور سے آدھریل کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھریل جد ہو گئی۔ جب ہم نورپور سے واپس آ رہے تھے تو ٹیکسی رُک گئی۔ "کیوں بھائی، رُک کیوں گئے؟" احمد نے پوچھا۔ "ڈرائیور بولا "جناب، نورپور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے" ہم نے باہر دیکھا۔ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا "دیکھو تو مفتی، اسلام آباد نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ لطیف کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے۔ اور یہ شہر دنیا کے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "نورپور کے تانکے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں" ڈرائیور نے کہا۔ "سُنئے ہو؟" احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر ہجرات کے

تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سننے اور سردھنتے تھے۔

معتدلوگوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرورِ دو عالمؐ عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ جنگ بدر کے شہداء محاذوں پر پہنچ چکے ہیں۔ حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ سفید ملبوسات پہنے سیا لکھوٹ کے قرب و جوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیرا ہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تحس تحس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سُرخ ٹوپوں اور چھوٹے قد والے پاکستانی فوجیوں نے بھارتی سینا کا ناطہ بند کر رکھا تھا۔ بھارتی توپچی نے کہا کہ گولے پھینکنا بے کار ہے۔ ایک سفید ریش بڑھا میرے گولے کچ کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔ بھارتی ہوا بازوں کا بیان تھا کہ جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڑھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر لیں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان معجزاتی تذکروں سے گونج رہا تھا۔ ایک دانشور نے تحقیق بھرا مقدمہ لگایا یا، یہ پاکستانی عوام مجھ سے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔ آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں۔“

”لیکن —“ دوسرا بولا ”یا اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات بنتی نہیں“

”کیا مطلب؟“ تیسرے نے کہا۔

”مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو — ہمیں جنگ ہار جانی چاہیے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیے تھا۔“

”ہاں“ ایک اور دانشور بولے ”بھارتی حملے کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا۔ اس میں کوئی مستقم نہ تھا۔“

”لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں چھوڑو، یار“ ایک نے کہا ”خالص جدت طرازی۔“
وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

”لیکن یار“ ایک رپورٹر بولا ”دو ایک باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔“
”دو ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں“ پہلے دانشور نے تعینک بھرا قہقہہ لگایا۔
میں ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا
تھا کہ ان سب کے دلوں میں بار بار ایک ہی خیال اُبھرتا ہے۔ اور وہ اسے بھولنے کے لیے
دسیلوں، قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے متھے کو از سر نو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب مجھ میں
مُدافعت کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی
جیسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران ان مجرمانہ عقل باتوں نے
پاکستان کی امتیازی حیثیت پر ہر گام دی تھی۔ اب میرا اللہ سٹول پر بیٹھ کر اینٹیں نہیں رکھ رہا تھا۔ وہ
سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی زنگ آلود نوا رہی تھی۔ وہ پاکستان کے محاذوں پر
گشت کر رہا تھا، اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا ”کیا
گھر جاؤ گے؟“ بولا ”نہیں۔ قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا“ میں نے پوچھا ”وہ کون ہیں؟“
بولا ”وہ ایک عابد آدمی ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں“ میں نے کہا ”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا کمرہ مدینہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جانے نماز پر تسمیں
رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے ”آپ
بھی کوئی بات کریں۔“

میں نے کہا ”جی، پاکستان کے لیے دُعا فرمائیں۔“

دُعا وہ سنجیدہ ہو گئے۔ بولے ”میں بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں۔“

میری کیا حیثیت ہے کہ میں پاکستان کے لیے دعا کروں۔ نہیں جناب، میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔
میں نے کہا ”جناب قاضی صاحب، دُعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔“

دہ لبسے ”ٹھیک ہے، لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتا نہیں، مجھے بھی عتوڑی

سی خبر ہے، بہت عتوڑی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں، بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ وہ
پاکستان کے محافظ ہیں۔ اس کے نگہبان ہیں۔ آپ پاکستان کی فکر نہ کریں۔“

قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے پھیر دیا۔

یا اللہ یہ بڑے کون ہیں؟ کیا دیہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لیے عجلت سے گھوڑے

پر سوار ہو رہے تھے۔ کیا دیہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن پہنے دیکھے
گئے تھے؟

کیا یہ دیہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے؟ ہوائی جہازوں سے گرائے

ہوئے بموں کو اٹھا اٹھا کر دُور پھینکتے تھے؟ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی

نظر بندی کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھپل نظر آنے لگے تھے؟ کیا انھوں ہی نے بھارتی پائلٹ

کو حکم دیا تھا ”بیل آؤٹ، بیل آؤٹ“ اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آوازیں سن کر گھبرا کر

بیل آؤٹ کر گیا تھا؟

کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی امداد کر رہے

ہیں؟ کیا انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدوجہد کو ان نتائج سے

کچھ مناسبت نہیں جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں؟ کیا انھیں اس حقیقت کا شعور ہے

کہ بین الاقوامی سطح پر جو اہمیت پاکستان کو حاصل ہے وہ کس کی مرہونِ منت ہے؟ کیا پاکستان کے

سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے؟ اور کیا انھوں نے اس

بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں؟

کیا انھوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح و بہبود اور

اس کے تحفظ کے لیے ہم مصروفِ عمل ہیں؟
 ”ہاں۔۔۔“ قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے
 پھیر دیا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی لیکن بھڑوں کا چھتا ابھی تک بھن بھن کر رہا ہے۔
 قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہ رہا تھا ”ابھی کیل ہے۔
 ابھی تو خون کی ندیاں بہیں گی۔ بہت مریں گے، بہت۔ لاشیں ہی لاشیں۔ پھر بڑی فوج ہوگی۔ پھر
 بڑی فوج ہوگی۔ اور پھر سہماں اللہ! سہماں اللہ! وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا، جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔
 خواجہ صاحب کو مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رُک گیا۔
 ”کیا حال ہے! مفتی صاحب؟“ وہ بولے۔
 ”فکر میں گھل رہا ہوں، خواجہ صاحب“ میں نے کہا۔
 ”کس کے فکریں گھلنے لگے؟“ انھوں نے پوچھا۔
 ”پاکستان کا فکر لگا ہے“ میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔ بولے ”مفتی جی، اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ
 دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے آپ کون ہیں، جی؟ آپ اپنی سوچیں۔
 اپنی فکر کیجیے۔ واہ مفتی جی! اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے؟“

چلتے چلتے میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو راستہ نامانوس نظر آیا۔ میں نے اسے اہمیت نہ دی اور چلتا
 رہا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا توں توں یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں غلطی سے کسی اُن جانی سرٹک پر نکل آیا
 ہوں۔ میں نے سوچا کوئی راہگیر ملے تو اس سے پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ کچھ دُور سڑک سے ہسٹ کر

ایک بہت بڑا بڑکا درخت تھا جس کے قریب ہی گھاس بھوس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص سے پوچھ لوں۔ جھونپڑے کے برابر بیچا تو سیڑھی سی بجھکی آواز آئی اور سکوتر کے پچھلے پیٹے کی ہوائنکل گئی میں نے سکوتر روک لیا۔ کیا مصیبت ہے، میں نے سوچا اب فالتو پیٹہ فٹ کرنا پڑے گا۔ سٹفنی کو دیکھا تو اس میں بھی ہوائنکل تھی۔ اب کیا ہوگا؟ میں گھبرا گیا۔

میں نے سر اٹھایا تو رو برو ہی وہ شخص کھڑا تھا جسے میں نے جھونپڑے کے سامنے دیکھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”پنکچر ہو گیا ہے۔“

”اسے ادھر کھڑا کر دے نا“ وہ بولا۔

”یہ سڑک کدھر کر جاتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہیں بھی نہیں جاتی“ وہ بولا ”ادھر پہاڑی کے نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے“

”آس پاس کوئی گاؤں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ وہ بولا ”ادھر ایک رکھ ہے۔ وہاں سے کبھی کبھی ٹرک آتا ہے۔ تو یہاں دھوپ میں کیوں

کھڑا ہے؟ جھونپڑے میں جا کر بیٹھ“ اس نے کہا ”میں سکوتر کا دھیان رکھوں گا۔“ جھونپڑے میں چٹائی بھی

ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چادری لپیٹی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں پانی کا گھڑا تھا، ساتھ ہی ٹین کا ڈبہ پڑا

تھا۔ میں نے پانی پیا اور پھر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔

چادریں حرکت ہوئی اور ایک دُبل پتلا سفید ریش چہرہ نکل آیا۔

”اُٹھتے ہی بولا“ تو آگیا۔“

”جی“ میں نے جواب دیا ”میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔“

”ہاں“ بدھا بڑا بڑا ”جب چاہتے ہیں راستہ دے دیتے ہیں جب چاہتے ہیں راستہ بند

کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”جی“ میرے سکوتر کی ہوائنکل گئی ہے۔ پنکچر ہو گیا ہے۔“

ہوں، وہ بولا ”ہم خود میں ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ ان کا کرم ہو جائے تو ہوا نکل جاتی ہے۔“ پہلے تو میں اس کی باتوں پر ہلکا ہلکا پھر سوچا کوئی مجذبوب ہے جو ان اپنا پناپ بول رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ چپ رہا پھر مدھم آواز میں بولا ”تو جو نئے بُت بنا رہا ہے کیا تجھے قلم اس لیے دیا تھا کہ بُت بنا ہے؟“

قلم کی بات سن کر میں چونکا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں لیکن بُت، بُت تو قلم سے نہیں بنائے جاتے۔

دفعہ وہ بُڈھا جوش میں آگیا۔ کہنے لگا ”کیا حیثیت ہے پاکستان کی۔ ایک چھوٹا چھٹکنی سا ملک۔ غریب ملک۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں“ وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر آپ ہی پھر گیا ”اور یہاں کے لوگ۔ چاندنی طرف سے ہیں میں کی آوازیں آتی ہیں بکرے میں میں کر رہے ہیں۔ کھلے جا رہے ہیں کھانے جا رہے ہیں اللہ کی اس دی ہوئی دیگ کو کھائے جا رہے ہیں۔ ساتھ اپنا اپنا کٹورہ بھرے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی کوٹھالی میں دانے ڈالتے جا رہے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ طمع خالص طمع۔ دوسرے چاہے بھوکے مریں۔ پڑے مریں۔ میری کوٹھالی بھر جائے۔ کوئی ملک کا نہیں سوچتا۔ کوئی قوم کا نہیں سوچتا۔ کوئی دین کا نہیں سوچتا۔ آخرت کا نہیں سوچتا۔ بس آپا دھاپی پڑی ہے۔ بادشاہ بھی میں میں کد رہا ہے۔ فقیر بھی میں میں کد رہا ہے۔ بتیاں چھڑوں کی رکھوالی پڑتی ہیں۔ اس ملک کو تم بُت بنا رہے ہو۔ خوشخبریاں دے رہے ہو۔ یہ ملک تو اس لائی ہے کہ غرق کر دیا جائے۔ سمجھے؟ اس نے مجھے ڈانٹا۔ غصے بھری نگاہ مجھ پر ڈالی بول کیا کہتا ہے؟ کیا تجھے اس لیے قلم دیا تھا کہ اس ملک کے قصیدے لکھے؟ بول؟ وہ چلا یا۔

میں سر نہ اٹھایا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا: ”حوص ہی حوص۔ طمع ہی طمع۔ اتنے حوصیں ہو گئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بچنے لگے ہیں۔ اسلام کو نیچے لگے ہیں۔ اسلام کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اللہ سے محول کر رہے ہیں جھوٹے فریبی۔“ جب بڑوں کا یہ حال ہے تو پھر بڑوں کا کیا ہوگا۔ اور تو کہتا پھر نہ ہے اس ملک پر اللہ کی رحمت ہے جہاں

اللہ کا نام ملے ملے کر رہا ہو۔ اتنی ناقدری تو بہ ہے! تو بہ ہے! اللہ کی ناقدری۔ دین کی ناقدری۔ وہیں رحمت ہوگی کیا؟ بول۔ پھر وہ غصے میں چلنے لگا ”تجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ تمہیں گھٹنیاں ڈال کر بیٹھا رہے۔“

”مجھے بلایا ہے؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلے۔“

”اور کیا تو خود آیا ہے یہاں؟“ وہ بولا، ہمیں یہاں تیرا انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں پتا تھا کہ تو آئے گا اور تو آگیا۔“

”لیکن میرا قصور ہے بابا؟“ میں غصے میں آگیا۔

”ہاں تیرا قصور ہے۔“ وہ بولا، جن باتوں کو تو نہیں سمجھتا، نہیں جانتا، ان کے بارے میں کیوں بات کرتا ہے؟ کیوں اللہ کی خلقت کو گمراہ کرتا ہے؟

”میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں، جانتا ہوں۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں بابا،“ میں نے جواب دیا۔

”جو تو بے حیثیت ہے تو بے حیثیت بن کے رہ۔ بہتی باتاں نہ بگھا۔ شیخیاں نہ مار۔ پر تو بھی ان جیسا ہے وہ اپنی بات بنانے کے لیے اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے اسلام کا نام برت رہے ہیں تو اپنی حیثیت بنانے کے لیے پاکستان کی وڈیائی کی باتیں کر رہا ہے۔“

”غلط ہے، بالکل غلط“ غصے سے میری کندھیاں بجے لگیں ”میں تو صرف وہ باتیں کھدیتا ہوں جو تمہارے جیسے باباؤں کی زبانی سنتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی طرف سے بات نہیں کی۔ میں نے کبھی بڑھا چڑھا کر بات نہیں کی۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں جانتا ہوں۔ تو بتا کیا لائل پور کے اس بابے نے مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد دو اڑھائی سو لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا کہ ایک دن آئے گا اللہ ہے جب یو این ہر قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی، کیا یہ قدم اٹھانے کی اجازت ہے اور انھوں نے کہا تھا اگر ایسا نہ ہوا تو تم اگر میری قبر پر عموکنا۔ بتا کیا اس بابے نے جھوٹ بولا تھا؟ بول بابا۔ چُپ کیوں ہو گیا؟ وہ دیر تک سر جھکانے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگا ”نہیں وہ بابا جھوٹ نہیں بولتا۔“

”کیا نورپور کے بابے نے اڑھائی سو سال پہلے نہیں کہا تھا کہ یہاں ایک اسلامی شہر آباد ہوگا
جسے عالم اسلام کا مرکز بنے گا؟“

”کہا تھا“ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”کیا در صدیوں سے بابے یہ کہتے نہیں آ رہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہند میں
اسلام کا دُکنا بجے گا؟“
وہ خاموش بیٹھا رہا۔

”کیا سر ریو کے بابا نے جس کے حضور مجھے بھیجا گیا تھا، قیام پاکستان کے وقت شاہِ دکن کو دعوت
نہیں دی تھی کہ آجئے شہنشاہِ ہند بنادیں کیا دکن کے سی این سی پنڈی میں اگر بابا سے نہیں ملے تھے؟
بابا نے نشاۃِ ثانیہ کی خبر سنائی تھی۔ پاکستان کی مرکزی حیثیت کی بات نہیں کی تھی؟“ میں غزیا۔
”تو نہیں سمجھتا“ وہ بولا ”بزرگوں کی باتیں برحق ہیں۔ لیکن تجھ میں سمجھ کی کمی ہے۔ تو ان کی بات
کے رُخ کو نہیں سمجھتا اور انھیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی
ہیں۔ اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھ“ وہ توقف سے بولا ”پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں،
کچھ حیثیت نہیں۔ ایک چھڑا سا عام سا غریب ملک۔ ساری اہمیت اللہ کے دین کی ہے۔ وہ دن
آنے والا ہے جب اللہ کے دین سے دُنیا منور ہوگی۔ اور اللہ کا بھیجا ہوا وہ بندہ جس کے وجود سے
دُنیا منور ہوگی پاکستان میں آئے گا۔ ان کا قیام پاکستان میں ہوگا۔ انشاء اللہ پاکستان کی عظمت ان
کے قیام سے وابستہ ہے۔ بذاتِ خود نہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

پھر تزیپ کر بولا ”دیکھ ضروری نہیں کہ وہ صاحبِ پاکستانی نژاد ہوں۔ کیا پتا کہ وہ یورپ
کے ہوں یا افریقہ کے ہوں یا کہیں کے ہوں۔ البتہ ان کا قیام پاکستان میں ہوگا۔ اور یہ پاکستان کی بہت
بڑی خوش قسمتی ہے، دو ڈیائی ہے۔ دیکھ“ وہ بولا ”کوئی با با حقی بات نہیں کر سکتا۔ کسی کو مجاز نہیں کہ وہ حقی
بات کرے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرے آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے“

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا ”آئندہ سے بڑوں کی باتوں پر قلم نہیں اٹھانا۔ سمجھا؟“

اس نے مجھے ڈانٹا۔ پھر وقتے کے بعد دھیمی آواز میں بولا ”ہم تمہیں دو لفظ دیتے ہیں ان کا ورد کرتے رہنا۔“ قریب پڑے چند کاغذات سے اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

”میں پاک حالت میں نہیں رہ سکتا“ میں نے کہا۔

”کچھ پروا نہیں“ وہ بولا۔

”میں عربی نہیں پڑھ سکتا“ میں نے کہا۔

”اچھا“ وہ رُک گیا۔ پھر بولا ”ٹھیک ہے“ اور کچھ لکھنے لگا۔ لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کا ٹکڑا ایک پُرانے لفافے میں ڈالا اور وہ لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ کہنے لگا ”گیارہ مرتبہ صبح اور گیارہ مرتبہ سوتے وقت اس کا ورد کیا کر۔ اب تو جلالہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا کرے“

میں اُٹھ بیٹھا۔ باہر میرا سکوتر سڑک کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے سکوتر اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔ کچھ دور جا کر دفعتاً مجھے یاد آیا کہ میرے سکوتر کا پتیا تو ہینکچر تھا۔ میں سکوتر روک کر نیچے اُترا۔ پیسے کو دیکھا۔ ہوا ٹھیک ٹھاک تھی۔ پھر میں نے سٹفنی کو دیکھا وہ بھی ہوا سے بھری ہوئی تھی۔ یہ کیسے ہوا؟ مجھ پر حیرت طاری ہو گئی۔ دیر تک اسی عالم میں چلتا رہا، چلتا رہا۔ پھر جو نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ بلاستہ خانوس تھا۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ شام کہیں پھر سکوتر لے کر چل پڑا تاکہ اس سڑک کا پتا لگاؤں جس پر میں غلطی سے مر گیا تھا۔

کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد وہ سڑک مل گئی۔ میں اس پر چل پڑا۔ بڑے کے درخت کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی لیکن بڑے کے آس پاس بھونپڑا دکھائی نہ دیا۔ بڑے کے نیچے ایک آدمی ناز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے پوچھا ”یہاں ایک بھونپڑا تھا؟“

”بھونپڑا؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”نہیں“ وہ بولا ”یہاں کوئی بھونپڑا نہیں۔“

”تو ادھر کب آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالرین لکھ میں کام کرتا ہوں۔ روز ادھر سے گزرتا ہوں۔ دوبارہ میں نے کبھی کوئی بھونپڑا

نہیں دیکھا۔

”میں کل آیا تھا“ میں نے کہا ”بڑی دیر اس بھونپڑے میں بیٹھا رہا تھا“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پہلی مرتبہ میں نے پاکستان پر مضمون لکھا تھا۔ اسے شائع ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا۔

میں ایک مخد زبانی مسلمان ہوں۔ میری زندگی عمل سے کیسر خالی ہے۔ میری زندگی میں چار ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جنہیں بیت کر مجھے بتا چلا کہ ہماری دنیاوی زندگی کے متوازی ایک روحانی نظام بھی چل رہا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں، دانشور ہوں۔ میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔ ایسے واقعے سے میں چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں پھر نکل کر ہو جاتا ہوں۔

چند ایک روز میں سوچتا رہا پھر شکوک و شبہات نے گھیر لیا۔ سوچا شاید میں نے خواب دیکھا ہو یا شاید وہ جھونپڑا اور وہ بوڑھا میرے ذہن کی اختراع ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سرک پر آگے جانے والوں نے وہ جھونپڑا نہ دیکھا ہو۔ ضرور یہ میرے ذہن کی اختراع ہوگی۔ یوں میں نے خود کو مطمئن اور محفوظ کر لیا۔

پھر دو ایک ماہ کے بعد میں نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک مڑا ہوا لٹافہ برآمد ہوا۔ اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، اوپر بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔ نیچے لکھا تھا: گیارہ بار صبح جلگے وقت اور گیارہ بار رات سوتے وقت ورد کر دو۔ اس کے نیچے لکھا تھا: چھوٹا مٹھ بڑی بات۔

محترمہ ہومیو پیتھی کے نام

مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ہومیو پیتھی کے نام ایک خط

مکرمی جناب عطا حسین کلیم صاحب
السلام علیکم

گزشتہ چھ ماہ سے میں آپ کا پرچہ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ لیکن آج تک میرے ہاتھ پر نہیں پڑا۔ ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے ”آب آب کر مولوں سچے فارسیاں گھر گالے“ آپ کا پرچہ مسلسل آب آب کر رہا ہے۔ پانی کی بات نہیں کرتا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کے پرچے کی بند اکروں۔ آپ کا پرچہ ماشاء اللہ بڑے بڑے عالمانہ اور محققانہ مضامین پیش کرتا ہے۔ مملکت بیماریوں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ نادر ادویات کے خواص گنوا رہا ہے۔ یہ ہدایات قلم بند کرتا ہے کہ مریض کی کیس ہسٹری کیسے نوٹ کی جانی چاہیے۔ اس بات پر بحث کرتا ہے کہ کون سی سمٹھیں کون سی پوٹنسی استعمال کرنی چاہیے۔ کون سی سمٹھز کو اہمیت دینی چاہیے۔ کون سی کو درخور اعتنا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ تمام باتیں عالمانہ ہیں۔ تحقیق و تجربے کا بخور ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں ہومیو ڈاکٹروں کے لیے کام کی باتیں ہیں۔ عام قاری کے لیے ان کی حیثیت آب آب کی ہے۔

جناب کلیم صاحب، صرف آپ کا پرچہ ہی نہیں، یہاں پاکستان میں ہومیو پیتھی کے موضوع پر جتنے پرچے بھی شائع ہو رہے ہیں، ان سب میں عالمانہ اور محققانہ باتیں ہوتی ہیں جو

صرف ہومیو ڈاکٹروں کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور مجھ سے عام قاری کے لیے آب آب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کلیم صاحب، کیا یہ پریچر آپ نے اس لیے جاری کیا ہے کہ یہاں کے ہومیو پیتھ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوتے رہیں یا وہ اپنے نام کا جھنڈا لہرانے کے لیے علامہ کتابی چیزیں شائع کروا سکیں؟ اگر یہ درست ہے تو یقیناً آپ دورِ جدید کے حاتم طائی ہیں جو دوسروں کے مفاد کے لیے اپنا مال اور وقت قربان کر رہے ہیں۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ ہومیو پیتھ ڈاکٹر آپ کا پریچر نہیں خریدیں گے۔

میں ایک ادیب ہوں۔ میں نے کبھی ادبی پریچر نہیں خریدا۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ادبی پریچر کے مدیر مجھے اپنا پریچر مفت بھیجیں گے اور وہ بھیجتے ہیں۔

اسی طرح ہومیو ڈاکٹر آپ سے پریچر نہیں خریدیں گے۔ وہ توقع رکھیں گے کہ آپ اُن کو اپنا پریچر اعزازی طور پر بھیجیں۔ اگر یہ پریچر ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کے لیے جاری کیا گیا ہے اور ہومیو ڈاکٹر خریدتے نہیں تو جناب کلیم صاحب، یہ فرمائیے کہ اس پریچر کو کون خریدے گا؟ میں تو نہیں خریدوں گا۔ اس لیے کہ یہ پریچر میرے لیے تو خالص آب آب ہے۔ اس کے مندرجات عام قاری کے لیے نہیں ہیں۔

کلیم صاحب، آپ تو بنیادی طور پر ادیب ہیں۔ آپ ادبی پریچر کے متعلق واقفیت رکھتے ہیں۔ آج کل ادبی پریچر نکالنا ایک عیاشی ہے۔ کچھ سر بھرے لوگ اس عیاشی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ادبی اور ہومیو پیتھ پریچر میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ دونوں کے خریدار نہیں ہیں۔

پُرانی بات ہے، پاکستان میں ایک جرمن ادیب تشریف لائے۔ انھوں نے راولپنڈی کے ادیبوں کو اکٹھا کیا اور انھیں سمٹ ڈانٹ پلائی۔ کہنے لگے کہ آپ اپنی تخلیقات کو عالمی ادیبوں اور قارئین کے سامنے کیوں پیش کرتے؟ دیکھیے، میں جرمنی سے چل کر یہاں آیا ہوں تاکہ پاکستانی

ادب سے دُنیا کو رُشناس کراؤں۔ اس ڈانٹ کے جواب میں پاکستانی ادیبوں نے آئیں بائیں شائیں کی۔ سچی بات کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے جرمن پروفیسر صاحب سے کہا کہ جناب والا، ہم پاکستانی ادیبوں کی ایک پرابلم ہے۔ یہیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لہذا ہم معاذ حق سے محروم ہیں۔ ہم شوقیہ اللہ واسطے ادب لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادبی پرچے نہیں چلتے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہو رہی ہے۔

دلیسے بھی کلیم صاحب، آپ کو علم ہے کہ پرچے بکری کے زور پر نہیں چلتے۔ اشتہاروں کے زور پر چلتے ہیں۔ ادرا آپ کے پرچے میں خدا کے فضل سے کوئی اشتہار نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک میں آپ کی طبیعت سے واقف ہوں، آپ کبھی اشتہار حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اب آئیے ایک سنجیدہ مسئلے پر غور کریں۔ آپس کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہو رہی ہے کے سامنے کون سا ایسا مسئلہ درپیش ہے جو اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔

اس وقت یقیناً یہ مسئلہ اہم نہیں کہ کیا ہو رہی ہے حیاتین کو مانتی ہے۔ یہ مسئلہ بھی اہم نہیں کہ کیا سینگل ریمڈی ضروری ہے یا مرکبات کو بھی موقع دیا جائے۔ یہ مسئلہ بھی اہم نہیں کہ چھوٹی پوٹینسیاں زیادہ زور اثر ہیں یا اونچی پوٹینسیاں۔ میں مانتا ہوں کہ دلیسے تو یہ سب مسئلے اہم ہیں، لیکن اس وقت ان کی حیثیت ضمنی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا صورتِ حال ہے، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی بات تفصیلی طور پر بیان کروں۔

ہمارے ہاں اس وقت صرف ایک طریقہ علاج مردج ہے۔ یہ طریقہ علاج ”باگ برنس“ کے ماحقوں میں ہے۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے اس طریقہ علاج کو فیشن میں بدل دیا ہے۔ سٹیٹس کا نشان بنا دیا ہے۔ پریسٹیجس بنا دیا ہے۔

آج کے برنس نے پھیز کو رائج کرنے کا ایک الٹا طریقہ دریافت کیا ہے۔ مثلاً

کسی مشروب کو رائج کرنا مقصود ہے تو اشتہار کے ذریعے آپ اسے سٹیٹس کا نشان بنا دیں۔ یہ نہ کہیں کہ کوک ایک فائدہ مند مشروب ہے بلکہ یہ کہیں کہ وہ لوگ کوک پیتے ہیں جنہیں امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً پی آئی اے اشتہار دیتا ہے : باکمال لوگ لاجواب پرواز۔ اس جملے کی وجہ سے پی آئی اے میں سفر کرنا عزت کا نشان ہو گیا ہے۔ سٹیٹس کا نشان بن گیا ہے۔ بگ بزنس نے ایلو پیٹھک دعائیاں کھانے کو سٹیٹس سمبل بنا دیا ہے بیگمات بڑے اہتمام سے طرح طرح کی گوشتیاں کھاتی ہیں۔ ڈرائنگ روم کی میز پر گولیوں کی بوتلیں قرینے سے لگی ہوتی ہیں تاکہ آتے جاتے لوگ دیکھیں یہ دماغ منر ہیں۔ یہ سالٹس ہیں۔ یہ ٹوٹک ہیں۔ یہ گولی معدے کو ٹھیک ٹھاک رکھتی ہے۔ ایسڈٹی کو دور کرتی ہے۔

پُرانے زمانے میں ڈاکٹروں کی دکانوں پر مفرد دواٹیاں بوتلوں میں رکھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نسخوں میں مفرد دواٹیاں لکھا کرتے تھے۔ دوائی کا نام اور اس کی مقدار سب درج ہوتے۔ ڈاکٹروں کے کمپاؤنڈریاں بناتے تھے۔ ایک ایک دوا کو میزنگ گلاس میں ڈالتے، نانپے، پھر بوتل میں ڈال دیتے۔ یعنی کمپاؤنڈر دوا کو میسج کیا کرتے تھے۔

اگر یہ طریق کار جاری رہتا تو کاروبار دواساز کمپنیوں کے ہاتھ میں نہ آتا۔ لہذا دواساز کمپنیوں نے بڑی محنت اور چالاکی سے مفرد دواؤں کا رواج ختم کر دیا۔ اس کی جگہ تیار شدہ مرکبات بنا دیے اور لیوں کا روبر بار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ادویات کے بگ برنس نے ایک بہت بڑا امرانہ پایا ہے کہ آج کے دور میں لوگ افادہ چاہتے ہیں۔ جھٹ پٹ افادہ۔ ابھی ابھی ٹھیک کر دو تاکہ شام کی مصروفیات میں خلل نہ آئے۔ کیور یا شفا کے متعلق پھر کبھی فرصت میں سوچیں گے۔ اس لیے انھوں نے زیادہ تر توجہ افادہ بخش ادویات پر مرکوز کر دی ہے۔ گولی کھاؤ۔ ٹھیک ہو جاؤ۔ کیور کی طرف توجہ کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔ افادے کے تحت آپ روز گولی کھائیں گے۔ جب تک جیٹھ گئے، کھاتے رہیں گے۔ لہذا گولیاں زیادہ کیں گی۔ ظاہر ہے کہ برنس کے

نقطہ نظر سے افادہ بخش ادویات بنانا زیادہ منفعت بخش ہے۔ اس وجہ سے بگ بزنس نے کیر کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ان کا مقصد وصحت نہیں، کاروبار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایلو پیتھی امیر جنسی کا سسٹم بن کر رہ گیا ہے۔ اور بیشتر عارضوں کی دوا سے آج تک محروم ہے۔

امیر جنسی کے علاوہ ایلو پیتھی سر جہزی میں بڑی ہمارت رکھتی ہے۔ اس لیے جس عارضے کی دوا موجود نہیں اُسے آپریشن سے ٹھیک کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آپریشن دراصل ادویہ کے فقدان کی دلیل ہے۔ اس بات پر آج تک پردہ پڑا رہا ہے کہ ایلو پیتھی ادویہ میں تلاش ہے۔ اس کے پاس بہت سے امراض کی دوا سرے سے موجود ہی نہیں۔ اب صورت حال کچھ بدل رہی ہے۔ لوگ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ایلو پیتھی میں ہر مرض کی دوا موجود نہیں۔

اللہ پاکستانی ڈاکٹروں کا بھلا کرے۔ انھوں نے اندھا دھند نئی بائیوٹیکس دے دے کر لوگوں کو چونک کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے ہیں۔ بہت سے مریض ایسے ہیں کہ انگریزی دوائیاں کھا کھا کر ان کے ری ایکشنز کی وجہ سے مستقل مریض بن چکے ہیں۔ کچھ مریض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں میری صحت اچھی بھلی تھی، لیکن جب سے میں نے آپریشن کر دیا ہے، سارا نظام جسم ہی دہم دہم ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ڈاکٹروں کی فیسوں اور ادویات پر خرچ کرتے کرتے تلاش ہو گئے ہیں اور اب کوئی متبادل طریق علاج سوچنے پر مجبور ہیں۔

کچھ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ایلو پیتھی مرض کو دور نہیں کرتی، بلکہ دیا دیتی ہے اور یہ دیا ہوا مواد مملک تر صورت میں پھر سے اُبھرتا ہے۔

جناب کلیم صاحب، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو ہو میو پیتھی کو درپیش ہے، یہ ہے کہ لوہا گرم ہے، چوٹ لگائیے۔

- اس دقت لائن کے گن گانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لائن کے لیے خاص نمبر شائع کرنا، اس کا فلسفہ بیان کرنا، بے معنی ہے۔ اس دقت ضرورت اس بات کی ہے کہ شہر کے سرکردہ ہومیوپیتھس ہر چند ماہ کے بعد ایک پریس کانفرنس بلائیں جس میں اخبار نویسوں کے علاوہ ادیب بھی موجود ہوں، دانشور بھی ہوں۔ اس پریس کانفرنس میں آپ وہ نکات پیش کریں جن سے ثابت ہو کہ بحیثیتِ طریقِ علاج ہومیوپیتھی کو ایلوپیتھی پر فضیلت حاصل ہے مثلاً:
- ۱۔ ہومیوپیتھی ادویات کے معاملے میں ایلوپیتھی کے مقابلے میں زیادہ ”درج“ ہے۔ اور ہومیوپیتھی کے پاس بہت زیادہ تعداد میں دوائیاں موجود ہیں۔
 - ۲۔ ہومیوپیتھک ادویات کا ری ایکشن نہیں ہوتا۔
 - ۳۔ ہومیوپیتھی کی ہر خوراک انجکشن کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہ معدے میں نہیں جاتی بلکہ منہ سے سیدھی خون میں شامل ہو جاتی ہے۔
 - ۴۔ ہومیوپیتھک ادویات بسا اوقات مرلین کو آپریشن سے نجات دلا دیتی ہیں۔
 - ۵۔ ہومیوپیتھک دوائیاں صرف شفا ہی نہیں بخشتیں، وہ امراض سے تحفظ بھی دیتی ہیں۔
 - ۶۔ ہومیوپیتھک دوائیاں مقابلتا بہت سستی ہوتی ہیں۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے ہومیوپیتھی زیادہ موزوں علاج ہے۔
 - ۷۔ ہومیوپیتھی میں ایسی دوائیاں موجود ہیں جو شراب اور تمباکو جیسی بُری عادت چھڑا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ چائے پینے، شراب نوشی اور تمباکو نوشی کے بُرے اثرات کو زائل کر سکتی ہیں۔
 - ۸۔ ہومیوپیتھی میں ایسی ادویات موجود ہیں جو غم، فکر، دہم، عشق اور خوف کی شدت کو کم کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔
 - ۹۔ ہومیوپیتھی مزمین بیماریوں کیلئے تیر بہدف کا کام کرتی ہے۔ چاہے بیماری ساہا سال پُرانی ہو۔

جناب کلیم صاحب، آپ اور ہومیوپیتھ ڈاکٹر میری نسبت ہومیوپیتھی کی فضیلت کے نکات سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

لازم ہے کہ اس پریس کانفرنس میں خصوصی کیس پیش کیے جائیں، اُن پر پڑھے لکھے مریضوں کو پیش کیا جائے جنہوں نے ہومیوپیتھک علاج کے باعث مہلک امراض سے نجات پائی ہے، ان کی مصدقہ کیس ہسپتال ٹیسٹوں کی رپورٹوں کے ساتھ پیش کی جائیں۔

مقصود یہ ہے کہ صحافیوں اور دانشوروں کو یقین دلایا جاسکے کہ ہومیوپیتھک طریقہ علاج یقینی طور پر ایلوپیتھی پر فضیلت رکھتا ہے۔ اگر ہم چند ایک اخبار نویسوں، ادیبوں اور دانشوروں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں اور پریس میں ایسے کیسز کی اشاعت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہومیوپیتھی کی طرف لوگوں کا عام رجحان نہ ہو جائے۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

آپ کے پیرچے میں میں نے چند ایک مضامین چھپوائے ہیں۔ ان مضامین کا مقصد صرف یہ تھا کہ عام قاری کو ہومیوپیتھی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ لیکن آپ کے پرچے کے عالمانہ اور محققانہ مضامین میں میرا مضمون ایسے لگتا تھا جیسے موروں میں ایک کو آہ بیٹھا ہو۔ یا جیسے شہدہ راگ میں ایک برجستہ سُر لگادیا گیا ہو۔ چند لوگوں نے ان مضامین پر حیرت کا اظہار کیا۔ گمان غالب ہے کہ ہومیو ڈاکٹروں نے جتنے بغیر میرے مضامین کا مذاق اڑایا ہوگا۔ کلیم صاحب! میں ہومیوپیتھی کا ایک پروانہ ہوں اور میری زندگی کا ایک مقصد یہ

بھی ہے کہ لوگ ہومیوپیتھی کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے مستفید ہوں۔ میرا ارادہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر بننے کا نہیں ہے۔ چونکہ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں، اس لیے میرا مقصد ذاتی مفاد نہیں ہے۔ آپ کو ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے جن میں یہ جذبہ ہو کہ لوگوں کی توجہ

ہومیوپیتھی کی طرف مبذول کریں۔ اس میں ہومیوپیتھی کا بھلا نہیں، نہ ہی ہومیو ڈاکٹروں کا بھلا ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھلا ہے جو انجانے میں فیثنی طریقہ علاج کی وجہ سے اپنی صحت کو تباہ کیے جا رہے ہیں۔

ناقابل فراموش

میں معجزات کو مانتا ہوں لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں کشف کو اہمیت نہیں دیتا۔

ما فوق الفطرت واقعات میرے لیے باعث حیرت ضرور ہیں لیکن میں انہیں ما فوق الفطرت نہیں سمجھتا۔ اگر آپ سچے دل سے مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تو پھر ما فوق الفطرت کے معنی؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی عقل محدود ہے اور حسیات کا دائرہ کار محدود ہے تو پھر حیرت واقعہ پر نہیں بلکہ اللہ کی عظمت پر ہوتی ہے۔

سائنس جان بوجھ کر ما فوق الفطرت سے مُٹھ موڑے بیٹھی ہے۔ بیماری کیا کرے۔ تسلیم کرے تو مشکل، رد کرے تو مشکل۔ اور ما فوق الفطرت واقعات روئے زمین پر اکثر و بیشتر ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ما فوق الفطرت واقعہ اللہ کی طرف سے ایک پیغام ہے۔ ایک یاد دہانی ”تھخا اُرُخ ٹھیک نہیں۔ اسے ٹھیک کرو۔ اب بھی سمجھ جاؤ۔ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ سب کچھ سامنے پڑا ہے۔ عیاں ہے۔ کوئی پردہ حائل نہیں۔ دیکھ لو۔“

بہر صورت، میری دانست میں سب سے بڑا معجزہ صرف ایک ہے جو مجھ پر رونما ہوا۔ گمان غالب ہے کہ آپ اسے اہمیت نہیں دیں گے۔ کہیں گے کہ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اہم ترین واقعہ ہے جو کسی انسان پر وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔

سکول میں میں ایک نالائق طالب تھا۔ رعایتی پاس ہو جاتا، کیوں کہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا

تھا۔ کالج میں دل نہ لگا کیوں کہ شدید احساس کمتری کا شکار تھا۔ بی اے میں عشق کا آزار لگا بیٹھا۔ پھر یہ بلبلہ چھوٹا۔ ایک تکلیف دہ خلا پیدا ہو گیا۔ اتفاقاً سامنے کتاب آگئی۔ مطالعے میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں برٹرینڈ رسل، ولیمز، ہالڈین، ہیکلے پیٹن پیش تھے۔ انھوں نے مجھے سائنسی اور سیکولر رُخ عطا کر دیا۔ پہلے ہی مذہب سے کور اٹھا۔ مزید سپاٹ ہو گیا۔ پھر فلسفے سے نفسیات میں جاگھسا۔ نفسیات سے جنس اور سائیکس سائنس یعنی ای ایس پی میں جا پہنچا۔ مختصر یہ کہ ان دنوں میں ایک معقول پڑھا لکھا بے مذہب سیکر تھا جسے روحانیت کا شور نہ تھا۔

ان دنوں میں راولپنڈی میں وزارت اطلاعات کے ایک ذیلی دفتر میں کام کرتا تھا۔ پہلے بڑا صاحب مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ پھر دفعتاً بظاہر بے درجہ میرے خلاف ہو گیا۔ اس نے مجھ پر دو کیسز کر دیے۔ ایک عام سا اور دوسرا سنگین نوعیت کا تھا۔ میں طبعا ڈرپوک اور نردس آدمی ہوں۔ بار بار کی جواب طلبیوں اور انکوائری کمیٹیوں سے سخت گھبرا گیا۔ ایک دن حلقہٴ ارباب ذوق راولپنڈی کے سیکرٹری عزیز ملک، جو ایک جانے پہچانے صاحب طرز ادیب ہیں، مجھ سے کہنے لگے ”مفتی صاحب، معلوم ہوتا ہے آپ پریشان ہیں۔ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں ہوں“ اور میں نے اسے سارا قصہ سُنا دیا۔ ملک بولا ”اگر آپ کہیں تو میں کسی بزرگ سے درخواست کر دوں آپ کے لیے دعا کریں“ میں نے کہا ”ضرور کیجیے“

کہنے کو تو میں نے کر دیا لیکن ان دنوں نہ میں بزرگ کے مفہوم سے واقف تھا، نہ دعا کی طاقت کا شعور رکھتا تھا۔ عزیز ملک کہیں ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ صاحب روحانیت بھی ہے اور ایک بزرگ کی خدمت میں پچیس سال سے باقاعدہ حاضری دیتا رہا ہے۔

چند ایک روز کے بعد ملک مجھ سے ملا۔ کہنے لگا ”میں نے ان بزرگ سے آپ کا

تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا: ہم تو اس لائق نہیں کہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مفتی صاحب کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جائیں اور ان سے کہیں کہ وہ خود ان کی خدمت میں دُعا کے لیے گزارش کریں۔“

یہ سب باتیں میرے لیے بے معنی تھیں۔ میں ان کے معنوم سے واقف نہ تھا۔ لیکن عزیز ملک کے جذبہ ہمدردی اور خُصّی اخلاق کی وجہ سے میں نے اس کے ساتھ جانا قبول کر لیا۔ ملک نے کہا ”جُٹے کے روز میں آپ کو سرکار قبلہ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔“ جُٹے کے روز عزیز ملک آگیا اور ہم دونوں چل پڑے۔ چلتے چلتے ہم مریط کے قبرستان میں جا پہنچے۔ مریط راولپنڈی صدر کا ایک مضام ہے جو ریلوے لائن پر واقع ہے۔ قبرستان میں ایک چوگان سا تھا جس کے گرد تار لگی ہوئی تھی۔ چوگان کے اندر کچھ پیڑ تھے۔ ایک لمبا چوڑا پختہ تھرا سا بنا ہوا تھا۔ اس کے ملحق ایک چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری میں ایک جانب کھڑکی نما دروازہ تھا۔

جب ملک اس کھڑکی نما دروازے میں داخل ہوا تو میں گھبرا گیا۔ میں سمجھا تھا کہ سرکار قبلہ کسی فرد کا نام ہوگا جس کے حضور مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ کسی مزار یا قبر پر نہ جانا میرے لیے ناقابل قبول بات تھی۔ کسی بُزرگ سے دُعا کرانے میں پھر بھی کوئی بات تھی لیکن قبر سے مخاطب ہونا، کسی مرحوم و مغفور کو دُعا کے لیے کہنا، میرے لیے قطعی طور پر مضحکہ خیز تھا۔ اس وقت اگر مجھ میں اخلاقی جرأت ہوتی تو میں ملک سے کہتا ”عزیز ملک، تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ایک صاحب طرز ادیب ہو۔ صاحب عقل و دانش ہو۔ ذہنی طور پر حقیقت پسند ہو۔ پھر یہ کیا حماقت ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ اب میں اس مٹی کے ڈھیر سے کیا کموں؟ کیسے درخواست کروں کہ دُعا کرو۔ یا، میرا مذاق تو نہ اُٹاؤ۔“ لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی۔ اس لیے میں بُرے سے دل سے چُپ چاپ ملک کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ اندر رنگین ٹائلوں کا فرش بچھا تھا اور ایک طرف سفید ٹائلوں کا مرقد بنا ہوا تھا۔ مرقد کے پتھر پر لکھا تھا ”حضرت سائیں الہ بخش نقشبندی

قلندری! نہ مجھے نقشبندی کے مفہوم کا علم تھا، نہ قلندری کا پتا تھا۔ ساری باتیں ہی مہل تھیں۔

ملک نے کہا ”مفتی صاحب، آپ کو کوئی آیت یاد ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں۔ صرف الحمد۔“

بولاً ”ٹھیک ہے۔ الحمد شریف پڑھیے۔ پھر درود شریف پڑھیے۔ اور پھر نہایت خشوع

سے اپنی درخواست پیش کر دیجیے۔“

”خشوع۔!“ مجھے ہنسی آگئی ”نہ یقین، نہ ایمان۔ خشوع کہاں سے آئے گا۔“

بہر حال، میں نے دوسرے کچھ اٹھاٹھے، زبان نے روکھے انداز سے الحمد پڑھی اور پھر میں نے اپنی گزارش کر دی۔ وہ گزارش گزارش نہ تھی، منت نہ تھی، التجا نہ تھی۔ جب سامنے قابل احترام ہستی کے وجود کا احساس ہی نہ ہو تو منت کیسی، التجا کیسی۔ اس سارے عمل میں نہ ذہن شامل ہوا نہ دل۔ زبان نے بھی محض رسم ادا کی۔

چار دیواری سے باہر نکل کر میں نے سچے دل سے زیر لب کہا ”شکر ہے۔ جان چھوٹی۔“

ملک صدر میں رہتا تھا۔ میں شہر میں۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ اس لیے ملک

نے مجھے خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گیا۔

پچھ سات دن گزر گئے۔

اس دوران میں میں اس مزار اور دُعا کے لطیفے پر دل کھول کر ہنس لیا اور پھر اس واقعے کو بھول گیا۔ ایک روز ملک پھر آگیا۔ کچھ مضطرب سا تھا۔ بولاً ”مفتی صاحب! ہم سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

بولاً ”میں بھائی جان سے ملا تھا۔“

”یہ بھائی جان کون ہیں؟“

”وہ سائیں اللہ بخش کے بالکے ہیں۔“

”آپ انہیں بھائی جان کیوں کہتے ہیں؟“
ملک بولا ”نقشبندی اپنے مرشد کو بھائی جان کہہ کر بلا تے ہیں۔“
”نقشبندی کون ہیں؟“

ملک ہنسا۔ بولا ”آپ کو سب علم ہو جائے گا۔ چوں کہ بھائی جان نے بتایا ہے کہ مفتی ہمارا بھائی ہے، ظاہر ہے کہ آپ بہت جلد تم میں شامل ہو جائیں گے۔“
اس خوش فہمی پر میں بہت محظوظ ہوا۔

ملک بولا ”مفتی جی، ہم سے غلطی ہو گئی کہ ہم نے سرکار قبلہ کی خدمت میں جمعے کے روز حاضری دی۔ بھائی جان فرماتے ہیں کہ جمعے کے روز صاحب مزار اپنے مقام پر موجود نہیں ہوتے۔“
یہ سن کر میرا جی چاہا کہ تہنہ مار کر ہنس دوں۔ مجھے ملک کی عقلِ سلیم پر شکوک پیدا ہونے لگے۔ میں نے حیرت سے ملک کی طرف دیکھا۔ یہ کیسا آدمی ہے! بظاہر اس قدر معقول لیکن باطن میں اس قدر محمول!

ملک بولا ”بھائی جان فرماتے ہیں، ایک مرتبہ پھر سرکار قبلہ کی خدمت میں حاضری دو لیکن جمعے کا روز نہ ہو۔“

”مانی گاڈ! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔“

جی چاہتا تھا کہ ملک سے صاف صاف کہ دوں ”جناب والا، مجھے اور نہ بناؤ۔ بہت ہو لیا۔ اب جان بچھڑے۔“ مگر ملک کے مردِ ہردا ایسی بات کرنا ممکن نہیں۔ اس کی شخصیت اتنی پُر وقار ہے، اس کے انداز میں اس قدر خلوص ہے کہ آپ عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔
میں نے بھی مجبوراً تسلیم خم کر دیا۔

اس کے باوجود میرے اندر بھٹکنے ناچ رہے تھے۔ ”صاحب مزار اپنے مقام پر حاضری نہیں ہوتا۔ ہند! جمعے کے دن چھٹی کرتا ہے۔ درخواستیں موصول نہیں کرتا۔ ہا ہا ہا۔ ہا ہا! مئی کے نو دسے تلے دبا ہوا سرکار قبلہ!“

اندر ایک ہنگامہ بچا ہوا تھا۔ برٹریڈ رسل مسکرا رہا تھا۔ طنز بھری مسکراہٹ۔ بکسے سر پیٹ رہا تھا۔ دلیز طعنے دے رہا تھا۔ فرائیڈ سر تھا مے بیٹھا تھا۔ مارکس تلوار لہرا رہا تھا۔ چند روز کے بعد ملک پھر میرے دفتر آگیا۔ بولا "اگر آپ کو فرصت ہو تو چلیے سرکار قبہ کی خدمت میں ماضی دے آئیں"

ہم دونوں چل پڑے۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے قربانی کا بکرہ تھا۔ طبیعت غم و غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ اس روز مجھے سائیں اللہ بخش کامرا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی مداری کا ڈیرہ ہو۔ میں نے تمسخر آمیز انداز میں الحمد للہ، غیر دعائے انداز میں دعا کی، یوں جیسے کوئی کسی کا مذاق اڑاتا ہے۔

باہر نکل کر میں نے سچے دل سے لا حول پڑھی۔ چلو جان چھٹی۔ ملک اس کا ذخیرہ کی تکمیل پر بہت خوش تھا۔ اور میں اسے ذہنی مریض سمجھ رہا تھا۔ خیر، ملک نے مجھے خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گیا۔

دہاں سے میرا گھر تقریباً ایک میل دُور تھا۔ آدھا میل کھیتوں سے گزرنا پڑتا۔ اس کے بعد آدھا میل آبادی سے۔ ابھی میں مزار سے تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ میرے اندر گویا ایک ہوائی سی چلی ایسے لگا جیسے اندر زدن سے سوڑا واٹر کی بوتل کھل گئی ہو۔ مبلبلوں کا ایک طوفان اُٹھا اور پھر ان جانے میں میں کچے شیشے کے گلاس کی طرح ترخ گیا۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر بھیں بھیں کر کے رونے لگا۔ پتا نہیں میں دہاں کتنی دیر کھڑا رہتا رہا۔ جب کچھ ہوش آیا تو میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کسی نے دیکھا تو نہیں؟ شکر ہے قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ پھر میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیا ہوا؟ مانی گاڈ! ان دنوں اللہ سے مُتعارف نہ تھا، اس لیے مانی گاڈ، مانی گاڈ چلاتا رہا۔ اس زمانے میں نہ تو میں بزرگوں کی طاقت سے واقف تھا، نہ رقت کی کیفیت سے آشنا۔ نہ ہی مجھے علم تھا کہ بزرگ جادوگر ہوتے ہیں، طبیعت میں جلال بھی ہوتا ہے، احساس مزاج بھی اور تماشا دیکھنے کا شوق بھی۔ اس لیے یہ واقعہ میرے لیے حیران کن تھا۔ میں سمجھتا تھا اس

کیفیت کا صاحبِ مدار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو کوئی ذہنی عارضہ ہے۔

اس زمانے میں ادب میں داستودسکی میرا رہبر تھا۔ اس کی تحریریں میرے بند بند میں رچی ہوئی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ وہ نارمل نہ تھا۔ اس پر سرگی کے دورے پڑتے تھے۔ میں سمجھا شاید میں بھی داستودسکی کے نقش قدم پر چل نکلا ہوں۔ کچھ دیر تو میں نے آنسو پونچھے، منہ صاف کیا، پھر خود کو سنبھالا اور آگے چل پڑا۔ سوہجاس قدم چلا تھا کہ پھر وہی ہوائی چلی۔ دڑ سے سوڑے کی بوتل کھٹی، بلبلوں کا ایک طوفان اوپر کی طرف اُبھرا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شدید کوشش کی لیکن اس وقت گویا میں میں نہ تھا۔ میری ہن دو جھٹوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک سوچنے والا میں، ایک محسوس کرنے والا میں۔ محسوس کرنے والے میں سے پھینٹے اڑ رہے تھے، جھاگ اٹھ رہا تھا۔ بند بند بھن کر رہا تھا۔ جیسے جھڑوں کا چھٹا ہو۔ سوچنے والے میں کے ہاتھ سے کنزرو دل نکل چکا تھا۔ وہ بے بس لاچار کھڑا تھا۔ مائی گاڈ! مائی گاڈ! — یہ کیا ہو رہا ہے!

اس آدھ میل کے فاصلے کے دوران مجھ پر تین دورے پڑے۔ اس کے بعد سوچنے والوں بالکل فیور ہو کر رہ گیا۔ عجز اور بے بسی سے چور، خوف اور حیرت سے آدھ مڑا۔ پھر آبادی کا علاقہ آگیا۔ مجھ پر مزید خوف طاری ہو گیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ مجھے پاگل خانے سے چھٹا ہوا سمجھیں گے۔ اگر کسی واقف کار نے دیکھ لیا تو؟ مجھے مائی گاڈ کتنا بھی بھول گیا۔ آبادی میں پہنچ کر میں نے مفطر سے منہ لپیٹ لیا اور بھاگنا شروع کر دیا — پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ ایک جگہ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے، دوسری جگہ مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے تھے، کچھ مسخرے ہنس رہے تھے۔ دو ایک دھندلے سے آواز سے سنائی دیے: پاگل ای ادے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے خود کو اچھی طرح سنبھالا۔ منہ پونچھا۔ آنکھیں صاف کیں۔ پھر پر سنجیدگی سبائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں سخت خوف زدہ تھا۔ اگر گھر میں دورہ پڑ گیا تو؟ میں دورے سے نہیں، اپنی بیوی سے ڈرتا تھا۔

میری بیوی امین آباد کے شیخوں میں سے ہے۔ وہ سب نو مسلم ہیں۔ انہیں بت پرستی کسی صورت میں گوارا نہیں۔ لہذا وہ نہ پیر کو مانتے ہیں، نہ فقیر کو، نہ معجزات کو، نہ کشف کو۔ وہ صرف اللہ کی ذات کو مانتے ہیں۔ قرآن کے احکامات کو مانتے ہیں اور بس۔ اگر ان کا بس چلے تو پیغمبروں کو بھی بندے سے زیادہ حیثیت دینے سے انکار کر دیں۔ کسی بزرگ یا بابا کی بات کدوں تو میری بیوی کے چہرے پر تمسخر بھری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اس مسکراہٹ کی دھار میں بہت کاٹ ہوتی ہے۔ میں اس کاٹ سے خائف ہوں۔

اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا۔ سوائے کوٹلا سنٹر والے بابا کے۔ کوٹلا سنٹر کے بابا کے ڈیرے پر میں اتفاق سے جا پہنچا تھا۔ اس عمل میں نہ طلب کا دخل تھا، نہ یقین کا، نہ ایمان کا۔ ہوائیوں کے ایک روز صدر بازار میں گھومتے پھرتے مجھے قیوم مل گیا۔ قیوم میرا پڑانا اور بے تکلف دوست تھا۔ وہ ایک مٹھ پھٹ، جاذب اور شوخ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے پنڈی میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

”ارے بتم یہاں؟“ میں چلتا یا۔

”کیوں؟ میرے پنڈی آنے پر یں لگی ہے کیا؟“

”مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟“

”کیسے دیتا؟“ وہ بولا ”والد محترم ساتھ ہیں۔ باادب با ملاحظہ ہوشیار کا عالم ہے۔ یا ر دوست کی گنجائش نہیں؟“

”چلو کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر باتیں کریں؟“

”اوندوں۔ ریسٹوران نہیں۔ چل میں تجھے ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں فیسٹ کلاس

کڑک چائے ملے گی اور ایسی رنگین محفل کہ رنگ رس میں ڈوبے بیٹھے رہو گے۔“

وہ مجھے کوٹلا سنٹر کے بابا کے حجرے میں لے گیا۔

صدر بازار کے ایک کونے میں وہ ایک لمبا سا کمرہ تھا۔ دیواریں اور فرش مٹی سے

پتے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگ قطار میں احترام کی دہ سے گھڑیاں بنے بیٹھے تھے۔ ایک سمت ایک پہلوان نماد می جس کا سر اور بھنویں منڈی ہوئی تھیں، سفید چادر پیٹے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی تھالیوں میں دو مٹی کے دیے جل رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا جیسے میں کسی اور دنیا میں آداخل ہوا ہوں۔ مٹی کے دیوں کی دھندلی روشنی نے کمرے کو پراسرار بنا دکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے الف لیلا کا کوئی باب کھل گیا ہو۔

بابا کے منڈے ہوئے سر اور بھوڑوں کے گرد در در بڑے بڑے کان دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیک دی جائنٹ کھڑا ہو، اور اس کے گرد قطاروں میں مردوں کی لاشیں ڈھیر ہو رہی ہوں۔ قیوم نے داخل ہوتے ہی بڑے بے باکانہ انداز میں السلام علیکم کہا۔ گویا کسی نے سم سم بھونک دیا۔ اس پر دیواروں سے لگی ہوئی ڈھیریوں میں جان پڑ گئی۔ وہ سب سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور باری باری ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔ آخر میں بابا کی باری تھی۔ وہ جوں کا توں بیٹھا تھا۔ قیوم جھکا۔ بابا سے مصافحہ کیا۔ بابا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر کو تھپکا اور پھر ہم ایک طرف کونے میں بیٹھ گئے۔ ”بسم اللہ بسم اللہ۔ مہمان آئے ہیں“ بابا بڑبڑایا۔ اس پر بابا کا خدمت گار اٹھا۔ اس نے ایک بریڈی کیتلی اٹھائی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے کڑواک تھی۔ گرم تھی۔ بے خوشبو کے لذیذ تھی۔

قیوم اور میں اندھیرے کونے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ”ابے یہ لائینز ڈن (LIONS DEN) تو نے کیسے ڈھونڈا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ بولا ”یہ امریکہ محترم والد صاحب کی دریافت ہے۔“

ماحول کی دہ سے ہم دہاں ذاتی گفتگو نہ کر سکے۔ ماحول کی پراسرار تیت نارمل گفتگو کرنے میں مزاحم تھی۔ ادھر بابا جھکا کر انداز میں باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں عالمانہ نہیں تھیں۔

پتا نہیں مجھے عالمانہ باتوں سے کیوں چڑھتا ہے۔ کوئی عالمانہ بات کرے تو مجھے ایسے گتے جیسے خالی زبان کرتب دکھا رہی ہو، اور بات کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد عالموں کی دل آزادی نہیں۔ لیکن کیا کروں۔ میں ایک انجان آدمی ہوں۔ جاننے سے دل چسپی نہیں رکھتا۔ ماننا چاہتا ہوں۔ اور ماننے کا ذہن سے نہیں، دل سے تعلق ہوتا ہے۔

بابا بڑی بڑی باتیں سیدھے سیدھے لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔

میں نے قیوم سے کہا ”یار، یہ بابا کیا چیز ہے؟“

قیوم بولا ”مجھے کیا لگتا ہے؟“

میں نے کہا ”یار، مجھے تو جہن لگتا ہے، جن!“

اس پر بابا محفل کو متوجہ کر کے بولا ”یہ آج پہلا آدمی ڈیرے پر آیا ہے جس نے میں پہچانا

ہے۔ کہتا ہے بابا جن ہے۔“

سب کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔

قیوم زبیر لب بولا ”یار، بابا بہت سنتا ہے۔ تو اور میں مل کر بھی اتنا نہیں سن سکتے جتنا

یہ سنتا ہے۔“

”مجھے پتا ہے“ بابا نے منہ موڑ کر کہا ”بولنا لذت ہے۔ سننا انسان کو دکھی بناتا ہے۔“

”ارے! یہ تو بڑا حاضر جواب بابا ہے“ میں نے سوچا۔ پھر میں نے محفل میں پھلجھڑیاں

چلاتی شروع کر دیں۔ دہل لوگ احترام کے بارے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ مجھے پھلجھڑیاں

چلاتے دیکھ کر سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اس پر بابا بولا ”بھئی، کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہماری

محفل میں ایک جلیبیاں تلنے والا آگیا۔“

اس کے بعد میں اور بابا دوست بن گئے۔ اور بابا لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ گیا کہ نہ دزد

حاضری دوں۔ میری حاضری کو نہ اسلام سے تعلق تھا، نہ ایمان سے، نہ روحانیت سے۔ وہ تو ایک

لذتِ کلام تھی جس کی وجہ سے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھتے اور بابا تحسین بھری نظر ڈالتا۔

اس لذت کے لیے میں دنوں روز جانے لگا۔ چائے عام ملتی تھی۔ مفت اور بار بار۔ چیلنے کے جیسے کیا مویں کے دن بابا گیارہ دہائیوں پکاتا اور میں بڑے پیارا درتو جڑ سے کھلاتا۔

ہاں تو اس وقت تک میری زندگی میں کوئی بابا داخل نہ ہوا تھا، سوائے کوئلا سنٹر کے بابا کے۔ اور اس سے بھی میں بابا کی حیثیت سے نہیں ملتا تھا۔ اٹا میں نے اُسے مسند سے اُتار کر اپنے پاس زمین پر بٹھالیا تھا۔

میری بیوی میرے بابا کے ہاں جانے پر میرا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ میں نے اسے لاکھ بار سمجھانے کی کوشش کی کہ نیک بخت میں بابا کے پاس نہیں جاتا، کوئی منت نہیں مانگتا، کوئی مسئلہ نہیں پوچھتا۔ نہ طلب ہے نہ مانگ۔ میں تو ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں اور وہ بڑا اچھا دوست ہے۔ لیکن میری بیوی میری بات نہ سمجھی اور میرا مذاق اڑاتی رہی۔

ہاں تو اس روز جب میں گھر میں داخل ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر گھر میں دورہ پڑ گیا اور میں جھیں جھیں کر کے رو پڑا تو میری بیوی کیا کہے گی۔

اس مصیبت سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے میں سیدھا اپنے بستر میں جا گھسا اور منہ پر رضائی لے لی تاکہ بیوی کی نگاہوں سے محفوظ رہوں۔

بیوی بولی ”آتے ہی بستر میں پڑ گئے۔ خیریت تو ہے؟“

میں نے کہا ”کچھ طبیعت خراب ہے۔ نیند آج نہ تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔“

وہ باہر چلی گئی اور باورچی خانے میں کام کرنے لگی۔ چلو جان چھوٹی، میں نے کہا۔ اور چپکے سے لیٹ گیا۔ پھر خیالات آنے لگے۔ میں ڈر گیا۔ اگر دھیان اسی وقتے پر کمزور ہا تو پھر ٹس سے سوتے کے بوتل کھل جائے گی۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر خیالات کا رخ موڑا۔ ہاں تو، اب نیا افسانہ لکھوں۔ مرکزی خیال کیا ہو؟

پھر دفعہ ”ایک چار دیواری دوڑتی ہوئی آئی اور میری رضائی میں گھس گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے چاروں طرف گہرا کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک مرتد اُبھرا۔ مرتد پر ایک بڑھا آدمی

سر پر ردھی ٹوپی لگائے بیٹھا حق پر رہتا تھا۔ پھر وہ تصویر متحرک ہو گئی، گویا رضائی میں فلم چلنے لگی۔ مرقد کی تختی قریب آگئی۔ اور قریب۔ اور قریب۔ ساری رضائی سائیں اللہ بخش سے بھر گئی۔ دفعۃً ہوائی اٹھری۔ آئی، آئی، میں نے سوچا۔ کہیں آواز پیدا نہ ہو۔ بیوی نہ سُن لے۔ میں نے رضائی منہ میں ٹھونس لی۔ ندوں۔ اوں۔ سوڈے کی بوتل کھل گئی۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی سر ہانے کھڑی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہے۔ "یہ رونے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟" میں نے بھٹ خڑاٹے لینے شروع کر دیے۔ وہ حیرت سے بڑبڑاتی ہوئی واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ "یہ کون رو رہا تھا؟ عجیب رو رہا تھا؟" اگلے روز جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔ بولی "ایک بات پوچھوں؟"

میں نے کہا "پوچھ؟"

بولی "آپ نے بابا بدل لیا ہے کیا؟"

میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ "بابا بدل لیا ہے!" میں نے مصنوعی حیرت سے

دہرایا۔

بولی "رات مجھے خواب میں اشارہ ہوا ہے۔"

یہ بھی ایک حیران کن بات ہے۔ میری بیوی روحانی دنیا کو بالکل نہیں مانتی۔ اس کے باوجود اسے اشارے ہوتے رہتے ہیں۔ میری بیوی کو عام طور سے ادھ سوتے ادھ جاگتے میں اشارے ہوتے ہیں۔ اور حیرت کی بات ہے کہ وہ ہمیشہ سچے ثابت ہوتے ہیں۔ جب بھی گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے تو وہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دیتی ہے۔

اس روز جب اس نے مجھ سے بابا بدلنے کی بات کی تو میں حیران رہ گیا۔ بہر حال اس

نے مصنوعی حیرت سے پوچھا "تجھے کیا اشارہ ہوا ہے؟"

بولی "آج صبح جب میں ادھ جاگی پڑی تھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سبز پوش بزرگ

اندر آئے۔ بولے: تیرے میاں نے جو یہ بابا اپنایا ہے، بالکل صحیح ہے۔ اس سے پہلے دالا غلط تھا۔“

میں کھسیانی ہنسی ہنسا۔ میں نے کہا ”یہ تمہارا وہم ہے“
بولی ”نہیں، وہم نہیں۔ انہوں نے مجھے نیا بابا دکھایا بھی تھا۔ اس نے سر پر رُومی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور وہ حقہ پی رہا تھا۔“

دفعۃً میرے سامنے وہ چار دیواری اُبھری۔ سفید ٹائلوں کے مرقد پر رُومی ٹوپی پہنے بابا حقہ پی رہا تھا۔ پھر وہ چار دیواری گھومتے لگی۔ میرے اندر ہوائی مٹی چلی۔ میں پھلانگ مار کر اُٹھا اور باقہ روم کی طرف بھاگا۔ یہ دیکھ کر میری بیوی ہکا بکا رہ گئی۔
وہ باقہ روم کے دروازے پر اکھڑی ہوئی۔ بولی ”خیریت تو ہے؟“ میں نے اس وقت مُنہ میں اپنی قمیص کا دامن ٹھونس رکھا تھا کہ مجھیں بھیس کی آواز نہ نکلے۔ کچھ دیر وہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ پھر چلی گئی۔

جب رقت کے دورے سے فارغ ہوا تو پہلی مرتبہ میرے مُنہ سے اللہ کے حضور التجا نکلی ”یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے!“

پہلی مرتبہ میں نے اللہ کو پکارا۔ خدا کو نہیں، مائی گاڈ کو نہیں، اللہ کو پکارا۔
آٹھ دس روز مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی۔ گھر والوں کو پتا چل گیا۔ دفتر والوں کو علم ہو گیا۔ وہ حیران تھے کہ مفتی کو کیا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ بڑے صاحب نے مجھے نہج کر دیا ہے اور میں ٹوٹ چکا ہوں۔

یہ خبر بڑے صاحب تک پہنچی۔ وہ ہمت خوش ہوئے۔ غالباً وہ یہی چاہتے تھے کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں، اور ان کے قدموں میں بچھ جاؤں۔ میری انا کو یہ گوارہ نہ تھا۔ پھر میں ملک کی طرف بھاگا۔ لیکن ملک سے صاف بات کہ دینا مجھے گوارہ نہ ہوا۔ ایک پڑھ لکھے، سمجھ دار اور معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا کتنا مشکل ہے کہ ایک مرحوم و مغفور

بابا نے اسے یوں پھلکا کر رکھ دیا ہے، جیسے ملک شیکری مشین دودھ کو چھلکا کر رکھ دیتی ہے۔
میں نے کہا ”ملک، یہ جو سائیں اللہ بخش ہیں، جن کے مزار پر تم مجھے لے گئے تھے،
یہ کون بزرگ ہیں؟“

ملک مسکرایا اور پھر بک شیلٹ سے ایک کتاب اٹھا کر لے آیا۔ کتاب کا نام تھا،
”مرد قلندر“۔ ملک نے کتاب میرے ہاتھ میں تھما کر کہا ”یہ پڑھ لیجیے۔ آپ کو سب پتا چل
جانے گا۔“

کتاب کے سرورق پر لکھا تھا ”عزیز ملک، یہ کتاب تم نے لکھی ہے کیا؟“ میں نے
ملک سے پوچھا۔

ملک نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کتاب پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ سائیں اللہ بخش کو
دروحانیت درثے میں ملی تھی۔ آباؤی پیشہ حجام کا تھا۔ بچپن میں پہلوانی کا شوق تھا۔ نوجوانی میں
ہی عشق الہی میں دالمانہ طور پر محو ہو گئے۔ خود کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت میں قلندرانہ رنگ غالب تھا۔
”مرد قلندر“ پہلا تذکرہ تھا جو میری نظر سے گزرا۔ اس میں بہت سی باتیں میرے لیے
حیران کن اور ناقابل قبول تھیں۔ اگر ان دنوں میں اس پریشان کیفیت میں نہ ہوتا جس میں کہ میں
تھا تو مرد قلندر کے چند ایک صفحات دیکھ کر لا حول پڑھ کر اسے بھینک دیتا۔ لیکن میں تو خود
حیران کن مشاہدات کے درمیان جی رہا تھا۔

مرد قلندر کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کچھ بھید نہ کھلا۔ اٹا اور بھی پراسرار ہو گیا۔
پھر اتفاقاً یوسف نضر کے گھر بھائی جان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا نام خواجہ جان محمد تھا۔
بھائی جان کو دیکھ کر بات اور بھی الجھ گئی۔

میرا خیال تھا کہ بھائی جان بابا ہم کی چیز ہوں گے۔ مرد قلندر کا رنگ غالب ہو گا۔ لیکن میرے
دُور و نزدیک خوش شکل، دراز قامت، چاق و چوبند، معزز اور معقول شخص کھڑا تھا۔ ان کی گفتگو
مسائلِ حاضرہ پر مرکوز تھی۔ نقطہ نظر حقیقت پسندانہ تھا۔ ان کا رویہ نہایت مخلصانہ تھا اور ان کے

برتاؤ سے اخلاص و محبت چھلک رہا تھا۔

بھائی جان کی شخصیت میں مذہبی عنقر مفقود تھا۔ ان کی گفتگو میں روحانی رنگ نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس ایک کردار تھا، اور اس کردار میں اسلامی اصول رچے بسے تھے۔ وہ غلو اور لاف زنی سے پرہیز کرتے تھے۔ منہ زبانی دعوے کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جو کہتے تھے اسے عملی طور پر کر دکھاتے تھے۔ عالمانہ بحث کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پند و نصیحت کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بھائی جان کے کردار سے میں بے حد متاثر ہوا۔ یہ کیسا بزرگ ہے جو زبان سے کچھ نہیں کہتا، عمل سے متاثر کرتا ہے!

میں نے تجلیے میں بھائی جان سے شکایت کی۔ میں نے کہا ”جناب“ میں نے تو سرکار قبلہ کو ایک دنیاوی مشکل میں مدد کرنے کے لیے پُکارا تھا۔ انھوں نے یہ کیا ظلم کیا کہ رقت طاری کر کے میری شخصیت کو ہی مسخ کر دیا۔“

میری شکایت سن کر وہ دفعۃً سنجیدہ ہو گئے۔ بولے ”میں تو ان کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ وہ مالک ہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھنے والا کون ہوں۔ تجھے افسوس ہے کہ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملہ سرکار قبلہ اور آپ کے درمیان ہے۔ آپ خود از سر نو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گزارش پیش کریں۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ مفسی اب سے آپ کا بھائی ہے۔ سو آپ کی حیثیت میرے برابر ہے اور میرے دل میں آپ کے لیے برادرانہ محبت ہے۔ میں ہر طرح بھائی کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

بھائی جان سے بات کرنے کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون اور اطمینان محسوس کیا۔ رقت کے دورے اسی روز ختم ہو گئے اور پھر وہ معجزہ رونما ہوا جو اس واقعے کا حاصل تھا۔ اسی روز جب میں بھائی جان سے مل کر گھر واپس جا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر بہت اچھل پھیل ہو رہی ہو، جیسے اندر کا حدودِ ارعہ بدل رہا ہو۔

پھر میری نگاہ سڑک کے کنارے اُگے ہوئے درخت پر جا پڑی۔ میں نے محسوس کیا

جیسے درخت کے پتے پتے پر اللہ لکھا ہوا ہو۔ پھر مجھے بلڈین کا وہ مضمون یاد آگیا ”سبز پتے کا معجزہ“۔ پھر جو میں نے نگاہ اٹھائی تو بتوں میں سے اللہ میاں جھانک رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے۔ ان بادلوں سے اللہ میاں میری طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پھر جمیز جنز کی ”کائنات“ میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ میرے روبرو کائنات اپنی تمام دستوں اور عظمتوں سمیت رونا ہونے لگی۔ عقب میں ایک نور اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمٹ کر اللہ بن گیا۔ میرے چاندوں طرف اللہ ہی اللہ ہو گیا۔ زمین، آسمان، شجر و حجر، انسان، جانور ہر چیز پر سے گویا پردہ اُٹھ گیا۔ بچے اللہ میاں مسکرا رہے تھے۔ میرے شبہات، دوسرے، عقل، دلیل سب کی دھمیاں اُڑ گئیں۔ اللہ تعالیٰ میرے روبرو کھڑے تھے۔ ساری دنیا سمٹ کر اللہ بن گئی تھی اور میں حیران کھڑا دیکھ رہا تھا، دیکھتا رہا۔ میرا رخ بدل چکا تھا۔ اور رخ کایوں آپ ہی آپ بدل جانا میرے نزدیک سب سے بڑا معجزہ ہے۔

عورت اور جنسیات

جنسیات کی رُو سے جسم کا وہ حصہ جو خواہشات پر اثر نہیں رکھتا، محض دکھاوا ہے۔ جسم سے جسم کی صرف بیرونی شکل مراد لینا اور انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کرنا غلطی ہے۔ ترتیب دینا بذاتِ خود محدود تصور کا وصف ہے، اور انسانی تخیل کے عجز پر وال ہے۔ فطرت ترتیب سے بلند تر اور بیگانہ ہے۔ چونکہ ہمارا تخیل محدود ہے، ہم غیر ترتیب شدہ کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے پیرزوں کو سمجھنے کی خاطر اپنی آسانی کے لیے ہمیں ایک نہ ایک ترتیب ایجاد کرنا پڑتی ہے، اور پھر اپنے عجز پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر اصول کے ساتھ مستثنیٰ کی کلی ٹانگنی لازم ہو جاتی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ مرد اُسے کہتے ہیں جو بظاہر مرد نظر آئے، یا جس نے بگڑی بازو رکھی ہو۔ لیکن جسم کی بیرونی شکل یا بگڑی قابلِ اعتبار نہیں۔ ڈھکے ہوئے مرتبان کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں مرتبا ہے یا اچار، لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ بیجونیوں کی بات پر اعتبار کر لینا درست نہیں۔ تو جسم کی بیرونی ساخت سے اندرونی خواہشات کا صرف اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو کسی صورت میں یقینی نہیں ہو سکتا۔

کسی فرد کا مرد یا عورت ہونا ان خواہشات پر مبنی ہے جن کا حامل جسم ہوتا ہے جنسیات کے گورکھ دھندے میں یہیں کئی ایک باتوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ مثلاً جسم کی بیرونی اور اندرونی ساخت، آرنڈوئس، بشوری اور لاشوری، اور وہ رجحانات جو ہویدا نہیں ہوتے بلکہ تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو جھپٹ کر کسی انفرادیت پر چھا جائیں۔

جنسیت کے اس الجھاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جنس کون سی ہے اور فلاں کون سی، اور کسی ایک جسم میں فلاں جنس کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم۔

کہتے ہیں، پُرانے زمانے میں مرد اور عورت ایک جسم میں رہا کرتے تھے۔ آثارِ قدیمہ سے برآمد کیے ہوئے بُت، سکتے اور پُرانی کتابیں اس امر کی شاہد ہیں۔ پھر نہ جانے کس بات پر دونوں کا جھگڑا ہو گیا، اور وہ اس افراتفری میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے کہ ایک کی کئی ایک چیزیں اور خصوصیات دوسرے کے پاس رہ گئیں۔ بھیجی سے ہر جسم میں عورت اور مرد کی خصوصیات خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ہر مرد میں ڈاڑھی مونچھ کے باوجود عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہے۔ اور ہر عورت کے گھونگھٹ تلے مرد چھپا ہوا ہے۔ یعنی کسی فرد کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں مرد کہاں ختم ہوا اور کہاں عورت ابھر آئی۔ مرد اور عورت کی گزشتہ لڑائی آج بھی "جنسی ضد" کی صورت میں واضح ہے۔

مرد کے جسم میں نسائیت کا نفوذ کبھی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں ظاہری مرد کے علاوہ کوئی اور مردانہ صفت نہیں رہتا۔ یعنی وہ صرف مردم شماری کا مرد رہ جاتا ہے۔ ایسے زنانہ مرد اکثر دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا مٹی کی ہنڈیا میں فیس کریم لکھی ہو۔

یہ اختلاط جنسی صرف ذہنی اور جذباتی خصوصیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ جسمانی اعضا تک پہنچ جاتا ہے۔ کئی ایک نروں میں انڈے دانیاں نکلتی ہیں، اور کئی ایک مادوں میں خضبے۔

عورت میں مردانہ پن عام سہی، لیکن عام طور پر اس قدر تیز نہیں ہوتا کہ اسے نسائی کردار یا تقاضے سے بے نیاز یا بیگانہ کر دے۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ تسلسلِ حیات زیادہ تر عودت کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کائنات کا مقصد بنیادی طور پر

تسلسلِ حیات ہی ہے۔ اس لیے عورت کا جسم براہِ راست علمِ الحیات کے اصولوں یا قانون پر چلتا ہے، جس کے احکام نفسِ غیر شاعر کے ذریعے عورت تک پہنچتے ہیں، جن پر عمل کرنے پر وہ ازلی طور پر مجبور ہے۔ اسی وجہ سے عورت کی انفرادیت اس کے عورت پن پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی انفرادیت کے صرف وہ پہلو نشوونما پا سکتے ہیں جو اس کے فرضِ اعلیٰ یعنی تسلسلِ حیات میں رخنہ نہ ڈالیں بلکہ ممد اور معاون ثابت ہوں۔

یعنی مرد کی نسبت عورت پر جنسیت زیادہ غالب ہے، اور جب اس کا عمر نسائیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے تو وہ بذاتِ خود مغلوب ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کے تقار خانے میں طوطی بن کر رہ جاتا ہے۔ کتنی بار باہیں جھٹکنے کے لیے اٹھتی ہیں اور لپٹ جاتی ہیں۔ نفرت سے کھولتا ہوا جسم اپنا آپ حوالے کر دیتا ہے۔ چہرے کی زردی بھپانے کے لیے گال شرم سے متماٹھتے ہیں۔ تھکی ہاری ٹانگیں ٹھکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

آج جب کہ عورت علمی و ادبی سے لے کر سیاسی میدان تک نہ صرف مردوں کا مقابلہ کر چکی ہے بلکہ کئی ایک شاہراہوں پر مرد سے کہیں آگے نکل گئی ہے، مرد اور عورت میں ایسے امتیازات پیدا کرنا شاید جہالت سمجھا جائے۔ اس لیے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تفریق سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عورت ان خصوصیات کی اہل نہیں جو آج تک مرد سے منسوب ہوتی رہیں۔ بلکہ اس کے برعکس چونکہ وہ تسلسلِ حیات کی ذمہ دار ہے، جس کے لیے اسے مرد کو تسخیر کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

تسخیرِ مرد کے عمل میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ قلعوں کی سی تسخیر نہیں کرنا ہوتی گھوڑے لیے آئے اور محاصرہ کر لیا۔ یا تسخیرِ غرناطہ کی طرح واپس جانے کی کشتیاں جلا دیں۔ بلکہ یہ عمل ”تسخیر ٹرائے“ سے ملتا جلتا ہے جس میں تو لپوں اور ہتھیاروں کی بجائے ایک خوبصورت لکڑی کے گھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے محصورین دیوتا سمجھ کر آپ

شہر میں گھسیٹ کر لے جائیں۔

قدرت نے عورت کو صرف تسخیر کرنے پر مامور نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی طریقہ تسخیر بھی متعین کر دیا ہے۔ قدرت نے عورت پر زیر دستی یعنی پیسیوٹی کا یاد کر دی ہے ورنہ اگر وہ زبردست جنس بنادی جاتی تو شاید تسلسل حیات کے سوا یہاں اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔ فطری طور پر عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ اور پیار دہی کر سکتا ہے جو عہد کا اہل ہو۔ کیونکہ محبت کرنا فاعلی جذبہ ہے اور ایسا فعل لازم ہے جو کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ کسی محبوب کا ہونا لازم ہے۔ یعنی مرد عورت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ یعنی وہ ایسا محبوب "نہیں بنا سکتی جو جاندار یا فاعلی نہ ہو۔ مرد کے لیے محبوب کا صرف ہونا وصال کے مترادف ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے نہیں، جب تک کہ محبوب کا عہد اور آرزو اس کی طرف مائل نہ ہوں اور محبوب کو محبت کرنے پر مشغول نہ کریں۔

مرد صرف یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنا آپ اس کے حوالے کر دے۔ وہ اس کی نفیست پر چھانا نہیں چاہتا۔ لیکن عورت کے لیے فقط مرد کا ہونا کافی نہیں، جب تک مرد کا عہد اور آرزو اس کے لیے وقف نہ ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے مرد کا جسم مقصود نہیں بلکہ اس کا عہد اور آرزو ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی نفیست پر چھانا چاہتی ہے۔

جب مرد کے دن موجودہ زمانے کے خود ساختہ اقتصادی بھیدوں میں گٹ جائیں، شام تفریح گاہوں کی بھینٹ ہو جائے، اور کل کا کام سرانجام دینے کے لیے رات کو گری نیند سونا لازم ہو جائے تو عورت بے چاری جو لہما چھوڑ کر کٹ گروئنڈ، کافرنس، لیبارٹری، فیکٹری اور طبیارہ گاہ میں نہ آئے تو تسخیر مرد کا کام کیسے سرانجام ہو۔ چنانچہ اس فطری فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ اپنا میدانِ عمل وسیع کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ ہر محبوب کا

یہ فرض ہے کہ عاشق کی آرزو کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ چاہے اس کا نظام آرزو بدل دے تاکہ وہ اُسے پیار کرنے لگے یا اپنے آپ کو اس نظام آرزو کے مطابق بنالے تاکہ اس کے لیے جاذبِ توجہ ہو جائے۔

پنجاب میں بھی مرد کے بڑھتے ہوئے انہماک کے خلاف عورت کی صداۓ احتجاج خنیں لباس کی شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ حالانکہ عورت اس امر سے قطعی ناواقف ہے کہ سُرخ کپڑے کو دیکھ کر سائنڈ کیوں جوش میں آجاتے ہیں۔ بیاہ شادی پر سُرخ جوڑے کیوں پہنے جاتے ہیں، اور مندی لگانے کا کیوں رواج ہے۔ نہ جانے نفسِ غیر شاعر جھک کر کان میں کیا کہہ دیتا ہے کہ وہ بن سبھے جانتی ہے اور بن جانے سمجھتی ہے۔

عورت کی قوتِ تسخیر کا یہ عالم ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چند ایک اَن جاتی حرکات کی مدد سے مرد کو دُنیاۓ عقل و شعور سے گھسیٹ کر دُنیاۓ جذبات میں لاپھٹکتی ہے۔ سچی کہ اس کی آنکھیں انگارہ ہو جاتی ہیں، اور جسم بھکا رہی۔

فطری طور پر مرد اس کھلنڈرے لڑکے کی طرح ہے جو مدرسے سے بھاگ کر باہر آدراہ پھرنا پسند کرتا ہے۔ عورت مرد کو واپس گھر لاسکتی ہے، لیکن گھر کا نہیں کر سکتی۔ اگر مرد بسا اوقات یا عام طور پر باہر آدراہ پھرے تو عورت کو بھی کرکٹ گراؤنڈ، فیکٹری یا پیارہ گاہ میں جانا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ عورت کی کرکٹ اور پیارے میں دلچسپی بالواسطہ نہیں بلکہ ایک حقیقی اور مثبت شوق ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ عورت کی فطری خصوصیات میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس کی انفرادیت مرد کی جنسیت پر حاوی ہوئی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ عورت کی یہ تبدیلی کس حد تک تسلسلِ حیات سے انحراف کے مترادف ہے۔ شاید وہ مستقبل کے مرد کے ماحول اور جذبات کے مطابق پھیل رہی ہو، تاکہ آئندہ تسخیرِ مرد ناممکن نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرد گھر توڑنے کی نکر میں ہو، حیا کو نااہلیت سمجھے اور ذہنی چمک کو نسائی آب پر ترجیح دینے لگے تو عورت ہرجائیت

خود نمائی اور ذہانت کو نہ اپنائے تو کیا کرے۔

تو اثرات کے موجودہ نظریے کے مطابق مرد کی ترتیب مخلوط سمجھی جاتی ہے، اور عورت کی مفرد۔ مثلاً اگر مرد ع ع کے لیے لازم ہوگا کہ وہ خصوصیت دونوں ع پر موجود ہو، ورنہ صرف ایک ع پر موجود ہونے کی صورت میں وہ خصوصیت اس پر عادی نہ ہوگی بلکہ مخفی ہوگی۔ وہ بذاتِ خود اس خصوصیت سے متاثر نہ ہوگی بلکہ اسے اپنی نرمیہ اولاد میں بانٹ سکے گی۔ جیسے چھتر بذاتِ خود پیر یا کامریض نہیں ہوتا لیکن اس مرض کو پھیلاتا ہے۔ اس کے برعکس مرد میں تواریثی رجحان مقابلہ ہو رہا ہو جاتا ہے تو ظاہر ہوا کہ عورت میں مرد کا نفوذ چاہے کسی حاکم ہو وہ مقابلہ عورت کے فرائض جنسی سے گریز نہیں کر سکتا۔ عورت میں نسائیت کا عنصر دوسرے عناصر سے غالب تر ہے، اور مرد کی تسخیر اس کا سب سے بڑا ادائی اور غیر شعوری جذبہ ہے۔ باقی اوصاف مثلاً حیا، زیردستی، نزاکت وغیرہ جو اسے تسخیر میں مدد دیتے ہیں، بالواسطہ ہیں، جو حالات اور ضرورت کے مطابق بدل دیے جاسکتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ ضمنی خصوصیات فیشن کے مطابق ادنیٰ بدلتی رہی ہیں۔

کہتے ہیں، پُرانے زمانے میں، جب بے حجابی کا دور دورہ تھا، مرد عورت کی بے باکی سے اکتا گیا۔ اس کے جنسی جذبات آزاد جنسی ماحول اور روزمرہ اشتعال کی وجہ سے اس قدر ٹھنڈے پڑ گئے کہ کسی بے حیا عورت نے ضرورتِ وقتی کے ماتحت اسے از سر نو اکتانے کے لیے حیا ایجاد کر لی، جس طرح برہنگی کے زمانے میں کسی چالاک اور بے حیائے کپڑے ایجاد کیے تھے۔ تو ظاہر ہوا کہ کوئی خصوصیت چاہے ہم اسے نسائیت کا جزو لاینفک ہی سمجھتے ہوں، بذاتِ خود نسائیت سے اہم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نسائیت کے اہم ترین مقصد تسخیرِ مرد کے تحت رہتی ہے۔ اگر آج عورت زیردستی چھوڑ کر غالبیت اختیار کر لے تو بھی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ شاید ضرورتِ وقت ایسی ہو۔ بہر حال، دیکھنے میں آتا ہے کہ

آج کل مرد میں زیر دستی بڑھ رہی ہے اور مقابلہ "عورتیں بے باک ہو رہی ہیں۔ عورت کی اپنی ترین تبدیلی 'چاہے وہ لباس سے تعلق رکھے یا انداز سے، مرد کی کسی چھٹی ہوئی یا نمایاں آرزو کا پرتو ہوتی ہے۔ اس کے برتاؤ کی کمترین تفصیل بھی اس کے دل کی عین ترین گہرائیوں میں وضع ہوتی ہے۔ اسی بات پر نہ جانے کس نے بحث کا اختتام کرتے ہوئے کہا تھا :

"بیکم صاحبہ! آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ عورت لطیف اور رنگین تر مخلوق ہے اور مرد بھٹی مخلوق۔ لیکن مرد کے نظام آرزو پر عورت حاوی ہے اور عورت کی خواہشات پر مرد حاوی ہے۔ یعنی مرد کی خواہشات ان تمام تر لطافتوں اور رنگینوں سے معور ہیں جو عورت سے وابستہ ہیں، اور عورت کی آرزوؤں پر مردانہ بھڑاپن چھایا ہوا ہے۔"

"حیات" کے پیام یا احکامات لا شعور کے ذریعے نشر ہوتے ہیں، جو عزم اور عمدہ کا مرکز اور منبع ہے اور جس میں ایسی گہری حیاتی قوتیں موجود ہیں جو ماحول اور وقت سے قطعی بے نیاز ہیں۔ چونکہ "حیات" کو براہ راست عورت سے زیادہ گہرا تعلق ہے، اس لیے عورت کی زندگی زیادہ تر نفس لا شعور کی مدہم تال پر چلتی ہے۔ انسانی عقل صرف وہی بات سمجھ سکتی ہے جس میں کوئی نظام دکھائی دے، اور جو ماحول سے تعلق رکھے۔ شاید اسی لیے عورت کا برتاؤ آج تک ناقابل فہم سمجھا گیا اور اسے ابوالہول سے تشبیہ دی گئی، جس کا جسم انسانی اور حیوانی اعضاء سے مخلوط ہے۔

عورت کی نفسیت اس شخص کی سی ہے جو دو رُخے مزاج کے عارضے کا شکار ہو، کیونکہ اس کی نفسیت پر کبھی انفرادیت حاوی ہوتی ہے اور کبھی نسائیت۔ لیکن عورت کو اپنے دو رُخے پن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نسائیت کا رُخ لا شعوری اثر رکھتا ہے اور انفرادیت کا شعوری۔ نسائیت کے رُخ کو لا شعوری رکھنے کا مقصد اسے تلخی، انفعال اور پشیمانی سے محفوظ کمدیتا ہے کیونکہ قدرت کہیں کہیں قوت اور وقت کے بجا تصرف سے احتراز کرتی ہے۔ اس کے علاوہ شعوری حرکات میں وہ رس نہیں ہوتا۔ اگر اسے احساس ہو کہ وہ تسخیر کر رہی

ہے، ہر سکراہٹ پر جان لے کر ہونٹوں کی مدد سے مبہم وعدے کر رہی ہے یا ویسے ہی بنی نوع انسان کو جینے کی ترغیب دے رہی ہے اور جینے کے سیدھے سادے عمل میں رنگ بھر رہی ہے تو یاد وہ اس فطری پابندی کی قید کے خلاف بناوٹ کر دے اور یا مردِ جہ اخلاق کے زیر اثر اس قدر پشیمان ہو کہ احساسِ گناہ سے دب کر رہ جائے، یا شاید ان وضعی پابندیوں کو چھوڑ کر اپنے فطری فرض کو علانیہ اپنلے۔ ہر صورت میں توازن قائم نہ رہ سکے گا جو بڑی حد تک مرد و عورت کے مقدس ملاپ کو قابلِ آرزو بنانے کا ذمہ دار ہے۔

پریم ساتھی ہونے کے باوجود مرد اور عورت دو اجنبی ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے پیغام اور دعوتِ حیات بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے بلکہ چاند کی طرح صرف ایک پہلو پیش کرتے ہیں۔

عورت کا اہم ترین مقصد تسخیر ہے، اور وہ اس مقصد کو پیش پیش رکھتی ہے تو مرد کا صرف وہ پہلو دیکھتی ہے جو تسخیر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد سے بے نیاز اور بے واسطہ ہو کر نہ تو دنیا کو دیکھ سکتی ہے نہ اپنے آپ کو۔ ہاں، اپنے بچے کو دیکھ کر اسے بے لاگ خوشی ہوتی ہے، جیسے کوئی نہایت ہی منزلی مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

خوشی حاصل کرنے کے لیے تلخ حقائق سے منھ موڑ لینا تو مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے لیکن مرد حقائق سے زیادہ دیرینک جی نہیں چڑا سکتا بلکہ جلد ہی ناخوشگوار حقائق کے خلاف جہد و جد کرنا شروع کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ لیکن عورت عمر بھر اپنی خیالی دنیا میں بسر کر سکتی ہے، کیونکہ اس کا تصور اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ ہر متصورہ بات اس کے احساسات پر واضح اثر پھیڑ جاتی ہے، جیسے کہ حقیقی مشاہدہ۔ بلکہ اگر وہ حقائق سے بے نیاز رہنے کا فیصلہ کر لے تو کوئی حقیقت چاہے وہ رُوبرو ہی کیوں نہ ہو، اس کے احساسات پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

لڑکے کو مرد بننے تک گرگٹ کی طرح کئی ایک رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ لیکن لڑکی پیدا ہوتے ہی مکمل عورت ہوتی ہے۔ اگرچہ بلوغت اس کے نسائی انداز میں رنگ بھر دیتی ہے اور ان غیر شعوری رجحانات کو جو پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں، نمایاں کر دیتی ہے۔

ابتداء میں لڑکے میں نسائی جھلک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس عورت بڑھاپے میں مردانہ خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسائیت ایک ایسا عنصر ہے جو پھول کی خوشبو کی طرح اُڑتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک عمر میں عورت صرف دیکھنے کی عورت رہ جاتی ہے۔ اس وقت اس میں نسائیت مدہم بڑھ جاتی ہے اور ساتھ ساتھ انفرادیت اُبھرتی آتی ہے۔ بڑھاپے میں عورتوں کے ڈاڑھی مرچھٹے تک نکل آتی ہیں۔ مزاج میں مردانہ درشتی، شدید انانیت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حاکم عورتیں بڑھاپے میں مردانہ وار حکومت کرتی رہیں۔ شاید ملکہ الزبتھ اور میری سکاٹ اسی لیے دو مختلف قصے ہیں کیونکہ الزبتھ میں انفرادیت تھی اور میری نسائیت کے رنگ میں بھیگی ہوئی تھی۔

کسی چھوٹی بچی کو "تا" کا کھیل کھیلے ہوئے دیکھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کھیل نہیں سمجھتی۔ کیونکہ زندگی میں "تا" اس کے لیے سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ حقیقت میں زندگی اس کے لیے ایک مسلسل "تا" ہے۔ صرف اس کی زبان ہی "تا" نہیں کہتی بلکہ تمام جسم اس دلچسپ عمل میں زبان کا ساتھ دیتا ہے۔ لڑکا اس کھیل میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کی چالاک مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ مذاق کر رہا ہے۔ لڑکے کو ایسے کھیل پسند ہیں جس میں کسی کو ستلنے، دق کرنے اور پیٹنے کا موقع ملے۔

اگر "تا" کے کھیل میں لڑکی کا ساتھ نہ دیا جائے تو وہ سچ بچ دھٹ جائے گی۔ اس کی "تا" والی نگاہ میں بچوں کا کھیل نہیں بلکہ دیدہ بیتا کی جھلک نظر آتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ میں قدر "حیا" کا اظہار اٹھ نو سال کی بچی میں پایا جاتا ہے، بالغ لڑکی میں نہیں ہوتا۔ شاید

اس عمر میں قدرت انھیں مشق کرنا سکھاتی ہو یا بلوغت میں خواہ مخواہ شرما جانا عریاں اپیل کا احساس دیتا ہو۔

آٹھویں یا نویں سال میں بچیاں اس بات پر مضمحل ہوتی ہیں کہ انھیں مکمل عورت مان لیا جائے۔ وہ بڑی لڑکیوں کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتی ہیں، اور ان کی سی باتیں اور انداز پیدا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے انھیں بالغ لڑکیوں کی برتری کا احساس ہے۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ وہ بالغ ہیں۔ ان سے محبت کی جاسکتی ہے۔ اس لیے وہ بے تحاشا بھیپنتی ہیں۔ اپیل کی مشق کرنے کے لیے عام طور پر وہ کسی بڑے مرد کو منتخب ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی عمر کے لڑکے اس بارے میں بے حس ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہو ”اب تو میں جوان ہوں“ یا ”میں سب جانتی ہوں“ حتیٰ کہ دیکھنے والا بزرگ پریشان ہو جاتا ہے اور پھر جان چھڑانے کے لیے ہنس کر کہتا ہے ”یہ بچے! — بے چارے معصوم“

چونکہ عورت کا برتاؤ زیادہ تر مرد کے لیے وضع ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ مرد یا محبوب کی پسند کے مطابق ہو۔ چونکہ ہر جگہ کے مرد ایک سے نہیں ہوتے، اس لیے ہر جگہ علیحدہ انداز اپیل پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً یورپ میں، جہاں آج کل ذہانت کا دور ہے، عورتیں اپنے انداز اور جذبات میں ذہانت کی جھلک پیدا کرنا جان چکی ہیں اور ذہانت کی گہرائیوں میں جانے بغیر ایک خوبصورت ذہین انداز پیدا کرنے میں کمال حاصل کر چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بیوا بھی اپنے اجنبی ملاقاتی کو ہمدردی کا احساس دے کر اس کو مختصر ملاپ میں ذہنی رفاقت کا طلسم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس، شاید اس لیے کہ پاکستانی مرد عام طور پر عاشق کا پارٹ ادا کرنے سے خوش ہوتا ہے، پاکستان کی عورت بے نیازی اور لاپرواہی کی اپیل پیدا کرتی ہے۔ لیکن حالات بدل رہے ہیں۔ پہلے وفا اور عزت کی اپیل پیدا کرنا لازم تھا، جس پر بے نیازی کا سماں کا خوب رہتا تھا، لیکن اب مغربی نقطہ نظر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ

ابھی مغربی اپیل کی خوبیاں پورے طور پر دیکھنے میں نہیں آتیں چونکہ عورت اور مرد کو دل بیٹھنے کی اجازت نہیں، اس لیے یہاں کی لڑکی اپیل کے ان طور طریقوں سے محروم ہے جو دہریہ بیٹھ کر عمل میں لائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی یا موٹر میں بیٹھ کر وہ ہچکولوں کے پردے میں بار بار ایک دوسرے سے ٹکرائے یا لمس کا احساس دینے کی اپیل پیدا نہیں کر سکتیں، اور سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کی اپیل سے قطعی محروم ہیں۔ اس لیے ان کی اپیل زیادہ تر چھپ جانے، گھونگھٹ نکال لینے، شراب جلنے اور جھینپ جلنے تک محدود رہی۔ ظاہر ہے کہ جن قیود میں انہیں تحفظ کے لیے ڈال گیا، انہوں نے ان ہی قیود اور رسومات کو اپیل کا ذریعہ بنالیا تاکہ وضع داری کی وضع داری رہے اور اپیل کی اپیل۔ اس کے علاوہ آہستہ آہستہ کئی اور انداز اپیل پیدا ہوتے گئے۔ چنانچہ لڑکیوں نے اس سلسلے میں چھوٹے بچے کے وجود کو بہت مفید مطلب پایا۔ کیونکہ وہ دہریہ ہو کر بچے کو کھلانے کے بہانے اسے چھاتی سے لگا سکتی تھیں اور اس کا منہ جو مسمکتی تھیں۔

عورت کا برتاؤ، حرکات، انداز، فیشن، لباس اور شاید اخلاق بھی اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی گاؤں ٹخنوں تک ٹلک جاتے ہیں اور کبھی گھٹنوں تک ٹکڑ کر پڑ لیاں عریاں کر دیتے ہیں۔ آستینیں ناخونوں تک ڈھلک آتی یا مونڈھے اور گلا ایک ہو جاتا ہے۔ برقع الاسک کی طرح سکڑ کر خم و بیج واضح کرنا شروع کر دیتا یا سیاہ ہو کر گورا رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مغرب میں ہیٹ بھرنے والا کھانا گھر کھایا جاتا ہے اور حسین حرکات والا محفل میں۔ شاید مشرقی عورت کا مذہب اور خدا بھی پاکیزگی کی اپیل کا ایک ذریعہ ہو مغرب میں تو عورتوں کے خیالات سوشلزم اور ذہنی چمک محض اپیل کا انداز ہیں۔

یونانی تہذیب کے زمانے میں عورت کا بھرا ہوا جسم خوبصورت سمجھا جاتا تھا تو عورتیں مثیلا رہتی گئیں۔ آج کل پتلے جسم کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں دُپٹا ہوتا ہوا سمجھ رہی ہیں۔ یورپ کے مردوں نے بیروں کی خوبصورتی کی طرف توجہ دی تو یک دم پاؤں کی

حفاظت کرنا فیشن میں آگیا۔ اُدوچی ایڑی سے پاؤں کا خم نمایاں دکھاجانے لگا لیکن اس سے یہ قباحت نکلی کہ پنڈلیاں موٹی ہو گئیں۔ اب نہ جانے انھیں سڈول کرنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

پاکستان میں آج کل عورت کے لیے مساوی حقوق کا علم بلند ہو رہا ہے۔ جہاں تک شرعی اور سیاسی حقوق کا تعلق ہے، شاید مساوات ممکن ہو، لیکن مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں مساوات ممکن نہیں۔ عورت کا محبوب صرف وہ ہو سکتا ہے جو ذاتی عمدہ کا اہل ہو۔ عورت کی خواہش مرد کے عمدہ کو تسخیر کرنا ہے، جسم کو نہیں۔ اور اسے بذاتِ خود حصول سے اس قدر دلچسپی نہیں جس قدر کہ عملِ حصول سے۔ اگر مرد محبت میں اپنی انفرادیت اور عمدہ کھودے تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے اسے تسخیر کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ایسے محبوب میں چنداں دلچسپی نہ لے گی۔ چنانچہ مرد کے لیے عورت سے اس قدر محبت کرنا جس میں اپنا آپ کھوجائے، خود کشی کے مترادف ہے۔ عورت سے محبت کرنے میں صرف وہی فرد کامیاب رہتا ہے جو تسخیر ہونے پر آمادہ دکھائی دے، لیکن مکمل طور پر مسخر نہ ہو۔ یا کم از کم ایسا اثر پیدا کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ اس کا ایک نہ ایک حصہ ابھی قابلِ تسخیر ہے۔ ان حالات میں عورت صرف اسی کا ہونا گوارا کرے گی جسے وہ اپنے آپ سے بلند تر سمجھے گی۔

بہر حال، ایسی صورت میں عورت اور مرد میں صرف دو ممکن تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔ یا تو مرد غالب ہو گا یا مغلوب۔ لیکن یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عورت کو مغلوب کر لینے کے بعد بھی مرد اس سے محبت کر سکتا ہے (بلکہ شاید وہ مغلوب سے زیادہ محبت کرتا ہے) لیکن مغلوب ہونے کے بعد عورت اسے بُرائے کھلونے کی طرح پھینک دے گی اور پھر اس میں قطعی طور پر دلچسپی نہ لے سکے گی۔ شاید اسی وجہ سے عورت اور محبت میں ایک تباہ کن کش مکش پیدا ہو چکی ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ عورت سانے کی طرح ہے۔ تم اس کا پیچھا کر دو تو وہ دُور بھاگے گی، اور تم دُور بھاگو تو پیچھے پیچھے آئے گی۔ اس مندی وجہ سے

جو جو پیچیدگیاں اور دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہر حال، اس کی محنت میں اپنا آپ کھود دینا اپنی شخصیت کے پروں کو جلا دینے کے مترادف ہے۔ ایسا فرد تہہ کے سوا اس سے کچھ اور حاصل نہیں کر سکتا۔

مرد کی ذہنیت ایک سیدھے سادے دہقان کی سی ہے، جسے آپ چودھری کہہ کر جرجی چاہے کر دالیں۔ اپنی خدمت میں لگا رکھیں تو بھی مضائقہ نہیں۔ مرد کو کوئی چودھری کہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے چودھری تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسے یہ نہیں سمجھتی کہ آیا اس سے چودھری کا سا سلوک بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ عورت نے صدیوں مرد کے ساتھ رہ کر اس کی نفسیت کو پالیا ہے اور وہ چودھری صاحب کو چودھری کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتی۔ فطرتاً سے دیکھا جائے تو مساوی حقوق دو مختلف جنسوں کے لیے بذاتِ خود سب سے بڑی بے انصافی ہوگی۔ اول تو مساوات میں توازن ممکن ہی نہیں۔ اگر ممکن بھی ہو تو مساوات توازن پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ توازن صرف ”جس کا کام اسی کو سباجے“ کے اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔

عورت کے جسم میں جنسی خواہشات صرف جنسی اعضا میں مرکوز نہیں، جیسے کہ مرد کے جسم میں۔ یعنی مرد کی جنسی زندگی روزمرہ زندگی سے مختلف چیز ہے۔ اگر مرد کی عام زندگی کو ایک اندھیری سڑک تسلیم کر لیا جائے تو اس کی جنسی آرزو وہ تڑم بتیاں ہوں گی جو یہاں وہاں دور دور چمکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن عورت کی جنسی اور روزمرہ زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ عورت میں جنسی پہلو یوں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ جیسے صبح صادق کا اُجالا یا کسی جدید سینما ہال میں روشنی، جہاں بتیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اسی وجہ سے عورت کی زندگی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اس کا بیاہ ہو جائے۔

نہ جانے یہ خیال کیسے عام ہو گیا کہ عورت کے لیے مرد کا اظہارِ محبت چند مخصوص جسمانی حرکات تک محدود ہے۔ اگر یہی بات مرد کے لیے کہی جائے تو زیادہ موزوں ہوگی۔

اس کے برعکس عورت اس بات کی خواہاں ہے کہ اسے ایسے محبت بھرے ماحول میں رہنے کی خوشی حاصل ہو جس کا تسلسل دوامی ہو۔ اگر چناؤ ممکن ہو تو وہ کسی کی محبوبہ بننے کو تیار نہ ہوگی، بلکہ ایسا جیون ساتھی تلاش کرے گی جو مردانہ خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ مردانہ سیرت کو مردانہ جسم پر ترجیح دی جاتی ہے، اور محبت کی مدہم کو کہ طوفانی جذبے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر عورت کو اپنے چناؤ یا پسند کا ساتھی نہ ملے تو یہ تو وہ خیال کے زور سے اسے دلیسا ہی دیکھنا شروع کر دیتی ہے یا اپنے خیالی محبوب میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ حقیقی ساتھی کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔

مرد فاعلی فرد ہے، یعنی اس کی زندگی "کرنا" کے مترادف ہے۔ اس کی خوشی اسی بات میں ہے کہ وہ کچھ کرتا رہے۔ جدوجہد کرے یا روٹی کمائے یا قوم اور ملک کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اب غم اور خوشی کو لیجیے۔ غم اور خوشی دو کیفیتیں ہیں، جنہیں فعل سے تعلق نہیں۔ اس لیے عورت خوشی اور غم کو حقیقی طور پر جانتی ہے اور مرد مقابلہ ان سے بیگانہ ہے۔ مرد کے لیے زندگی انفرادی یا ہمابی کے مترادف ہے۔ درحقیقت مرد کو کچھ کرنے یا سرانجام دینے کے فعل سے دل چسپی ہے۔ تو جب تک کش مکش میں لگا رہے گا اسے احساس رہے گا کہ وہ خوش ہے۔ لیکن عورت میں خوشی کا احساس بالواسطہ نہیں بلکہ مثبت جذبہ ہے۔ وہ خوشی سے یوں لطف اندوز ہونا چاہتی ہے جیسے بکری جگالی کرنے سے۔ اس کے برعکس مرد کو خوش ہونے کا احساس ہوا تو معاً بیٹھ رہنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھ بیٹھا "چلو پک نمک پر چلیں، کبڑی کھیلیں، سینما دیکھیں۔" نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کسی اور کام میں کھو گئے۔ خوشی کے احساس کی جگہ فعل نے لے لی۔

اب غصے کو لیجیے۔ غصہ ایک فعلی جذبہ ہے جس میں جی چاہتا ہے کہ کچھ توڑ پھوڑ دیں۔ کوٹھے سے کوہ پڑیں یا چینی کی مشتری اٹھا کر دیوار سے دے ماریں۔ یہ خالص مردانہ جذبہ

ہوا جس سے عورت بیگانہ ہے۔ ہاں، انتقام ایک مسلسل کیفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت عورت میں زیادہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر بخش دیتی ہے۔

جنسی تعلقات میں مرد کی خوشی صرف دلوں تک محدود ہے، جسے تلذذ دیتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ توجہ کی کیفیت ہے۔ لیکن عورت کے دل میں خوشی کا مدد جزر و مرجع کی طرح مدہم اور دعوامی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مرد کو جنسی تعلقات میں اس لیے خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عورت پر غالب ہے یا اس کی خوشی کا باعث ہو رہا ہے، اور بس۔

جہاں تک جینے کا جذبات سے تعلق ہے، عورت جیتی ہے اور زندگی کی ہر خوشی اور دکھ کو ایک مادی چیز کی طرح محسوس کرتی ہے۔ جہاں تک جینے کا کرنے سے تعلق ہے، مرد جیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کیفیتِ لطف میں دوام ہے۔ شاید بھی ہمارا بڑھنے نے نردان کی عظمت اور خوشی کو محسوس کیا۔ نہ جانے ہمارا جی میں کس حد تک عورت جی رہی تھی۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو استوائی مرد اہل مغرب کے مقابلے میں زیادہ کیفیتیں ہیں، اور اہل مغرب مقابلہ زیادہ فعلی۔ استوائی علاقوں میں اس تنگ و دو کو تصور میں بھی نہیں لایا جاسکتا جو یورپ میں ہر سہ پیش پیش رہتی ہے۔ کیونکہ ان علاقوں میں نباتاتی افراط کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے قدرت آپ ہی آکر آگوند کر روٹی پکا کر چنگیر میں رکھ جائے گی۔ شاید اسی لیے تقدیر کا مسئلہ استوائی علاقوں پر حاوی ہے لیکن اہل مغرب تقدیر پر شا کر رہ کر بھوکوں مرنے سے گھبراتے ہیں۔ نردان کا مسئلہ صرف استوائی علاقوں میں ظاہر ہو سکتا تھا، ٹھنڈے ممالک میں نہیں۔

بہر حال، مرد فعلی انسان ہے اور اس کی زندگی ایک جذبے کے ماتحت نہیں گزر سکتی۔ اس کے نزدیک جذبہ کیفیت نہیں، بلکہ ایک ایسی عملی تحریک ہے جو اسے اٹھا کر بٹھا دے اور کچھ نہ کچھ کرنے پر مائل کر دے۔ اسی لیے مرد تغیر پسند ہے، ہرجائی ہے اور متلون مزاج

ہے۔ اس کے لیے زندگی جُلنا ہے یا جلنا، بھُٹنا اور پھر جل جانا۔ تاکہ پھر کچھ کر پھر جلنے کا امکان رہے۔ لیکن عورت ایک جذبے کے تحت جی سکتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے جی سکتی ہے، اور جینے کی کیفیت پر حاوی ہے۔ اس کے نزدیک خوشی اور غم سردی اور گرمی کی سی مہلت اور مخصوص کیفیتیں ہیں، جنہیں وہ لیوں محسوس کر سکتی ہے جیسے تلی پر ہاتھ پھیر کر نرمی محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ سلگنا جانتی ہے، جلنا نہیں۔ البتہ وہ جل جانے کو بھنے پر ترجیح دے گی۔

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

لوگ گائیک طفیل نیازی

غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ طفیل نیازی کو سنا۔
میں ایک قلم مزدور ہوں۔ مجھے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ کچھ لائڈی روٹی کے لیے۔
کچھ ذہنی عیاشی کے لیے۔ ان دنوں میری عادت تھی کہ ریکارڈ پر کوئی ٹیپ لگالیتا اور پھر
لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ موسیقی کے نوڈ پر لکھتا رہتا۔ اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجے گا کہ میں
موسیقی سننا جانتا ہوں۔ اُنہوں! یہ بات نہیں۔ میں موسیقی سے قطعی طور پر ناخجانب ہوں۔ البتہ
موسیقی سے شدت سے متاثر ہوتا ہوں۔

ایک روز میرے بیٹے عکسی نے مجھے ایک ٹیپ دیا۔ کہنے لگا ”ابو! یہ ٹیپ سنو“
ٹیپ لگا کر میں لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے دفعتاً میں چونکا۔ ارے! مجھے ایسے لگا جیسے کوئی
جشی دُکھ اور مظلومیت پر کراہ رہا ہو۔ پکار رہا ہو۔

اُن دنوں طفیل نیازی کی آواز میں اُڑان تھی، پکار تھی، دُکھ تھا، کرب تھا۔
گیت کے بول بھی عجیب سے تھے :

بول مٹی دیا بادیا دے تیرے دُکھاں نے مار دُکایا
دے میرا سا نول ماہی آجا ہو ادا۔ آجا ہو ادا۔

دیسے تو میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی بول سے بے نیاز ہے۔ ہاں، شوقین مزاج لوگوں
نے اپنا دل خوش کرنے کے لیے زبردستی بولوں کو اہمیت دے رکھی ہے۔ آج کل وہ
غزلیں سننے ہیں اور بولوں پر سر دھنتے ہیں۔ اور گائیک اس بات پر بُرا نہیں مانتا۔ غزل

گانے والوں کو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ بول، دھن اور آواز میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ بول اور دھن میں بے ربطی عام ہو چکی ہے۔ بول روتا ہے، دھن چٹکیاں بجاتی ہے۔ یا دھن آہیں بھرتی ہے اور بول ناچ ناچتا ہے۔

غزل کی گانگی میں بھلا ربط کیسے پیدا ہو جب کہ غزل کے ہر شعر کا موڈ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہو۔

اس روز طفیل کی دھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔ اس لیے بول میں جان پڑ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ :

بول، اے مٹی کے بنے ہوئے پستلے۔ یہ تُو نے کیا کیا کہ اپنی زندگی کے معاملات کو اپنے ہاتھوں اُلجھا کر خود کو دکھی بنا لیا؟ تیرا دکھ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ بول ہمارے پیارے ماہی، بول۔ یہ تُو نے کیا کیا؟ ہٹا، چھوڑ ان اُلجھنوں کو۔ ہمارے دوار پر پا کھڑا ہو۔ اس ہم آہنگی نے میرے روبرو ایک عظیم سچائی کو لا کھڑا کیا۔

پھر یہ بھی تھا کہ ان دنوں مجھے نیا نیا عشق لگا تھا۔ ایک اُن جانا، اُن کا عشق۔ سامنے نہ محبوب تھا، نہ وصال تھا، نہ فراق تھا۔ خالی لگن ہی لگن تھی۔

زندگی بھر میں نے کئی ایک محبوباؤں سے عشق کیا تھا۔ زندگی بھر خواہش کی انگلی چھی سکا کر بیٹھا اسے پنکھا کرتا رہا تھا۔ زندگی بھر میں بڑی محنت سے جگہ جگہ عشق لگاتا رہا۔ لیکن یہ عشق قطعی طور پر مختلف تھا۔ یہ عشق میں نے نہیں لگایا تھا۔ لگ گیا تھا۔ پتا نہیں، کیوں کیسے۔ اس روز طفیل نیازی کے گیت نے ایک کیفیت پیدا کر دی۔ ایک سرشاری۔ یوں جیسے مٹی کا بادا کسی دوار پر جا کھڑا ہوا ہو۔

صرف ایک گیت کی بات نہیں۔ اس ٹیپ میں طفیل کے بیشتر گیتوں کا رنگ ناثر بھرا تھا۔ بول زخمی پرندے تھے۔ دھن دکھ میں بھیگی ہوئی تھی۔ ایک گیت کیے بول تھے:

درداں ماہ لیا دے، میرا دل ڈردا نہ بولے

ایک کا مکھڑا تھا :

سبناں دھوڑا تیرا جند نہ سہارا دی

سارے ٹیپ ہیں ایسے ہی گیت بھرے ہوئے تھے۔ یہ ٹیپ کسی ادارے نے پر دڑا یوس نہیں کیا تھا۔ ادارے جب بھی کوئی گانا پر دڑا یوس کرتے ہیں تو اسے بنا سجا دیتے ہیں۔ چیز اور بنی سچی چیز میں، بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے باغیچے اور جنگل میں فرق ہوتا ہے۔ عام طور سے بنے سچے گیت محفل کے لیے ہوتے ہیں۔ اکیلے کے لیے نہیں۔ موسیقی اکیلے پر اور اثر رکھتی ہے، محفل پر اور۔ اکیلے میں اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔

نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انسان انڈی طور پر اکیلا ہوتا ہے۔ باہر کا انسان اس اکیلے پن سے خائف ہے اور اس خوف سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے گرد بھیڑ لگائے رکھتا ہے۔ کراؤڈ کا سہارا لیتا ہے۔ کراؤڈ میں حیوان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ طفیل کا وہ ٹیپ خانہ ساز ٹیپ تھا۔ اسے کسی نے بنایا سنوارا نہ تھا۔ اس میں نمائش کا عنصر نہ تھا۔ طفیل کے اندر کا آدمی گارہ تھا۔ میں اکیلے میں سُن رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان میرے سامنے آ بیٹھا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ میرے انوکھے عشق کی حقیقت سے واقف ہو۔ میرے بے نام محبوب کو جانتا ہو، جس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

طفیل کے ان گیتوں نے مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کی۔ پانچ سال مسلسل۔ پانچ سال طفیل کے گیت مجھ میں تخلیق کی تحریک پیدا کرتے رہے۔ طفیل میرا محسن بن گیا۔ چند ایک سال کے بعد طفیل راولپنڈی آ گیا۔ میں بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے گیا۔ مگر دیکھ کر بہت مایوس ہوا۔

میرے رُوبرُہ وہ طفیل نہیں تھا جو مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ ”بول مٹی دیا با دیا“

اس طفیل میں تربط نہ تھی، پکار نہ تھی، تلخی نہ تھی، دکھ نہ تھا۔ وہ ایک عام انسان تھا۔ اس میں مٹھاس تھی، عجز تھا، رواداری تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ طفیل کدھر گیا جو ٹیپ میں کراہتا تھا، پکارتا تھا، بین کرتا تھا۔ شخصیت کے تضادات کو میں مانتا ہوں۔ لیکن شخصیت کی بنیادی وحدانیت کو بھی مانتا ہوں۔

ظاہر تھا کہ طفیل ایک منفرد فنکار ہے۔ اس نے یہ انفرادیت کیسے حاصل کی؟ میرے اندر ایک کھوج لگ گئی کہ اس گائیک کے اندر دکھ کے اظہار کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی۔ یہ فنکار کس دھنکی میں ڈال کر دھنکا گیا کہ رُداں رُداں ہو گیا۔ مجھے طفیل کی زندگی سے دل چسپی پیدا ہو گئی۔

طفیل شام چوراسی سے ایک میل دور مڈیراں گاؤں میں پیدا ہوا۔ شام چوراسی پنجاب کا ایک مشہور و معروف قصبہ ہے جو گائیکی کے ایک بڑے گھرانے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہمارے کئی ایک معروف گوتے شام چوراسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مڈیراں سکھوں کا ایک گاؤں تھا جہاں طفیل کا گھرانہ مسلمانوں کا واحد گھرانہ تھا۔ یہ گھرانہ کھوج کا گھرانہ تھا۔ طفیل کے آباؤ اجداد بڑے بڑے پکھاؤ جیسے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ کا طبقہ بجانے میں ماہر تھے۔ یہ فن تال کا فن ہے اور ان دنوں ملکی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بالین سے ہی طفیل کے کان میں سُردار تال کی آوازیں پڑتی رہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گانے کا گلے سے تعلق ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ بنیادی طور پر گانے کا کان سے تعلق ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم ایک جیسا نہیں سُنتے۔ کچھ لوگ زیادہ سُنتے ہیں، کچھ کم۔ کچھ لوگوں میں سُنی ہوئی چیز کو زیادہ داشت میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں گائیک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

جب طفیل بڑا ہوا تو اسے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر مگر

رہا تھا۔ اسمبلی میں جب اس نے طفیل کو دُعا گاتے ہوئے سنا تو اس کی توجہ طفیل پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اسے گانے کی ترغیب دینے لگا، اور زیادہ وقت اس کا گانا سُنانے میں صرف کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل کی توجہ بڑھنے کی بجائے گانے کی طرف لگ گئی، اور اس نے گھرانے کے خلاف بنادت کر دی۔ گھر والے چاہتے تھے کہ وہ کچھاوجیہ بنے، لیکن اس کے سر پر مگر کی لگن سوار ہو گئی۔

موسیقی کے دو پہلو ہوتے ہیں : سُراور تال۔ تال جسم پر اثر کرتی ہے، سُراُدوج پر۔ تال پر ہاتھ چلتا ہے۔ سُرا چلتا ہے۔ پاؤں چلتے ہیں۔ رقص چلتا ہے۔ سارا جسم چلتا ہے۔ خواہش جاگتی ہے۔ سُراُدوج کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ دُکھ اُبھرتا ہے۔ درد جاگتا ہے۔ اندر کا انسان باہر نکلتا ہے۔ تنہائی کا تنہو تن جاتا ہے۔ کامنات سے ایک اُن جانا تعلق بیدار ہو جاتا ہے۔ پھر سب کچھ ایک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فن کار بنایا نہیں جاتا۔ بنا بنایا آتا ہے۔ البتہ قدرت اسے سُرا کرنے کے لیے کھن لاہوں پر ڈال دیتی ہے۔

فن کار خود رد ہوتا ہے۔ گیلے کا بوٹا نہیں ہوتا۔ وہ ٹیر دھی لکیر ہوتا ہے۔ سیدھا کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ پنپے تلے راستے پر نہیں چلتا۔ اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ شعور کے جاگنے سے پہلے ہی طفیل نے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا عزم کر لیا، اور قدرت نے سُرا کے اس دیوانے کو سُرا کرنے کے لیے رنگا رنگ کے مشاہدات کی دھنکی میں ڈال دیا تاکہ دھنک دھنک کر رُواں رُواں ہو جائے۔

گھروالوں نے طفیل کے تیور دیکھ کر محسوس کیا کہ سارا دھن جا رہا ہے۔ سوچا کہ چلو، آدھا بانٹ دیتے ہیں۔ بچپن کا شوق ہے، اسے پورا کر دو۔ شاید کچھ دیر کے بعد سمجھ آ جائے اور کچھاوجیہ واپس گھر آجائے۔ گھر میں طفیل کی بڑی حیثیت تھی۔ اس لیے کہ چار ایک بھائیوں کے گھروں میں صرف ایک نرینہ اولاد تھی۔ اس لیے وہ سب کا پیارا تھا۔ لاڈ لاکھا۔

سب نے مل کر مشورہ کیا اور طفیل کو امرتسر کے قریب پمبہ گاؤں کے گرودارے میں لڑکھڑایا۔ وہاں طفیل کے نانا ربانی کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ پمبہ گرودارے میں طفیل کا کام گورو نانک کی بانی کے بھن میں سنگت کرنا تھا۔ گرودارے میں دھرم بھی گایا جاتا تھا، جس کے ساتھ کھلے ہاتھ کا طبلہ بجاتا تھا۔ یعنی پکھا دھیمے کی واپسی کی صورت موجود تھی۔ دھرم سنگت کی پُرانی شکل ہے جو آج کل کی مروجہ شکل خیال سے مختلف ہے۔

دھرم میں دھنیں بندھی ملتی ہوتی ہیں اور گائیک کو اختیار نہیں ہوتا کہ رد و بدل کر سکے یا اپنا کمال دکھا سکے۔ دھرم میں زیادہ تر حمد و ثنا ہوتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ دھرم مندر کی پیداوار ہے۔ چونکہ دھرم بدھ مت کا صلہ کمپوز کر جاتا تھا، اور گانے دالے کے لیے اپنے کمال کو پیش کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے انھوں نے گائیکی میں خیال کی طرز ڈالی جو آج تک رائج ہے۔

تین ایک سال طفیل پمبہ کے گرودارے میں نانک بانی گاتا رہا۔ پھر اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اس پر طفیل کے والد اسے گوند وال کی گوند شاہ میں لے گئے جو ترن تارن کے قریب واقع تھی۔

گوند وال گوند شاہ میں طفیل کا کام پارٹی کے ساتھ گاؤں گاؤں بھرنا اور گاگا کر گنور کشا کا پرچار کرنا تھا۔

شاید گوند وال سے بھی طفیل کا دل اُچاٹ ہو جانا، لیکن وہاں اس کے لیے دو خصوصی دل چسپیاں تھیں۔ ایک تو ہر بلب کا چھوٹا میلا اور دوسرے بٹالے کا توڑا نھو رام۔ تقسیم سے پہلے جالندھر میں ہر سال گائیکوں کا بہت بڑا اکٹھ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے گائیک اس اکٹھ میں شرکت کیا کرتے تھے، اور اپنے اپنے شاہ پارے پیش کرتے تھے۔ اس اکٹھ کو ہر بلب کا میلا کہا کرتے تھے۔ یہ میلا بڑے

میلے کے نام سے مشہور تھا، اور اس میں زیادہ تر گائیک شہ راک کے ہوتے تھے۔
گوند وال ہیں ایک ایسا ہی میل لگتا تھا، چھوٹے پیمانے پر، جسے ہر بلب کا
چھوٹا میل لگتے تھے۔

طفیل کے لیے یہ میل بہت بڑی نعمت تھا۔ کیونکہ اسے بڑے بڑے گوتوں کو
سُسنے کا موقع ملتا تھا۔ یوں بچپن میں ہی شہ راک اس کے کان میں بیٹھ گیا اور اس کی
گائیکی کی بنیاد بن گیا۔

بنائے کا تھو رام اکثر گوند وال آیا کرتا تھا۔ وہ کوئی مشہور گائیک نہیں تھا۔ اسے
نئی نئی انوکھی دھنیں اور بندشیں کمپوز کرنے کا شوق تھا، اور اسے بیسیوں بندشیں یاد
تھیں۔ تھو رام نے طفیل میں کمپوزیشن کا احساس اور شوق دلایا۔

گوشتالہ پر چار پارٹی نے طفیل میں گاؤں گاؤں گھومنے کا اشتیاق پیدا کیا۔
گوند وال میں طفیل صرف چار سال رہا۔ پھر وہ راس دھاریوں کے ساتھ
شامل ہو گیا۔

راس دھاریے جگہ جگہ گھوم پھر کر جمع لگایا کرتے تھے۔ وہ نائیک بھی کھیلتے تھے
اور قصہ گوئی بھی کرتے تھے۔ ان کا فن گانے، بیان اور نائیک کا عجیب مگر دل چسپ
لمغوبہ تھا۔

طفیل نے چند ایک برس ان سے نائیک اور قصہ خوانی کا فن سیکھا، اور پھر
انہیں چھوڑ کر نوٹسکی میں شامل ہو گیا۔ نوٹسکی گھومتا پھرتا تھیٹر تھا۔

نوٹسکی میں طفیل نے سستی پتوں، ہیر رانجھا، سوہنی مینوال، پورن بھگت میں
ہیرو کا پارٹ ادا کیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے تھیٹر کی بندشوں سے
واقفیت حاصل کی۔

اس زمانے میں تھیٹر کی بڑی دھوم تھی۔ تھیٹر کی دنیا میں آغا حشر کاندلکا جتا تھا۔

آغا حشر بڑی قابلیت اور صلاحیتوں کا شخص تھا۔ وہ ڈراما نگار تھا، شاعر تھا، ڈائریکٹر تھا، کمپوزر تھا اور اداکار تھا۔ اس نے تھیٹر کی بیسیوں دھنیں کمپوز کی تھیں۔
 نوٹنکی میں طفیل نے ڈراما اور تھیٹر کمپوزیشن میں مہارت حاصل کی۔ آج تک وہ دوسروں کی پارٹیوں میں کام کرتا رہا تھا، پھر دفعۃً اس میں ذاتی شہرت کی آرزو جاگی اور اس نے نوٹنکی کو چھوڑ کر اپنی سنگیت پارٹی بنائی۔

آوارگی کے اس دور میں سُر کے جنگل میں یہ بھونکا بھول بھول پر بٹھا۔ کانٹے کانٹے سے ٹوٹا ہوا۔ مندریں بھن گائے، گٹھنشاہ میں گٹھنشاہ کے گیت گائے، گردو داسے میں دھڑلہ الاپا۔ کیرن کیا، راس دھاریوں کے ساتھ رام لیلا کھیلی، تھتہ خوانی میں سُر اور بیان کی سنگیت سیکھی، نوٹنکی میں عظیم عاشقوں کے کردار پڑھتے، اور ناملک کی بندشوں میں دسترس حاصل کی۔ پھر سنگیت ٹولی میں لوک سنگیت سے پریم رچایا۔
 یوں سنگیت کی بھول بھیتوں میں بادیہ پیمائی سے طفیل کو سُر تو مل گئی، پکار بھی حاصل ہو گئی، لیکن ابھی درد کو جان بننا باقی تھا۔ موسیقار تشنہ تکمیل تھا۔

سنگیت پارٹی قائم کرنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ چند ایک ہی برس میں سارے علاقے میں طفیل کا نام مشہور ہو گیا اور اس کی پارٹی کی مانگ پیدا ہو گئی۔ لیکن انہی دنوں قیام پاکستان عمل میں آ گیا اور طفیل کو اس علاقے کو چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینا پڑی۔

پاکستان میں اسے ملتان لے جایا گیا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ عزیز واقارب نہ رہے۔ بدوانے نہ رہے۔ وہ ایک بیگانے شہر میں اجنبی کی حیثیت سے اُپر ہوا۔
 جوں توں کر کے اسے سر چھپانے کے لیے ایک مکان تو مل گیا، لیکن گزارے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر نہ چھو کر اس نے ملتان میں حلوائی کی دکان کھول لی، اور دودھ دہی اور مٹھائی بیچ کر گزارہ کرنے لگا۔

چند ایک ماہ بعد ملتان کا ایک پولیس انسپرنے طفیل کی دکان پر آکھلا۔ وہ طفیل کا پُرانا
 فین تھا۔ اس نے طفیل کو پہچان لیا۔ بولا "طفیل، دکان داری کر رہے ہو؟ نہیں یہ نہیں ہوگا۔
 بھی، اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟" طفیل نے کہا "اپنا کام کیسے کروں؟ نہ ساز رہے، نہ ساتھی۔"
 پولیس انسپرنے مال خانے سے اسے ساز ملا دیے اور اُس نے گھوم بھر کچر ساتھی
 تلاش کر لیے۔ اس کے بعد پولیس انسپرنے ایک سنگیت محفل کا انتظام کیا اور طفیل کو شہر کے
 لوگوں سے متعارف کرایا۔ یوں طفیل کی سنگیت پارٹی پھر سے وجود میں آگئی اور ملتان کے
 گرد و نواح میں اس کی شہرت پھیلنے لگی۔

ایک دفعہ میں نے تقریباً طفیل سے پوچھا کہ بھئی، تم نے سنگیت کی بہت سی
 محفلوں میں شرکت کی ہے۔ کیا کوئی ایسی محفل بھی تھی جسے تم ناقابلِ فراموش سمجھتے ہو؟
 اس سوال پر طفیل مسکرایا۔ بولا "ہاں، ایک محفل ایسی تھی جسے ہم کبھی بھول نہیں
 سکتے۔" پھر اس نے مجھے اس محفل کی روئیداد سنائی۔ کہنے لگا "ایک روز شام کے وقت
 ایک صاحب آئے کہنے لگے کہ پرسوں ہمارے ہاں ایک تقریب ہے۔ آپ اپنی پارٹی
 لے آئیں۔ اس نے پیشگی کی بجائے ساری رقم مع آمدورفت کرایہ ادا کر دی اور ہمیں جگہ کا
 اتنا پتا سمجھا دیا۔ یہ جگہ شہر سے پچیس تیس میل دور تھی۔ مقررہ روز ہم شام کے وقت،
 دہاں پہنچ کر حیران ہوئے، کیونکہ دیرانے میں ایک بڑے بڑے درخت کے قریب
 ایک بڑا خیمہ لگا ہوا تھا اور خیمے کے باہر دریاں بھی ہوئی تھیں۔ ہم دہاں پہنچے ہی تھے کہ
 وہ صاحب آگئے۔ انھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور درواریں پر بٹھا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد ہمارے میزبان کے پانچ چھ ساتھی آگئے۔ ان کے آنے پر محفل
 شروع ہو گئی۔ آدھی رات تک ہم گاتے رہے۔ پھر انھوں نے ہم سے کہا کہ کسی وجہ سے
 برات نہیں آئی۔ اب آپ یہیں آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔ اس پر ہم نے محفل ختم
 کی اور وہیں دیروں پر لیٹ کر سو گئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خوب

نہند آئی۔ صبح جب ہم جاگے تو نہ وہ شامیانہ تھانہ دریاں تھیں۔ ہم سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے بڑا کا درخت تھا جس کے قریب ہی ایک کھنڈر تھا۔ یہ دیکھ کر ہم پر خوف طاری ہو گیا اور اپنے ساز اٹھا کر وہاں سے بھاگے۔
یعنی طفیل کی مقبولیت اس مخلوق تک بھی جا پہنچی تھی جو کھنڈر، بڑا اور دیوانوں میں رہتی ہے۔

پھر ایسی ہی ایک محفل میں ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے نے طفیل کو سنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈیو ٹرانسکریپشن میں طفیل اور اس کی پارٹی تقریباً چھ ماہ تک اپنے گلے ریکارڈ کرتی رہی۔ اس دوران میں طفیل کو اپنا تھیںٹرنٹانے کا شوق چھڑایا اور اس نے میاں طفیل تھیںٹرنٹ قائم کر لیا، جس میں آٹھ لڑکیاں تھیں، دس لڑکے تھے اور دس سا نندے تھے۔

کہتے ہیں ”رولنگ سٹون گیدز نو ماس“۔ یہ کماؤت کسبی سرمایہ دار نے بنائی ہے، جس کے نزدیک ماس صرف سا نوسا مان ہے۔ فن کی دُنیا میں ٹھوکریں کھانا ناس صروری ہوتا ہے اور اگر ٹھوکریں کھاتے کھاتے دل کو ٹھوکر لگ جائے، شیشہ ترخ جائے، اندر لڑٹ پیدا ہو جائے، تو سمجھو کہ تکمیل کی صورت پیدا ہو گئی۔

لڑٹ بنا مڑ پیدا نہیں ہوتی۔ لڑٹ نہ ہو تو نے سسکیاں نہیں بھرسکتی۔ لڑٹ ہی سے دردِ رستا ہے۔ رِس رِس کر انگ انگ میں بھر جاتا ہے۔ اب طفیل کی سنگیت کا پہلا دور ختم ہو رہا تھا۔ کراہ اور پکار سے نکل کر وہ دردِ مبتا جا رہا تھا۔ فن تلخی کی جگہ اسے مٹھاس بخش رہا تھا۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن سے ہوتا ہوا آخر وہ لوک دِٹنے میں پہنچ گیا۔ لوک دِٹنے بھی ایک عجیب و غریب ادارہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دُنیا کے تمام ملکوں کے سیانے مل بیٹھے۔ انھوں نے کہا: بھائیو، دُنیا میں جگہ جگہ ایک کچھرا کچھرا پیدا ہو گیا ہے، جو بھوکو کی طرح چلنے لگا ہے۔ نو جوانانِ عالم اس کچھرا کچھر سے بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

اگر یہ جھکڑی نہ تھی چلتا رہا تو ساری دنیا کو گرد و غبار سے بھر دے گا۔ نہ کسی ملک کی موسیقی رہے گی، نہ ناچ رہے گا۔ نہ روایت رہے گی، نہ رسم و رواج رہے گا۔ نہ آرٹ رہے گا، نہ دستکاری رہے گی۔ کسی ملک کی پہچان نہ رہے گی۔ اس لیے بھائیو، اپنی اپنی روایات، کلچر، آرٹ، لباس کو محفوظ کر لو ورنہ ہمارے تمام کلچر مٹ جائے گا۔ اس پر ۳۲ ملکوں نے اپنے اپنے ہاں لوک ورثے کے ادارے قائم کر لیے، تاکہ اپنے کلچر کو محفوظ کر لیں۔ پاکستان نے بھی کلچر کی وزارت کے تحت لوک ورثے کا محکمہ قائم کر لیا۔

اس کچھڑا کلچر نے ہماری موسیقی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس نے مٹر کو رد کر دیا ہے، تال کو اپنا لیا ہے۔ تیز اور تیز، اور تیز۔ گانے کو رقص میں بدل دیا ہے۔ اس رقص میں کوئی جمالیاتی حرکت نہیں ہے۔ شدت دیا انکی، ہسٹریا، جسم جسم جسم۔ جسم اور شدت کا ایک طوفان۔ جسم کی بوتل سے خواہش کا جن اُبھر رہا ہے۔

لوک ورثے میں شمولیت کے بعد طفیل کو ایک راستہ مل گیا، فن میں قیام پیدا ہو گیا اور وہ لوک دھنوں کو شدھ سنگیت میں رنگنے لگا۔

طفیل واحد لوک گائیک ہے جس کی گائیکی کی بنیاد شدھ راگ ہے۔

طفیل نے مشہور لوک گیت ماہیا پر تحقیق کی۔ ماہیا ایک مقبول عام لوک گیت ہے جو تقریباً ہر علاقے میں مخصوص علاقائی دھن میں گایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد طفیل نے ماہیا کو بیسیوں لوک دھنوں میں سمایا، اور کئی ایک کو شدھ راگ میں بھگو دیا۔

شدھ راگ عوام کے لیے ناپسندیدہ سی، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شدھ راگ ہی وہ دھارا ہے جس سے سنگیت کا باغیچہ ہر بھرا ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم شدھ راگ سے متاثر نہیں ہوتے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ ہر راگ ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے تشکیل کیا گیا ہے، جو صرف جاننے والے پر ہی نہیں بلکہ اُن جان پر بھی لازماً اثر کرتا ہے۔ اگر ہم اُن جان اس تاثر سے محروم رہتے ہیں تو قصور راگ کا نہیں،

گاہک کا ہے۔

شدھ راگ کے گاہک آپ کے اد میرے لیے نہیں گاتے۔ تاثر پیدا کرنے کے لیے نہیں گاتے۔ وہ اپنا کمال ظاہر کرنے کے لیے گاتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر فن کار پر نمائش کا جذبہ طاری ہو جائے تو اس میں تاثر نہیں رہتا۔ اگر گاہک خود تاثر میں بھیگ جائے کہ اسے اپنے کمال کی شدھ بدھ نہ رہے، تو پھر تاثر کے پھینٹے اڑتے ہیں اور محفل کو بھگودیتے ہیں۔

مجھے شدھ راگ گانے والوں سے شکایت ہے کہ وہ میرے لیے نہیں گاتے اور پھر مجھ سے ہی شکایت کرتے ہیں کہ میں گانا سننا نہیں جانتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں چلاتے۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہوں اور وہ دُور نکل جاتے ہیں۔ پھر مجھے طعنے دیتے ہیں کہ میں ساکت و جامد ہوں۔ بے حس ہوں۔

طفیل میں یہ غیبی ہے کہ وہ میرے لیے گاتا ہے۔ سننے والوں میں تاثر پیدا کرنے کے لیے گاتا ہے۔

جائے پناہ سے جائے امتیاز

جن دنوں ہندوستان کے مسلمان قائدِ اعظم کی قیادت میں حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، اُن دنوں میں سکھ بندواشوروں میں گھرا بیٹھا تھا۔

میرے ارد گرد سائنس دان اور فلسفی بیٹھے تھے۔ برٹنڈرسل، آلڈو، جولین، ہالڈین، فریڈ، یونگ، ایڈلر، اشبن ہارنٹن۔ یہ سب لوگ مجھے سمجھا رہے تھے۔ زندگی کے متعلق سائنسی زاویہ نظر سکھا رہے تھے۔

ایک کتا: شک کرو۔ ہر بات پر شک کرنا سیکھو۔ ایمان سے بچ کر رہنا۔ کسی بات پر ایمان لے آئے تو آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اپنا جین کر بیٹھ جاؤ گے۔

دوسرا کتا: جذبہ ایک دلدل ہے۔ اس دلدل میں پھنس گئے تو ڈوب جاؤ گے۔ تیرنا چاہتے ہو تو فکر کرو اپناؤ۔

تیسرا کتا: میاں سیکھر بنو۔ مذہب تمہیں محدود کر کے لکھ دے گا۔ دوست چاہتے ہو تو لادینیت اختیار کرو۔

چوتھا کتا: کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں۔ بے شک اللہ کو ماتو۔ اللہ تو تھکے ہوئے سر کے لیے تکیہ ہے۔ اگر اللہ نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی تسلی کے لیے اسے ایجاد کر لیتے۔ لیکن اللہ ایک پرسنل چیز ہے۔ اسے پرسنل ہی رکھو۔

ان کی باتیں سن سن کر مجھے اس بات پر ندامت محسوس ہوتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ اگرچہ میں مجھ زبانِ مسلمان تھا، خالی، نام کا۔ پھر بھی تھا تو مسلمان۔ جب بھی خیال آتا، شرم سے

میری گردن لٹک جاتی تھی۔

دوسرے مجھے اپنے بیک در دُطن اور فرسودہ روایات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔
مشرقی مفکروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ فکر و نظر سے متعلق میرا مکہ مغرب تھا۔

آپ سے کہ دوں تو کیا ہرج ہے کہ میرے ذہن میں سیاست کا خانہ جب بھی خالی تھا
اب بھی خالی ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے۔ بلاوجہ میرے دل میں یہ ایمان نہجۂ ہو چکا ہے کہ
سیاست ہیرا پھیری کا دوسرا نام ہے۔

اب آپ خود ہی سمجھ لیں کہ جو شخص مذہبی جذبے پر ندامت محسوس کرے، وطن سے
بیگانہ اور سیاست میں کورا ہو، تو اُسے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے مطالبے سے کیا
ہمدردی ہو سکتی ہے۔

ٹھہریے! اس سے آپ یہ اندازہ نہ لگایجیے گا کہ مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں
حالی اور مظلومیت کا احساس نہ تھا۔ نہیں، ایسی بات نہیں۔ میں نے اتنا کچھ دیکھا تھا، مجھے اتنا
کچھ دیکھنا پڑا تھا کہ میں نے ڈر کر اسٹکھیں بند کر لی تھیں۔

میں نے سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی بھرتی روکنے کی سرگرمیاں دیکھی تھیں۔ تجارت
میں مسلمانوں پر دروازے بند کرنے کی ہیرا پھیریاں دیکھی تھیں۔ چھوٹ چھات کے ذریعے انھیں
احساس کمتری میں ڈبوایا جا رہا تھا۔ دست کاری میں ان کی بہتری کو مڈل مین بن کر لوٹا جا رہا
تھا۔ کاشت کاری میں جہا جن بن کر قرض کی قینچی سے کاٹا جا رہا تھا۔ سوچے سمجھے دُور رس
منصوبوں سے مسلمانوں کی املاک کو ہتھیایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ کہاں ہو رہا تھا؟ اس صبحے
میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔

میں اکثر بیٹھ کر سوچا کرتا: یا اللہ! اگر یہاں یہ حال ہے تو ان علاقوں میں کیا ہو رہا
ہوگا جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

میں یہ سب کچھ جانتا تھا، اس کے باوجود مجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمان الگ وطن کا

مطالبہ کیوں کر رہے ہیں؟

اس کی دو وجوہات تھیں :

پہلی وجہ یہ تھی کہ برائے نام مسلمان ہونے کے باوجود میری رگوں میں مسلمانی خون دوڑ رہا تھا۔ اور مسلمان انہی طور پر ایک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس بیماری کو کہتے ہیں، فزراخ دلی۔ اگر تعصب یا بے جا بھی تو وہ سطحی رہتا ہے۔ دل تک نہیں پہنچ پاتا۔ بد قسمتی سے قوموں کی بقا کے لیے تھوڑا سا مثبت تعصب ضروری ہوتا ہے۔ میں سوچتا : اگر غیر مسلم لوگ چھوٹے دل کے مالک ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی اپنے دل کو چھوٹا کر لیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں دانشور تھا اور مذہبی زاویہ نظر سے سوچتا میرے شایان شان نہ تھا۔ جب بھی مجھے مسلمانوں کی زبوں حالی کا خیال آتا تو دفعۃً اندر سے دانشور سر نکلتا۔ یہ کیا سوچ رہا ہے تو؟ ایسے چھوٹے خیالات کو دل میں رچاتے ہوئے مشرم نہیں آتی تھے، مذہبی جذبات کی دلدل میں پھنسنا چاہتا ہے کیا؟ لاجحل ولاقوہ !

لاجحل پڑھ کر میں ان کیسے خیالات کو اپنے ذہن سے چھٹکا دیتا اور اپنے فکر کو تعصب کی آلائش سے پاک کر لیتا۔ پھر خود کو ایسے خیالات سے محفوظ کرنے کے لیے سوچتا : پاکستان کے مطالبے کا مقصد جانتا ہے تو؟ وہ پاکستان جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، ہو گا کیا؟ مذہبی جذبے سے گلا سڑا ہوا ایک ملک جس میں بندشیں ہی بندشیں ہوں گی۔ شلوار کی مہری چار انچ سے زیادہ نہ ہو۔ ڈاڑھی کی لمبائی ایک ٹمٹھ سے کم نہ ہو۔ سرنگانہ ہو۔ پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو۔ گانے بجانے پر پھر ہو گا۔ ناچنے کی اجازت نہ ہو گی۔ ادب پر اسلامی سنتری کھڑا ہو گا۔ پینٹنگ اور بُت تراشی سخت سزا کی مستوجب ہو گی۔ فلموں میں مکالمات کی جگہ آیات ہوں گی۔ اس پاکستان کے لیے ہمدردی کے جذبات رچائے گا کیا؟ لاجحل ولاقوہ۔

قائدِ اعظم کے کردار سے میں بے حد متاثر تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کے معترف تھے۔ کبھی کسی کو جراثیم نہ ہوئی تھی کہ قائد کے کردار پر

حرف زنی کرے۔

قائد کی ذہن میں عزت کیوں نہ ہوتی۔ ان میں ہر وہ بات موجود تھی جس کا میں محترم تھا۔ جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ اُصولوں کے پابند تھے۔ ہیرا پھیری نہ خود کرتے تھے، نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔ عقل و خرد کے قائل تھے۔ جذبات سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔

مجھے قائد اعظم سے صرف ایک شکایت تھی۔ سوچتا: قائد نے سیاست کو کیوں اپنا رکھا ہے؟ اگر میرا پھیری کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تو میرا پھیری کے اکھاڑے میں کیوں آکھڑے ہوئے ہیں؟

بڑے بڑے سیاسی اقدام کا تو مجھے شعور نہ تھا، البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ مثلاً گاندھی جی اپنے آپ کو ماتا کہلاتے تھے۔ ہم سب انھیں ماتا کہتے تھے ایسا تو میں بھی ان کا نام ماتا گاندھی پھیلتا تھا۔ لیکن قائد اعظم انھیں ہمیشہ مسٹر گاندھی کہہ کر بلاتے تھے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر قائد انھیں ماتا کہہ کر بلانے سے کیوں گریز کرتے تھے؟ اتنی چھوٹی سی بات پر کیوں ضد کرتے ہیں؟ ماتا تو ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ پھر انھیں ماتا کہنے میں کیا حرج تھا؟

یہ نہیں کہ مجھے ماتا کے مفہوم کا علم نہ تھا۔ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ ماتا کا مطلب عظیم انسان ہے۔ لیکن مجھے اس حقیقت کا شعور نہ تھا کہ اگر آپ کسی کو بار بار عظیم انسان کہہ کر بلائیں تو ان جانے میں آپ اسے عظیم انسان ماننے لگیں گے۔ اور اگر آپ کسی کو عظیم انسان مان لیں تو پھر اس کی بات کو رد کرنا مشکل ہو جائے گا۔

پھر سلام کرنے کی تفصیل تھی۔ ماتا گاندھی جب بھی قائد سے ملتے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لے جاتے اور پھر جھک کر انھیں منسکا کر کرتے۔ اس کے برعکس قائد کسی اخلاق سے ٹوپی کو چھڑتے اور ایک خشک اور کورہ اگڈ مارنگ کہہ کر منسکا کر کا جواب دے دیتے۔

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ قائد غیر مسلم لیڈروں سے بھیگتے کیوں نہیں تھے؟

پھر لباس کی بات تھی۔ کانگریسی لیڈر قومی لباس پہنتے تھے۔ لیکن قائدِ اعظم مغربی لباس پہننے کے قائل تھے۔ اور صرف یہی نہیں کہ مغربی لباس پہنتے تھے بلکہ ان کے لباس سے ہاؤس آف لارڈز کی بُد آئی تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ شاید اسی لیے روزنامہ ”ٹریبون“ ان باتوں کو بہت اُچھالتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں قائدِ اعظم کی عزت تھی۔ پھر قیامِ پاکستان کی بات پکی ہو گئی۔

اس پر لاہور میں ایک قیامت خیز طوفان چل پڑا۔ اس روز شام کا وقت تھا۔ احمد بشیر ادویں دونوں کسی کام سے جا رہے تھے۔ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر مولانا صلاح الدین احمد مل گئے۔ علیک سلیک کے بعد کوئی بات چل نکلی۔ مٹا ایک سٹور اُٹھا۔ اس سٹور کی نوعیت تشدد بھری تھی۔

دیکھا تو ایک جانب سے ننگی کمرپانوں کا جلوس آرہا ہے، اور پاکستان مُردہ بادر کے نعرے لگ رہے ہیں۔ یہ جلوس بہت لمبا تھا اور اس میں سے تشدد کے بھیکے اُٹھ رہے تھے۔ ساری مال روڈ سہم گئی۔ ابھی یہ جلوس ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک گلی سے عورتوں کا جلوس برآمد ہو گیا۔ وہ سب بھاگ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پاکستان کا سیاہ کمرہ ہی تھیں۔

دفعۃً مولانا صلاح الدین چونکے۔ ”ارے صاحب!“ وہ بولے ”یہ جلوس تو ایک دھکی ہے۔ فضا کے تیور ٹھیک نہیں۔ میں چلتا ہوں!“
”وہ کیوں؟“ احمد بشیر نے پوچھا۔

”صاحب، میرا مکان تو شدھ ہندو محلے کے عین وسط میں ہے۔ اللہ خیر کرے۔ مجھے گھر والوں کی خبر لینی ہے۔“

ان دنوں احمد بشیر ٹکمر کے اس حصے میں تھا جسے گرین یو تھ کہتے ہیں۔ وہ ڈر کے مفہوم سے واقف نہ تھا۔ اس کی دلیری حماقت کی حد تک پہنچی تھی۔ جلوس کو دیکھ کر وہ بہت خوش

تھا شاید اس لیے کہ اس کی نظر میں وہ جلوس آنے والے ایڈیٹر نجر کا پیام بر تھا۔
احمد بشیر میری طرح منہ زبانی مسلمان تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ اس کے دل میں ایک اندھا
اسلامی جذبہ موعین ماہرہ لہ تھا۔

مولانا صلاح الدین کے جانے کے بعد احمد بشیر لولا "تیار، تیری ہمیشہ بھی کرشن نگین بہتی
ہے۔ چلو، اسے دہاں سے نکال لائیں۔"

جب ہم کرشن نگر پہنچے تو چوک میں ایک تانگے کے ارد گرد بھڑنگی ہوئی تھی۔ کوچران
کی لاش زمین پر پڑی تھی اور ایک مہتر منڈنی چلا چلا کر کہہ رہی تھی "ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا! اس
نے تو مجھے ماں کہا تھا: ماما جی! آپ میرے تانگے پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو خیریت سے کرشن نگر
پہنچا دوں گا۔ یہ تم نے کیا کر دیا؟ اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا!

تانگے کے ارد گرد میں پچیس جوان کھڑے تھے جن سے وہ مخاطب تھی۔

چھرا احمد بشیر نے ایک کوٹکا ہوا غرہ مارا "اللہ اکبر!" وہ سب ہم کو پیچھے ہٹ گئے
اور احمد بشیر میری ہمیشہ کے گھر جا داخل ہوا۔

ہمیشہ کو کرشن نگر سے نکالنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا سوال ابھرا کہ یہ لوگ
پاکستان کے قیام کے خلاف ہیں تو بے شک ہوں لیکن تلواریں لہرانے، سیاہ کرنے اور خنجر چلانے
کا مطلب؟ سیدھی بات ہے مسلمانوں کو سمجھاؤ کہ پاکستان کا قیام ٹھیک نہیں۔ اس طرح ملک
بٹ جائے گا۔ اس پر بھی اگر وہ نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ بنالینے دور پاکستان۔ یہ لڑائی بھگائیں؟
پھر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ تو ایک مثبت مانگ ہے اور "نہیں بننے دیں گے"
ایک منفی بات ہے۔ اور کوئی سمجھدار آدمی منفی مانگ سے ہمدردی نہیں رکھ سکتا۔

پھر حماقت کی انتہا دیکھو کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اکثریت کے علاقے میں چھرے بازی کی
رسم ڈال رہے ہیں۔ اگر مسلمان مشعل ہو گئے تو کیا ہوگا؟ اتنی سی بات نہیں سمجھتے یہ مذہبی دیوانے۔
لیکن ان کے لیڈر تو کہتے ہیں ہم سیکھر ہیں۔ وہ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

بہر حال، لاہور میں آشدہ کے واقعات ہوتے رہے۔ کبھی بھائی دروازے کے سینما ہاؤس میں بم پھٹ جاتا، کبھی رات کے اندھیرے میں مسلمان محلے میں بم پھینکے جاتے، کبھی ہندوؤں کے محلوں سے مسلمانوں کی چھڑاؤ لاشیں برآمد ہوتیں۔ ان واقعات کے ساتھ ساتھ میرے فکر کا رخ بدلتا گیا۔

پھر ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں احمد بشیر اور میں فلم سازی کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں کرشن چندر نے اپنے گھر ”کوڈر لاج“ میں ادیبوں اور فن کاروں کے لیے مفت کی سرائے کھول رکھی تھی۔ ہم نے بھی ایک کمرے میں بستر لگائے۔ اس کمرے میں میراجی پہلے سے براجمان تھا۔ بمبئی میں ان دنوں چھڑاؤ زوروں پر تھی۔ دقت یہ ہوئی کہ احمد بشیر اور میراجی حکمیتہ نیم مسلمانوں کا ساتھ تھا۔ مگر میراجی کی میک اپ ہندو جوگیوں سی تھی۔ اگر ہم مسلمان علاقے میں گھومتے تو میراجی کا رنگ ہلدی کی مچھ زد ہو جاتا، اوروہ مقررہ مکان پر نہ لگتا۔ ہندو علاقے میں گھومتے تو میری جان عذاب میں رہتی۔

احمد بشیر کے ذہن میں ڈرا اور احتیاط کے خانے خالی تھے۔ اُنہاں سے تو یہ شوق تھا کہ کوئی چھڑا لے کر اس پر لپکے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان علاقے میں کوئی فرق نہ تھا۔ میری اپنی یہ کیفیت تھی کہ میں سوچتا تھا: اگر کوئی چھڑا لے کر مجھ پر لپکا تو میں کہوں گا ”ابے اورنگ جا“ وہ رُک جائے گا۔ پھر میں کہوں گا ”تجھے پتا نہیں کیا، میں تو ایک سیکلر آدمی ہوں؟ میں تو نام کا مسلمان ہوں۔ مجھ پر حملہ کرتا ہے، احمق!“ پھر ایک روز حملہ ہو گیا۔

ہوایوں کہ اُس روز میں احمد بشیر سے پھر مل گیا۔ دادر کے علاقے سے گزر رہا تھا چلتا کم تھا، ادھر ادھر دیکھتا نہ یادہ تھا۔ پھر ایک اور راہ گیر آ گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شاید وہ بھی میری طرح خائف تھا۔

دفعۃً گلی سے ایک چھڑے باز لکلا اور میرے ساتھی کی طرف لپکا۔ میرا ساتھی بہت

چلایا نہیں، نہیں، میں نہیں! لیکن حملہ آور نے اس کی بات مئے بغیر سے ڈھیر کر دیا۔ میں
ڈر کر بھاگا۔

اس پر میں سوچنے لگا کہ یہ پھرے والے تو بات ہی نہیں مٹلتے۔ پوچھتے ہی نہیں کہ
میاں تم کیسے مسلمان ہو۔

گھر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ چاہے میں سیکڑ تھا، چاہے دانش ور تھا، چاہے نام کا تھا،
بہر صورت میں مسلمان تھا۔ اس روز میں نے سچے دل سے تسلیم کر لیا کہ میں مسلمان ہوں، اور پاکستان
میری واحد جائے پناہ ہے۔ اس کے بعد مجھ سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا۔

بمبئی میں نہیں بہت سا کام ملتے کی صورتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں روپوں کے
کانٹریکٹ حاصل کرنے کی امیدیں بندھ چکی تھیں۔ بلکہ ہم دونوں امارت اور عیاشی کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ بمبئی کی امارت میری نظر میں ہیج ہو کر رہ گئی۔ اس لیے ہم بمبئی چھوڑ کر
لاہور آ گئے۔

ہمارے لاہور پہنچتے ہی راستے بند ہو گئے۔ کشتِ دغون کا بازار گرم ہو گیا۔ پھر تقسیم ہو گئی
اور مشرقی پنجاب کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے سُرخ ہو گئی۔

میں نے لاہور کے ریونیو کمیوں میں زندہ لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔ اپنے عزیز واقارب
کو ضلع گورداسپور سے پاکستان لانے کیلئے میں خود دہاں گیا۔ دہاں کے خونی مناظر دیکھ کر میری رُوح
میں ایک دراڑ پڑ گئی، جس میں سے ساری کی ساری دانشوری چو گئی۔ سیکڑ ازم کا بھڑا پھوٹ
گیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا۔ مجھے شدت سے
احساس ہو گیا کہ پاکستان میرے لیے واحد پناہ گاہ ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ میرا ذادیہ نظر تو بدل گیا، یعنی ایک تو میں پاکستان کو اپنی واحد
پناہ گاہ سمجھنے لگا، دوسرے میرے دل میں مسلمانوں کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر بھی میں
اسلام سے کد ہی رہا، اور میرے دل میں اپنے اللہ کے لیے شکر گزاری کے سوا اور کوئی جذبہ نہ اُبھرا۔

میں نے اپنا مطالعہ نفسیات سے شروع کیا تھا، پھر میں جنس میں جا پہنچا، اور وہاں سے

EXTRA SENSORY
PERCEPTION

چلتے چلتے پاراسائیکالوجی میں جان نکلا۔ ای ایس پی یعنی

کا مطالعہ میرے لیے حیران کن تھا۔ یوں کچھ لیجیے کہ سائیکلک سائنس میں پہنچنے کے لیے مجھے عقل و
خرد کا بیربریا کرنا پڑا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہوائی جہاز ساؤنڈ میسر پر کو توڑتے ہیں۔

ای ایس پی دراصل ایک چھٹی حس کا نام ہے۔ یہ چھٹی حس قدرت کی طرف سے تحفہ بھی
ملتی ہے اور دریافت سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چھٹی حس کی ٹوہ میں چلتے چلتے میں تبت جا
پہنچا۔ تبت سے متعلقہ کتابوں کے مطالعے سے ظاہر ہوا کہ وہاں یہ حس مقابلہ عام ہے، اور وہاں
کے پادری تیسری آنکھ کھولنے کے لیے باقاعدہ تربیت دیتے ہیں۔ پھر میری جستجو جھکسٹون، جوگوں،
صوفیوں اور بزرگوں تک جا پہنچی۔

یہ جستجو تو اپنی جگہ قائم تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم کے لیے جذبہ شکر گزاری
میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں قائد اعظم کی زندگی کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔
قائد اعظم کی شخصیت میرے لیے ایک مہم تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ پڑھا لکھا قانون دان
جو سیکرٹریٰ اور دیگر امور کا حامل تھا، اسے ایک اسلامی مملکت بنانے کا اعزاز حاصل ہو گیا!

جناب اشرف علی تھانوی صاحب سے متعلقہ ایک کتاب پڑھتے پڑھتے دفعۃً
میں چونکا۔ کھا تھا :

مولانا شبیر علی فرماتے ہیں :

مئی ۱۹۳۸ء میں ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اشرف علی تھانوی سر جھکائے منہ
بیٹھے تھے۔ دفعۃً انھوں نے سر اٹھایا۔ فرمانے لگے : میاں شبیر علی، ہوا کا رخ بتا رہے کہ
لیگ کامیاب ہوگی۔

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی — صفحہ ۶۹)

ارے! میں چونکا۔ اُس وقت بھلا کون سی ہوا چل رہی تھی، جس سے مولانا نے اندازہ

لگایا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آنے کا۔ ابھی تو لاهور ریڈیو لیوٹننٹ بھی پاس نہ ہوا تھا۔
مجھے مولانا کے کشف پر حیرت نہ ہوئی تھی چونکہ میں کشف کو چند سال اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا
خود کشف و کرامات کو فروعات کے زمرے میں گنتے ہیں۔ مجھے حیرت اس لیے ہوئی کہ قائد اعظم اور
تائید ایزدی کا ربط مل گیا۔

مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا :
جو سلطنت ملے گی (پاکستان) وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق و فاجر
کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ مل بھی جائے تو ان کے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ سلطنت
کرنا دنیا داروں کا کام ہے۔ ہم سلطنت کے طالب نہیں، صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم
ہو وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔

اس پر مولانا نے طے کیا کہ قائد اعظم سے رابطہ پیدا کیا جائے، اور انھیں دین کی تعلیم
دی جائے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ مولانا، جو مانے ہوئے عالم اور مجدد دین تھے، انھوں
نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ کیونکہ سلطنتوں کے معاملات میں دخل دینا بزرگوں کا کام نہیں۔ پھر یہ
بھی ہے کہ انھوں نے ایک ایسی مملکت کی بہتری اور بہبود کے بارے میں عملی طور پر قدم اٹھانے
کا فیصلہ کیوں کیا، جسے دس سال بعد وجود میں آنا تھا، اور جس کے سربراہ ہونے کا اعزاز محمد علی جناح
کو نصیب ہونا تھا؟ اس قسم کی دخل اندازی بزرگوں کا مسلک نہیں۔
مجھے خیال آیا، کیا مولانا اشرف علی تھانوی کو حکم ملا تھا کہ ایسا کریں؟ اگر ایسا ہے تو ظاہر
ہے کہ قیام پاکستان کو تائید ایزدی حاصل تھی۔

خیر، مولانا اشرف علی تھانوی نے باقاعدہ طور پر وقفوں کے بعد علماء کے وفد قائد اعظم کے
پاس بھیجے شروع کر دیے اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔

حیرت کی بات ہے کہ قائد اعظم نے تبلیغ کے اس سلسلے کو کیسے قبول کر لیا۔ بے شک
قائد اعظم مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن ان کی جدوجہد مسلم سٹیٹ

کے لیے مٹی، اسلامی مملکت کے لیے نہیں۔

ان کے نزدیک مذہب اور سٹیٹ دو الگ چیزیں تھیں۔ وہ سٹیٹ کو مذہب کے تابع نہیں سمجھتے تھے۔

بے شک قائد نے علما کے دُفد کی باتوں کو غور سے سنا ہوگا۔ کیونکہ وہ دوسروں کی بات تو جبر سے سُسنے کے عادی تھے۔ لیکن قائل ہوئے بغیر وہ دوسروں کی باتیں مانتے نہیں تھے۔ پھر انھوں نے دُفد کی باتیں کیسے مان لیں؟

حیرت کی بات ہے کہ علما کے اس دُفد سے دو ایک ملاقاتوں میں قائد کے بنیادی عقائد ہی بدلی گئے۔ (روٹیڈا تبلیغ - صفحہ ۱۲، فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی میں دُفد سے ملاقات کے بعد انھوں نے فرمایا ”میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب کے تابع ہوتی ہے۔“

پھر مولانا اشرف تھانوی کے مکتوب کے جواب میں قائد نے لکھا ”آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آئندہ بھی آپ مجھے ہدایات فرماتے رہیں۔“ (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ - صفحہ ۹۶)۔

قائد کی مولانا سے عقیدت اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے ممبئی کے تاجران کے جلسے میں کہا: (تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی - صفحہ ۹۶) ”مسلم لیگ کے پیچھے ایک بہت بڑا عالم ہے۔ اگر ان کا علم، تقدس اور تقویٰ ایک پلٹرے میں رکھا جائے اور دوسرے پلٹرے میں باقی سب علما کا تو ان کا پلٹر اُبھاری رہے گا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔“

مولانا نے کیا جادو کر دیا کہ قائد کا زاویہ فکر ہی بدل گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس دوران میں قائد کی داخلی زندگی میں مزید کوئی انقلاب آیا ہوگا۔

مولانا کی طرف سے اس حد تک دخل اندازی اور فائدہ میں اس حد تک قبولیت، میر دونوں باتیں اس کی شاہد ہیں کہ کوئی تیسری طاقت کام کر رہی تھی۔ یعنی تائیدِ یزدی عملی طور پر

دلاستہ ہموار کر رہی تھی۔

ان حقائق کو جاننے کے بعد میری توجہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مُرشد جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف مبذول ہو گئی۔ (حیاتِ امدادؒ - صفحہ ۶۱)۔

حاجی صاحب کی زندگی کے کوائف پڑھنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہندوستان میں پہلی اسلامی مملکت انھوں نے خود قائم کی تھی، وہ خود اس کے سربراہ تھے اور انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اس مملکت میں تمام قوانین اسلامی شریعت کے مطابق ہوں گے۔

یہ ریاست تھانہ بھون کے علاقے میں ۱۸۵۷ء میں قائم کی گئی تھی جس کے بارے میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب لکھتے ہیں :

اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو مہمینہ اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔

یہ سب بزرگانِ دین جہاد کے لیے تھانہ بھون جمع ہوئے تھے اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اس اسلامی ریاست کی تنظیم کی تھی۔ یہاں تک کہ اسلحہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے باقاعدہ طور پر شمالی کی تحصیل پر حملہ کیا تھا۔

اگرچہ یہ ریاست دیر پا ثابت نہ ہوئی کیونکہ انگریزوں نے دوبارہ منظم ہو کر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ پھر بھی یہ واقعہ عجیب ترین واقعہ ہے۔ اس لیے کہ بزرگانِ دین نے کبھی ریاست قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ریاست قائم کرنا ان کا مسلک نہیں۔ پھر یہ ریاست کیوں قائم کی گئی؟

بیان کیا جاتا ہے کہ انہی دنوں جب انگریز حاکموں نے عوام کے سامنے تذلیل کرنے کی نیت سے جناب حاجی امداد اللہ صاحب کے ہاتھ باندھ کر ان کا جلوس نکالا تو جمع سے ایک مست آگے بڑھا اور جناب حاجی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :

یہ نہ سمجھو کہ تیری عنایت اکادت گئی۔ جو بیچ تو نے بویا ہے، نوے سال کے بعد اس میں سے پودا اُبھوٹے گا۔

ان حقائق سے ایک بات واضح طور پر اخذ ہوتی ہے کہ قیام پاکستان کو تاخیر ایزدی حاصل تھی۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم کو اس امر کا شعور تھا۔ لازماً ان کی زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر ایسے واقعات یا مشاہدات ہوتے ہوں گے جن کی وجہ سے انھوں نے بزرگانِ دین سے رابطہ قبول کیا اور ان کی تلقین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا اندازِ فکر ہی بدل دیا۔

ان انکشافات کے بعد میرے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ پاکستان کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا؟

پاکستان ایک چھوٹی سی غریب مملکت ہے۔ بے شک اہل پاکستان میں اللہ محمدؐ اور قرآنِ پاک کے لیے گہرا جذبہ موجود ہے، لیکن نہ تو ہماری زندگی اسلامی رنگ میں رنگی ہے نہ فکر۔ اور اسلامی کردار کا تو ہمیں شعور ہی نہیں۔ اُنہا ہماری خصلت میں ہر وہ عیب موجود ہے جو اسلام میں ممنوع ہے۔

اس کے علاوہ یہ کوئی واحد اسلامی مملکت نہیں۔ دُنیا میں بیسیوں اسلامی مملکتیں موجود ہیں جن میں بیشتر اہم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر پاکستان پر یہ خصوصی نظرِ کرم کیوں؟ — بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پھر میری قیناتی راولپنڈی میں ہو گئی، جہاں میری ملاقات عزیزِ ملک اور یوسف ظفر سے ہوئی۔ عزیزِ ملک ایک جانے پہچانے ادیب ہیں، ساتھ ہی وہ عالمِ دین بھی ہیں اور زندگی بھر بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دیتے رہے ہیں۔

میں نے ان سے بات کی تو وہ مسکرا دیے۔ بولے ”میرے مشاہدے کے مطابق بزرگوں کا ایک خاص گروہ پاکستان کے قیام، اس کی بقا اور بہبود پر مامور ہے۔“

عزیزِ ملک کی اس بات نے مجھے از سر نو حیرت میں ڈال دیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ

عزیز ملک عادتاً نہ تو جھوٹ بولتے ہیں، نہ غلو کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے ان کی بات پر یقین نہ آیا۔

پھر عزیز ملک نے مجھے جناب سائیں اللہ بخش سے متعارف کرا دیا۔ سائیں اللہ بخش صاحب کامرا مرہٹہ کے قبرستان میں واقع ہے۔ نہ تو وہاں کوئی گنبد ہے نہ گدی ہے۔ نہ متولی ہے نہ پیر خانہ ہے۔

سائیں صاحب کے تذکرے ”مر د قلندر“ کو پڑھ کر مجھے علم ہوا کہ آپ زندگی بھر ایک اسلامی مملکت کے قیام کے لیے دوسرے بزرگوں سے جو کبھی لڑائیاں لڑتے رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ نے ”صدائے درویش“ کے عنوان سے ایک کتابچہ طبع کمرے کے شاہ دکن کو بھیجا، جس میں انھوں نے شاہ کو اسلام کا جھنڈا سر بلند کرنے کی دعوت دی۔ کچھ دیر بعد شاہ دکن نے اپنے کاناڈا اعلیٰ العزیز کو سائیں جی کی خدمت میں بھیجا۔ بندہ حیرت میں دونوں کے مذاکرات ہوئے۔

صدائے درویش کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مر د قلندر نے نظام دکن کو دعوتِ جمادی تھی اور ایک اسلامی سلطنت بنانے کی اپیل کی تھی۔ مثلاً ”صدائے درویش“ میں سائیں جی کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

تاج شاہی زیبِ سر ہو، ہند کے دُولا بنو
عرب سے عجم تک آدیں مبارک بادیاں
بغل میں قرآن ہو اپنے دست ہو حیدر کی تیغ
بن کے حامی دین احمدؐ سے سہارے شاہ دکن

سائیں جی اُمتی تھے لیکن جب بھی کیفیت کا عالم ہوتا تو وہ شعر کہا کرتے تھے۔ ان اشعار میں دزن، قافیہ، ردیف کم ہوتے تھے۔ نفسِ مضمون یا اظہارِ کیفیت زیادہ ہوا تھا۔ ظاہر ہے نظام نے سہارا نہ دیا۔

سائیں جی کی خواہش تھی کہ ہند میں اسلامی مملکت کا قیام ہو۔ کوئی ایسا مردِ مسلمان

مل جائے جو اس قیام کے لیے سہارا دے تو وہ اسے ہند کا دلو لھانداں۔

شرط صرف ایک تھی کہ اس مملکت کے ماتھ میں دین محمدؐ کی تیخ ہوا دین بل میں قرآن ہو۔
آخر یہ سعادت قائد اعظم کو نصیب ہوئی۔ قیام تو ہو گیا لیکن ان کی زندگی نے وفانہ کی اور وہ دین کے
لیے جہاد کی شرط پوری نہ کر سکے۔

قیام پاکستان کی جدوجہد کے دوران بہت سے بزرگ مضحل اور بے قرار رہتے تھے۔ ہر فیصل
پر نگاہ رکھتے۔ ہر بات پر رد عمل کا اظہار کرتے۔

سائیں جی نے بھی قیام پاکستان سے بہت عرصہ پہلے فرمایا تھا کہ اعلان جون میں ہوگا۔ اور
ایک لیکر لگا کر فرمایا تھا: آدھے ادھر آدھے ادھر۔ یہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے متعلق اشارہ تھا۔
ان کو اٹل سے ظاہر تھا کہ بزرگوں کا ایک گروہ ہند میں ایک اسلامی مملکت کے قیام
کے لیے بے قرار تھا، اور شاید عملی طور پر اس کام میں مدد کر رہا تھا۔ لیکن اس مملکت کے قیام
کا مقصد کیا تھا؟ اس ملازم پر پردہ پڑا تھا۔

جب میں پہلی مرتبہ راجا محمد شفیع اور یوسف ظفر کے ساتھ عزیز ملک کی معیت میں سائیں صاحب
کے مزار پر پہنچا تو وہاں جناب جان محمد بٹ اور آغا حنیف صاحب سے ملاقات ہوئی۔

جان محمد بٹ، آغا حنیف اور عزیز ملک سائیں صاحب کی خدمت میں سالہا سال بیٹھے
تھے۔ پہلی ہی ملاقات پر سلسلہ گفتگو کے بغیر جان محمد بٹ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا مفتی صاحب!
آپ پاکستان کا فکر نہ کیا کریں۔ پاکستان کا فکر کرنے کے لیے بہت سے بزرگ موجود ہیں۔ یہ جو
پردہ کر کے لیٹے ہوئے ہیں، (انھوں نے سائیں اللہ بخش کے مزار کی طرف اشارہ کر کے کہا) یہ
ساری عمر کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ موت کا تو انھوں نے سوانگ رچا رکھا ہے۔
سو مفتی صاحب، آپ پاکستان کا غم نہ کھائیں۔ آپ صرف یہ کریں کہ ہر کام کرتے وقت سوچ
لیا کریں: میں کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہا جو پاکستان کے مفاد کے منافی ہو۔ یہی کافی ہے۔
”اے! میں نے سوچا“ اس لمبے تڑنگے غیر بزرگ شکل کے آدمی کو کیسے پتا چل گیا کہ پاکستان

میرے شالوں پر جزیرے کے بڑھے کی طرح سوار ہے۔

پھر چند ایک دنوں کے بعد جناب جان محمد بٹ سے گفتگو کے دوران میں نے پھر تقسیم کی بات پھر طرہ دی۔ میں نے کہا ”اچھا پاکستان ہے یہ جس کے قیام پر سرحدوں پر لاکھوں مسلمان شہید کر دیے گئے۔“ بٹ صاحب مسکرائے۔ بولے ”معنی صاحب، اگر آپ کوئی ملک بنائیں تو اس کی حفاظت کے لیے سرحدوں پر گارڈز کا دستہ متعین کریں گے یا نہیں؟“

”ضرور کریں گے“ میں نے کہا۔

”تو یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ نے اس مملکت کی حفاظت کے لیے اس کی سرحدوں پر لاکھوں شہیدوں کا دستہ متعین کر دیا۔ شہید مرنے تو نہیں نا۔ لہذا وہ بہتی دنیا تک ہماری حفاظت کریں گے۔“

یہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔

”دیکھیے نا“ وہ بولے ”ان افراد کو شہادت کا درجہ نصیب ہوا اور میں ایک حفاظتی فورس میسٹرائی۔ آپ کما س پر کیا اعتراض ہے؟“

جان محمد بٹ کی باتوں نے میرے دل میں پاکستان کی امتیازی حیثیت کے احساس کو دوچند کر دیا، لیکن یہ امتیاز کیوں؟ کس لیے؟ کا عقدہ نہ کھلا۔ جب بھی میں ان سے کیوں؟ کس لیے، پوچھتا تو وہ مسکرا کر کہا کرتے ”معنی صاحب، آپ اللہ کی باتوں میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ وہ مالک ہے۔ جو چاہے، سو کرے۔“

جان محمد بٹ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے ”معنی صاحب، مستقبل کی کھڑکی سے جھانکنے کا شوق چھوڑ دیجیے۔ کیا فائدہ۔ اگر جانا ہی ہے تو سرکار قبیلہ کی نظمیں جو ہیں۔ ان میں مستقبل کے واضح اشارے موجود ہیں۔“

سائیں جی کی نظموں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے چار باتوں کا پتا چلا :

- ۱۔ مملکت پاکستان کو حیران کن وسعت حاصل ہوگی۔
- ۲۔ اس سلسلے میں شاہ ایران کوئی اہم کردار ادا کریں گے۔

۳۔ پاکستان کی خداداد مملکت ایک روزِ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنے گی۔

۴۔ اور پھر نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں میرا ایک دوست لالینڈ سے آیا اور کہنے لگا کہ لالینڈ میں ہیگ کے قریب ایک گاؤں میں اسلامی کتابوں کی ایک عظیم لائبریری ہے، جس میں مطالعہ کرتے ہوئے ایک کتاب میری نظر سے گزری، جس میں لکھا تھا کہ شاہ تری طبع نے دو ڈھائی سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے قدموں میں ایک شہر آباد ہوگا، جو دنیاۓ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ ان کوائف سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں کوئی اہم خدمت ادا کرنی ہے۔

ایک تو میرے سر پر پاکستان کا بھوت سوار تھا، دوسرا نشاۃ ثانیہ کا سوار ہو گیا۔ یہ نشاۃ ثانیہ کیا چیز ہے، بھلا؟

تقریباً دس برس کی بات ہے کہ اسٹراٹوجی پڑھتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ مغرب کے ماہر فلکیات ایک گولڈن ایج کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ "ارے! یہ گولڈن ایج کیا چیز ہے؟" میں نے سوچا۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ مغربی ماہر نجوم اس بات پر متفق ہیں کہ کمرۂ زمین پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب زمین پر اطمینان، سکون اور امن کا دور دورہ ہوگا۔ نہ جنگ و جدل ہوگی نہ لڑائی بھگڑے۔ بس امن ہی امن ہوگا۔ شرم ختم ہو جائے گا۔ غیر ہی خیر رہ جائے گی۔

ان مشاہیر کا کہنا ہے کہ کمرۂ زمین پر ایسے ایسے اور اتنے سارے مثبت اور مبارک سیاروں اور ستاروں کا اکٹھا ہورہا ہے جو آج تک کبھی نہیں ہوا۔

ان سیاروں اور ستاروں کا اثر سارے کمرۂ زمین پر پڑے گا، اور یہ اثر اتنا صالح اور مبارک ہوگا کہ انسان کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ تاروں کے یہ جھرمٹ کئی ایک سالوں سے زمین کی جانب بڑھ رہے ہیں، اور ۱۹۸۰ء میں ان کا اجتماع مکمل ہوجائے گا

اور دنیا پر اثر انداز ہونا شروع ہوگا۔

اس تفصیل کو جاننے کے بعد ایک اور بات میرے ذہن میں کوندی۔ ۱۹۸۰ء عیسوی کا مطلب بھری کی پندرہویں صدی کی ابتدا ہوئی۔ پچھن میں سُندا آیا تھا کہ چودھویں صدی میں حد ہو جائے گی۔ بے حجابی کی حد۔ لادینیت کی حد۔ ہر بات کی حد میں نے پندہ ہوں صدی کی بات کبھی نہیں سنی تھی۔ تو کیا بھری کی پندرہویں صدی میں حدیں ٹوٹ کر نئی زندگی شروع ہونے والی ہے؟

ہر مذہب کے لوگ نشاۃ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بڑی بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔ عیسائیوں کو یقین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ یہودی کا ایمان ہے کہ اللہ وہ سارے وعدے پورے کرے گا جو اس نے بنی اسرائیل سے کیے تھے۔ ہندو رام راجہ کے منتظر ہیں۔ مسلمان جناب مہدی زمان کے دوبہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

رہا سائنس کا رویہ تو جدید سائنس خود اس خیال کی حامی ہے کہ ہم ایک نیا موڑ مڑنے والے ہیں۔ ہمارے سامنے نئی نئی کھڑکیاں کھلتی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سپیس ہم پر حیران کن حقائق کا راز کھولنے کے لیے بے تاب ہے۔ کیا تا کہ حقیقت کُل سپیس کی کھڑکی سے بھانک کر ہمیں کائنات کا راز بتا دے۔

بڑی نڈر سل نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا :

”میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ سب باتیں کہ ڈالوں جو میرے دل کی گہرائیوں میں چھپتی ہیں، لیکن جنہیں میں کہ نہیں پایا۔ جو جذبات سے نہیں بلکہ زندگی کے اس جھونکے سے تعلق رکھتی ہیں جو دروازے کسی بے نام مقام سے آتا ہے اور ہم انسانوں کی زندگی کو عظیم خوف سے بھر دیتا ہے، اور غیر انسانی مخلوق کی بے رحم اور بے انتہا طاقت کی خبر دیتا ہے“

ڈی چادر ڈن کا کہنا ہے ”کاسمک قدروں کے حوالے سے جدید فزکس ہمیں یہ سبق پڑھاتا ہے کہ صرف محیر العقول ہی سچائی کے قریب ہو سکتا ہے۔“

جسے بی ایس ہالڈین کہتا ہے "صرف یہی نہیں کہ حقیقت ہمارے اندازے سے زیادہ محیرِ العقل ہے، بلکہ اس قدر محیرِ العقل ہے کہ ہمارا تخیل بھی دہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔" نیوکلیر فزیشنسٹ چارلس مارٹن کا کہنا ہے "جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا سائنسی علم روایتی سائنس کے خطوط پر نہیں چلے گا۔ اُنٹادہ ان تصورات پر مبنی ہوگا جنہیں ہم اس وقت ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں۔"

لوی پاؤل کا کہنا ہے: نئے سائنسی حقائق ابھی چند خواص تک محدود ہیں۔ اگر وہ انہیں ظاہر کر دیں تو لوگ انہیں پاگل سمجھیں گے۔

لوی پاؤل اور جیکسن برجر اپنی کتاب "اسپائل پاسی بلی ٹیز" میں ان کھڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو آج سپیس کے افق پر کھل رہی ہیں، نشاۃ ثانیہ کے بارے میں لکھتے ہیں جس طرح سولہویں صدی میں احیائے علم کا دور شروع ہوا تھا، اسی طرح آج ہم ایک نئے احیائے علم حقیقت کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج ہیومنیشٹک کلچر کی بنیادیں لڑکھڑاہی ہیں۔ اُنیسویں صدی کا علم دم توڑ رہا ہے۔ آج ہم کا سماں میں ایک نئی سمت کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ کل تک روایتی علوم کی جن حدوں نے ہمیں جکڑ رکھا تھا آج ہم وہ حدیں توڑ رہے ہیں۔ ہم میں ایک نئی بیداری کھڑی ہے۔ ہم حیران کن حقائق کی طرف رواں دواں ہیں، جہاں بعید از امکان امکانات نظر آتے ہیں، جن کے تحت انسانی ذہن میں ایک عمیق اور عظیم انقلاب آنے والا ہے، جس کے زیر اثر انسانی ذہن میں تخلیق کے عظیم راز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ آئیے، ہم سب انسان کے اس نئے جنم کا انتظار کریں۔"

ادب اور ادیب

ادب کی سب سے بڑی قسمتی یہ ہے کہ اس کا نام ادب رکھ دیا گیا ہے۔
اس نام میں ایک دھونس ملغوف ہے کہ خبردار! بے ادبی نہ کرنا۔ نتیجہ یہ ہے کہ
ادب پر اخلاق کا ہیڈ کاسٹبل بٹھا دیا گیا ہے۔

مجھے اخلاق کی اہمیت سے انکار نہیں۔ وقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اخلاق کا کوئی واضح
تحقیق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اخلاق ایک اپانج ہے جو سماروں کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہذا
ادب پر اخلاق کے اجارہ داروں کی اجارہ داری ہے۔

مذہب کہتا ہے، میں اخلاق کا سربراہ ہوں۔ میرے بغیر اخلاق ایک بے جان چیز ہے۔
چلو، یہ بھی ماننے لیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مذہب خود ایک جنگی غلام کی طرح ہے
جسے صدیوں سے کوڑے مار مار کر اچھا خادم بنو کی تلقین کی جا رہی ہے۔

نیم عالموں اور ملاؤں نے صدیوں سے مذہب پر ذین کس کر سواری کر رکھی ہے۔ ذاتی
وقار اور اقتدار کے حصول کے لیے انھوں نے مذہب کو ایک حربے کی حیثیت دے رکھی ہے، لہذا
اخلاق خود مذہب کی نہیں بلکہ مذہب کے اجارہ داروں کے گھر کی لونڈی ہے۔ اخلاق وہ ہے جو
انھیں گوارہ ہے۔ جو ناگوار خاطر ہے، بد اخلاقی ہے۔

رسم و رواج کہتے ہیں، اخلاق ہماری گود میں پلا ہے۔ ہم نے اس کا منہ دھلایا ہے۔
اس کی آنکھوں میں کاہل لگایا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس پر ہماری چھاپ لگی ہے۔ ہماری
چھاپ نہ ہو تو مال جھلی ہے۔

یوں اخلاق کے اجارہ داروں نے تخلیق کرنے والوں پر پابندیاں لگا رکھی ہیں: اپنے کرداروں کو اُجھے کپڑے پہناؤ۔ ان کے برتاؤ کو رسم کی سُہری زنجیروں سے سجاؤ۔ کہیں جوجی چاہے مگر یہ طاہرہ نمونے پائے کہ وہ اخلاق کی حد بندیلوں سے باہر نکلنا چاہتے ہیں عرصہ قلم کو مضبوط سکھاؤ، ادب نگاہوں کو اگر ادب کا نام تخلیق ہوتا تو تخلیق کار پر پہرے دار نہ بیٹھے ہوتے۔ تخلیق کار نے منظر کشی کی۔ بوللا:

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ حقّہ پی رہا ہے۔

اخلاق کے اجارہ دار چونکے۔ کیا کہا؟ باپ حقّہ پی رہا ہے؟ بے شک باپ حقّہ پیتے ہیں۔ انھیں حقّہ پینے کی عادت ہے۔ لیکن باپ کا حقّہ پیتے ہوئے دکھانا مستحسن نہیں۔ باپ کو اس حرکت کا سزاوارد دکھانا اخلاق کے منافی ہے۔ لوگ کہیں گے کہ تبرک باپ ہوتے ہوئے بھی بد بخت حقّہ پیتا ہے۔ بچے پر کیا اثر مرتب ہوگا؟ بچے میں خوف پیدا ہو جائے گا کہ بڑا ہو کر مجھے باپ کی چلیں بھرنی پڑیں گی۔

جدید دُور کے علم بردار بولے ”حقّہ پینا ایک غلیظ اور فرسودہ رسم ہے۔ ایسی فرسودہ باتوں کو اُچھالنا ادب کی شاہ راہ پر بیٹھ کر گندے پوتڑے دھونے کے مترادف ہے۔ ہاں! اگر باپ حقّے کی جگہ سگریٹ پیے تو کوئی مضائقہ نہیں“

حفظانِ صحت والے چونکے۔ بولے ”نہ نہ نہ۔ باپ کو سگریٹ نہ پلانا۔ بچہ کیا کہے گا کہ میرا باپ حالاتِ حاضرہ سے اس قدر بے خبر ہے۔ اسے اتنا ہی پتا نہیں کہ سگریٹ پینا کینسر پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ہاتھ میں سگار تھما دو“

نتیجہ یہ ہے کہ ایہوں کی کیفیت ہمیشہ سے ایسپ کے افسانے کے اس باپ اور بیٹے کی سی رہی جو گدھا بچنے کے لیے گاؤں سے شہر کی طرف عازم سفر ہوئے تھے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ کسی مسخرے نے تخلیق کا نام ادب رکھ دیا۔

آپ کہیں گے، یہ مفتی ادب کے پردے میں کیا طوطا مینا کی کہانیاں لے بیٹھا۔ یقین کیجیے یہ طوطا مینا کی کہانیاں آپ بیتوں سے اخذ کی گئی ہیں۔
جن دنوں مجھے مختصر افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔

برسبیل تذکرہ ان دنوں مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں ادب لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان دنوں ادب کا لفظ پنجاب میں رائج نہیں تھا اور ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ یہ لڑکچہ ہے۔ ان دنوں میں اس لیے لکھنے پر مجبور تھا کہ اتفاقاً میری پہلی تحریر پرتالی بھی تھی۔
میں تالی کا جھوکا تھا۔ گھر میں کوئی درخور اعتناء نہ سمجھتا تھا۔ چونکہ ڈپوک اور شرمیلہ تھا، لہذا محلے کا کوئی ہم عمر مجھے ساتھی بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکول میں نالائق ہونے کی وجہ سے کسی گنتی شمار میں نہ تھا۔ ایسے حالات میں ایک بار تالی کی آواز سن کر اسان کھو بیٹھا۔ ایک بار سنی ہے دوسری بار سُننے کی ہوس ہے۔“

اگر اس وقت مجھے پتا چل جاتا کہ ادب میں پاؤں دھر رہا ہوں تو ڈر کر بھاگ اُٹھتا کیونکہ ان دنوں ادب میرے لیے ایک دھونس تھی۔

گھر سے دن رات آبا آتی کی آوازیں سُنی دیتیں : با ادب ! باطاحت ! ہوشیار !
محلے کے چوگان سے بڑے بُڑھے گزرتے تو ان کے کھنکھار چلا چلا کر کہتے ”با ادب ! ہوشیار !“
سکول میں اساتذہ کی شعلیں لگا ہی خبردار کرتی رہتیں۔

جن دنوں مجھے افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔ خوش قسمتی سے مدرسے میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ مگر اُدھر جریڈوں میں ممتاز مفتی چھپتا تھا۔ چونکہ لوگوں سے ملنے کی عادت نہ تھی اور ادبی محفلوں میں نہ جاتا تھا، اس لیے عرصہ دراز تک پردہ بڑا رہا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ماسٹر ممتاز حسین افسانے لکھنے کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پہلی مرتبہ جب یہ راز آشکار ہوا تو مدرسے کے اساتذہ ہسکا بکا رہ گئے۔ پھر وہ

ازراہ ہمدردی و فدائی صورت میں میرے پاس آئے۔ کہنے لگے ”میاں، جو ہوا سو ہوا۔ ہم اس کا تذکرہ نہیں کریں گے، بشرطیکہ تم آئندہ سے توبہ کر لو، ورنہ اگر ہیداسر صاحب کو پتا چل گیا تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی“

ایک بولا ”بھائی صاحب، یہ میدان ادب ہے۔ اس میں چھوئیں نہ چلاؤ۔“
دوسرا بولا ”یہ آج کے افسانے جو ہیں، یہ ادب نہیں، خرافات ہیں۔ بے ادبیاں ہیں۔“
تیسرا بولا ”اگر ضرور ادب ہی لکھنا ہے تو اخلاقیات پر لکھو، اسلامیات پر لکھو۔“
چوتھا بولا ”اگر بچوں کو پتا چل گیا کہ تم ان خرافات کے مصنف ہو تو ان کے دلوں میں تمھاری کیا عزت رہ جائے گی؟ ذرا سوچو۔ اور اگر بچوں کے والدین کو پتا چل گیا تو وہ اپنے بچوں کو اس مدرسے اٹھائیں گے۔“

پھر ان میں سے دوا ایک، جنھوں نے ممتاز مفتی کی تحریروں کو پڑھا تھا، میرے افسانوں کے ”باپ حق پر رہا ہے“ گنوا نے لگے۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بات نکل گئی۔
ہیداسر نے کہیں بنا کر ایس۔ ایم شریف کو بھیج دیا جو ان دنوں ہمارے انپکڑ تھے۔
ایس۔ ایم شریف کے میرے والد سے مراسم تھے۔ انھوں نے آبا کو خط لکھا۔ گھر جو پٹے ہی اجنبیت سے بھرا ہوا تھا، اب غم و غصہ سے بھر گیا۔

ادھر شریف نے سرکاری طور پر طلب کر لیا۔ پہلے تو ڈانٹتے رہے کہ اگر طلباء کے اخلاق کے رکھوالے خود ادبی بے اخلاقی کا پرچار کرنے لگیں تو تعلیم و تدریس کا کیا بنے گا؟
آخر میں مسکرا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ”بھئی، اگر لکھنا ہی ہے تو انگریزی میں لکھو۔
لٹریچر لکھو۔ اردو میں ادب کیوں لکھتے ہو؟“

اس بعد میری سمجھ میں آیا کہ لٹریچر اور ادب میں کیا فرق ہے۔

آج کا نوجوان ادیب سمجھتا ہے کہ پرانے ادیبوں نے حقائق سے منھ موڑے رکھا اور وہ ادب میں اخلاق، رسوم اور مذہب کی فروعات کے نرم اور خوشبودار جھاگ سے بلبے

بناتے رہے۔ لائٹ محفلیں باتوں سے قاری کو بھراتے رہے۔ منافقت کے سہرے جل بھاتے رہے۔ لیکن کچھ پروا نہیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ میں انقلاب کا نعرہ لے کر آیا ہوں۔ میں پُرلے وقیانوسی ادب کو رد کر کے انقلابی ادب کی داغ بیل ڈالوں گا۔

۱۹۳۶ء میں میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ مجھے خدا نے پُرلے بُت توڑنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مجھ سے پہلے آنے والے ادیب منافقت کا شکار تھے۔ حقائق کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ میں کہا کرتا تھا "میں آگیا ہوں۔ مگر تھام کے بیٹھو"۔ مجھے یقین ہے کہ ۱۹۳۶ء کا ادیب بھی میں میں کرتا ہوا ایوانِ ادب میں داخل ہوا تھا۔

آج پرانے ادیب نئے ادیبوں پر ہنستے ہیں۔ کیا پدی کیا پدی کا شور با۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مستند ادیب کی مسند پر بیٹھ کر سامنے استادہ نئے ادیب پر ہنسون۔ لیکن جب ہنسنے لگتا ہوں تو مجھے ۱۹۳۶ء کا نانا یاد آ جاتا ہے جب مستند ادب پر بیٹھے ہوئے سکے بند ادیب مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔ میری ہنسی کا فوراً ہوجاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ادیب کون ہے؟ کیا ہے؟ سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ادیب وہ ہے جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے اور وہ اس انداز سے کہنا جانتا ہے کہ بات پہنچ جائے۔ کہنے کے لیے ادیب کے پاس کچھ ہونا ضروری ہے۔ ایک زاویہ نظر ہو۔ ہٹ کر۔ منفرد۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سیانے کہتے ہیں کہ اس لیے ضرورت ہے کہ حقائق جو ہرست قریب ہیں، مانوسیت کی ادلی میں آجاتے ہیں۔ یقیناً جانیے مانوسیت ایک بہت بڑا پردہ ہے، بہت بڑا بہت دبیر۔

ہمارا ج ایک تقریب میں باہر جانے لگے۔ محل سے باہر نکلے تو دفعۃً انھیں یاد آیا کہ بگڑی پینتا تو وہ بھول ہی گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھی اہلکاروں سے فرمایا "بھئی، سر پر بگڑی رکھنا تو ہم بھول ہی گئے"۔ ساتھی اہل کار، جو ادب سے سر بھکاٹے کھڑے تھے، بھل گئے

بھلے محل میں گئے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ہمارا ج کی پگڑی نہ ملی۔ واپس آئے۔ عرض کی "ہمارا ج پگڑی اندر تو نہیں"۔ اسی وقت کسی نڈر چوب دارہ کی نظر ہمارا ج کے سر پر پڑی۔ اس نے چلا کر کہا "ہمارا ج، پگڑی تو آپ کے سر پر ہے"۔

ہمارا ج نے دونوں ہاتھوں سے پگڑی کو ٹٹولا اور پھر خوش ہو کر فرمایا "اچھا کیا جو تم نے ہمیں یاد دلایا ورنہ ہم تقریب میں ننگے سر ہی جا پہنچتے"۔

میری دانست میں وہ نڈر چوب دارہ جس میں اتنی جرات تھی کہ ادب اور احترام کے باوجود گردن اٹھا کر ہمارا ج کے سر کی طرف دیکھ سکے، ادیب تھا۔

ادیب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو یاد دلاتا رہے کہ جناب والا، ٹوپی تو آپ کے سر پر ہے۔ اور یوں انھیں ننگے سر گھومنے پھرنے سے بچالے۔

عالم صرف سوچتا ہے اور اپنی فکر کو پیش کر دیتا ہے۔ عالم کا پیغام ذہنوں تک محدود رہتا ہے۔ ادیب میں ایک ٹرانسفارمر لگا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ اپنی سوچ کو جذبات کی بھیٹی میں جھونک دیتا ہے۔ پھر وہ شدت کے الاؤ سے بھٹی گرتا ہے۔ اور گرتا ہے۔ دل جلا کر گرتا ہے۔ حتیٰ کہ فکر جذبات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اسے ٹرانسمیٹ کرتا ہے۔ اس لیے ادیب کا پیغام دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

بہر طور، ادیب میں شدت کا ہونا لازم ہے۔ شدت کی کیفیت یوں سمجھ لیجیے کہ بڑک کھڑا ہے، لیکن ابجن چل رہا ہے۔ یا یوں کہ گاڑی کو پہلے گیٹر میں ڈال کر آپ ۶۰ میل کی رفتار پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ادیب کو دوسروں کا دُکھ اپنا نا اور بیتنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک من دُکھ سہیں تو تحریر میں صرف ایک توہ دُکھ ٹرانسمیٹ کر سکتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ادیب ایک تو شدت کا شکار ہے، دوسرے دُکھ کا۔ اور تخلیق ایک دُکھ بھرا عمل ہے۔

تخلیق کے کرب سے بھرے ہوئے عمل میں قدرت نے کیفیت کی ایک شمع روشن کر دی ہے۔ کیفیت کی یہ شمع انعام نہیں بلکہ ایک جال ہے کہ پھنسی ہوئی پھیلیاں نکلنے نہ پائیں۔ لیکن آپ کہیں گے یہ کیا تماشا ہے کہ میں ایک دم شدت سے دکھ پر آپہنچا ہوں یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ شدت بذاتِ خود دکھ ہے، چاہے وہ خوشی کے جذبات کی شدت ہو یا غم کے۔

سوال یہ ہے کہ شدت کیا ہے؟ شدت ایک بلیک ہول ہے جس میں بمشکل بیس آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے لیکن جس میں ۱۲۰ آدمی چٹخوس دیے گئے ہیں۔ شدت اس موٹر کار کے مصداق ہے جسے فیسٹ گیئر میں ڈال کر ۸۰ میل کی رفتار سے چلایا جا رہا ہو۔ سرکس کے اس بوڑھے شیر کے مصداق ہے جسے کوڑے مار مار کر تندی پر اُبھارا جا رہا ہو۔ نفسیات کے مطابق خوشی ایک سطحی جذبہ ہے جو زندگی کے حق و باطل میں دھانسیاں ڈال کر دور دور بکھرے ہوئے نخلستانوں کی حیثیت رکھتا ہے، اور باقی چاروں جانب پھیلی ہوئی ریت ہی ریت، دکھ ہی دکھ۔

ادیب وہ احمق ہے جو شدت کی محفّی تپانے بیٹھا ہے۔ جو شدت کے بلیک ہول کی گھٹن میں زندگی گزار رہا ہے۔ جو اپنے جسم کی مشین کو پہلے گیئر میں ڈال کر اسے ۸۰ میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے۔

یہ سب کس لیے؟ کس خوشی میں؟ کیا شہرت کی ایک تالی کے لیے جو کبھی مسلسل نہیں بجتی؟ کیا تخلیق کے کیفیت کے لیے جو انعام نہیں بلکہ ایک جال ہے؟ ہم کیوں فریب کھائے جانے پر مصر ہیں؟ ذرا سوچیں تو ہماری کیفیت بالکل ایسے ہے کہ :

نہ پوچھ حال، میں وہ چوبِ خشکِ صحرا ہوں

لگا کے آگ جیسے قافلہ روانہ ہوا

ان وجوہات کی بنا پر میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے

اس جہنم سے اپنے آپ کو بچالو۔ اس ادب بازی سے توبہ کر لو۔ اب بھی وقت ہے۔ ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے۔

میں خصوصاً نوجوان ادیبوں سے اپیل کرتا ہوں کہ یہ تالی جس کی اُمید پر آپ "میں" کہہ کے بڑے طعراق سے ایوانِ ادب میں داخل ہو رہے ہیں تاکہ اپنے آپ کو قربانی کا کبرا بنائیں، یہ تالی بہت ہنگی پڑتی ہے بہت ہنگی۔ اول تو یہ تالی بجتی نہیں۔ بچ جائے تو جلد ہی رگ جاتی ہے مسلسل نہیں بجتی۔ اور پھر آپ میری طرح اس تالی کو سننے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔

لیکن ٹھہریے۔ ابھی تو میں نے صرف شدت کی وضاحت کی ہے۔ ابھی میں نے شدت کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔

موٹی بات کہ دول۔ اگر آپ شدت زدہ ہیں یعنی ادیب ہیں تو میگم سے آپ کی کبھی نہیں بنے گی۔ ہمیشہ اُن بن رہے گی۔ ماں باپ سے نہیں بنے گی۔ ہم کا بدل یہ نہیں بنے گی۔ افسردہ سے نہیں بنے گی۔ کسی سے نہیں بنے گی۔ ظاہر ہے اگر آپ شدت کے کوڑ پر سوار ہیں تو پیدل چلنے والوں سے آپ کا کیا واسطہ۔

صرف افراد کی بات نہیں، بذاتِ خود زندگی سے آپ کی ہم آہنگی نہیں ہوگی۔ اگر آپ میں شدت ہے تو آپ کی حیثیت ایسی ہے جیسے دال میں "کوکرٹو" ہوتے ہیں۔ وہ دانے کو کبھی نہیں گلے۔ جن میں گلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر آپ میں شدت ہے تو آپ میل ایڈجسٹڈ ہیں۔

انگریز بڑا سیانا تھا۔ اس نے ایک خفیہ اصول مرتب کیا تھا کہ ادبی طبیعت کے لوگوں کو سول یا ملٹری کے بڑے عہدوں پر فائز نہ کیا جائے۔ اس اصول کو عملی شکل دینے کے لیے اس نے پرنسپل ٹیسٹ ایجاد کیے تھے اور شرط لگا دی تھی کہ اُمیدواروں کو یہ ٹیسٹ دیے جائیں۔ ان ٹیسٹوں میں دل کے ساتھ پیردوں میں دبی ہوئی شدت اپنا پتا دے دیتی تھی۔

انگریز نے چناؤ کرنے والے بورڈ کو تاکید کر دی تھی کہ کوئی نالائق امیدوار پاس ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن خبردار! کوئی ایسا امیدوار سر دوسری میں نہ آنے پلے جس کی سرشت میں ادبی شہرت یا ادبی رجحان ہو۔

انگریز کا یہ اصول آج بھی رائج ہے۔ پہلے جان بوجھ کر رائج تھا۔ اب شاید ان جانے میں رائج ہے۔ لیکن ٹھہریے۔ ہو سکتا ہے حکومت کو اس اصول کا علم ہو اور حکومت نے اس لیے اسے منسوخ نہ کیا ہو کہ وہ ایسوں کی خیر خواہ ہے، بد خواہ نہیں۔

اس کے باوجود آج بھی کئی ایک ادیب طبیعت لوگ چوری چھپے اونچے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی رجحانات کو کیما فلا نہ کر رکھا ہے۔ ایڈمنسٹریشن اور ادیب طبیعت تو ازل سے دشمن چلے آتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک دوسرے کی مندر ہیں۔ حرکت اور قیام کبھی ساتھ نہیں بن سکے۔ کہتے ہیں گانے والی کا کام نہ چلے تو پان کی دکان کھول لیتی ہے۔ ادیب کا کام نہ چلے تو وہ نقاد بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

آج ادیب کی کیا کیفیت ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی قاری نہیں۔ قاری کی عدم موجودگی میں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے ہم نے جگہ جگہ ارباب ذوق کے حلقے بنا رکھے ہیں۔ ان محفلوں میں ہم من ترا حاجی گویم تو مرا حاجی بگو سے اپنی اتان کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہمارا کوئی قاری ہو بھی تو وہ بد نصیب سراسر مجبور ہے، کیونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے کتاب کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کتاب خریدنا ایک اوسط درجے کے آدمی کے لیے ممکن نہیں رہا۔ چینی کو سب سیدائیز کیا جاسکتا ہے۔ بنا سستی پر کنٹرول ریٹ عاید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کتاب جیسی غیر ضروری چیز منگی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی جریدے نزع کے عالم میں بسک رہے ہیں۔ غصے کاغذ نہیں ملتا۔ کیوں نہیں ملتا؟ تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں البتہ سننے میں آیا ہے کہ

وزارتِ اطلاعات صرف اسے گاڑی تسلیم کرتی ہے جو چلتی ہو۔ اسے نہیں جوڑ چلتی ہو۔ لہذا وہ چلتی ہیں کوٹلا ڈالتی ہے۔ آج کل کے دور میں ادب نہیں چلتا، سیاست چلتی ہے۔ لہذا کاغذ اخباروں کو ملتا ہے۔

ادبی جریدوں کو کاغذ نہیں ملتا۔ بلیک میں خریدنے کی استطاعت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پرچہ چھ چھ مہینے کے بعد نکلتا ہے۔ مجھ سے پوچھیے تو میں اس صورتِ حالات پر بہت خوش ہوں۔ نوجوانوں میں ادبی رجحانات کی بیخ کنی کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟ میرے نقطہ نظر کے مطابق یہ صورتِ حال بہت ہی اُمید افزا ہے۔ ہمیں وزارتِ اطلاعات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ ادبی رسائل کو کاغذ کا کوٹا دینے میں بخل سے کام لے کر اس میل ایلڈ جسٹڈ گروہ کے لیے جسے ادیب کہتے ہیں صحت مند زندگی بسر کرنے کا راستہ ہموار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے بڑی دُور اندیش پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ امداد دینے کے لیے وزارتِ تعلیم نے جو مدد بنا رکھی ہے اس کا نام لرنڈ باڈیز ہے۔ لٹریچر باڈیز کی مدد کا وجود ہی نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب اور علم دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی ٹہم آہنگی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دل اور ذہن ہمیشہ ہی برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

حکومت ادیبوں کی ہمدرد ہے۔ ان کی اعانت کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ لیکن اعانت کے لیے حکومت نے ایک شرط عاید کر رکھی ہے۔ پوری امداد حاصل کرنے کے لیے ادیب پر لازم ہے کہ وہ مر جائے۔ اگر آپ مرنے کے لیے تیار نہیں تو کم از کم خطرناک طوعہ پر ہمارے پڑ جانا ضروری ہے۔ بیمار پڑ جاؤ تو وزارتِ اطلاعات کی سفارش پر ہسپتال اور دوائی کے خرچ کے علاوہ دودقت کی روٹی بھی ملتی ہے۔

یقین جانیے، مرجانا بہت مشکل کام ہے۔ میں کئی ایک برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے ہارٹ اٹیک بھی آننا دیکھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ادیبوں کو پبلشر نہیں ملتا۔ اگر مل جائے تو پبلشر کی ددشرٹیں ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ آپ کی تصنیف نادل ہو۔ اس میں نسیم سحری چلے، پھولی کھلیں، کوئل کوکے اور اس پس نظر پر ہیر داودا ہیر وٹن رومانی مکالموں کے فواریے چلا دیں۔ مجھے ان کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ان کی دوسری شرط بڑی طیر صی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اپنا نام بدل کر فیروزہ خاتون رکھ لوں۔

حفیظ ہوشیار پوری یہ متالیے فوت ہو گیا کہ اس کا دیوان چھپ جائے۔ اور رحمت اچھا کیا اس نے کہ فوت ہو گیا۔ ورنہ دیوان نہ چھپتا۔ میں نے حال ہی میں اپنی ایک کتاب کے بارے میں ایک پبلشر سے بات کی۔ اس نے بڑے ادب اور احترام سے معذرت کر دی کہ ”جناب والا، ہم تو مصنفوں کی چیزیں چھاپتے ہیں، آپ تو مصنفوں کے مصنف ہیں!“ اس کا یہ جملہ میرے دل میں خوشی کے کے اتنے انبار لگا گیا کہ کتاب چھپوانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

محمد طفیل نے مجھ سے کہا ”میری صرف ایک خواہش ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ نقوش کے نظر ثانی شدہ نمبر چھاپ دے۔“ میں نے پوچھا کہ اگر تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ بولا ”پھر میں سکون کی موت مر سکوں گا۔“ میں نے کہا ”بھائی، اگر تم بے سکونی کی موت مرجانے کی زحمت کرو تو ممکن ہے تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ صرف ایک شرط ہے کہ مرنے میں تاخیر نہ کرو۔ اگر تم نے فیصلہ کرنے میں حفیظ جان بھری کی طرح دیر لگا دی تو لوگ نقوش کو بھول جائیں گے۔ پھر موت بھی کام نہ آئے گی۔“

اس مشکل سے نکلنے کے لیے میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اشتہار کے ذریعے اعلان کر دوں کہ جو پبلشر میری کتاب چھاپے اور بیچے گا، اس سے رائٹس وصول کرنے کے بجائے میں خود اسے اپنی جیب سے نقد رائٹس ادا کروں گا۔ صرف پبلشر کی بات ہی نہیں، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئیے اپنے آپ کو زندہ اور چالو رکھنے کے لیے ہم

ریڈیو اور ٹی وی کو بھی اپنے پروگرام کے عوض پیسہ ادا کرنے کی پیش کش کر دیں۔

کئی ایک سال پہلے حکومت پنجاب نے ادیبوں کے لیے مکانات بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر بات حکومت کی سمجھ میں آگئی اور اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا، کہ مکانات ادیبوں کو نہیں بلکہ فعال صحافیوں کو دیے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہیں پھر سے ادیبوں کو مکانات دینے کی بات نہ چل نکلے۔ کہیں ادیب آباد نہ ہو جائیں۔ کہیں ادیب آرام سے دودھ پکھانے نہ لگیں۔ کہیں ادیب کسی گنتی شمار میں نہ آجائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو نوجوانوں کے دلوں میں ادیب بننے کی خواہش بیدار ہو جائے گی اور ان کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔

آخر میں میں آپ سے پھر اپیل کرتا ہوں کہ دوستو، تخلیق کاری کے اس جہنم سے اپنے آپ کو بچالو۔ شدت کے اس تندور سے اپنے آپ کو نکال لو۔ میل اور جمنٹ کے جہنم سے نکلو۔ ادب کے اس بے وقوف دیر نے میں کس اُمید پر بیٹھے ہو، جہاں قاری نہیں، پبلشر نہیں، جریدہ نہیں، ایک تالی کی اُمید پر؟

(حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھا گیا)

کلچر، سیمینار اور ادیب

ہمارے ہاں آج کل کلچر کا تیر تر بول رہا ہے۔ لوگ پوچھ رہے ہیں، کیا کتاب ہے؟ صاحب اور سیکم کہتے ہیں ”کہ رہا ہے، ڈٹائنگ روم سجا، منڈ بگاڑ کر انگریزی بول، منی ہن اور کلچر ڈ بن جا“ سیاست دانوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں ”کلچر ایک ہتھیار ہے جسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے“ نوجوان سے پوچھو تو وہ کہتا ہے ”بال بڑھاؤ، رنگ دار کرتے پہناؤ اور کوکا کولا پیو“ کسی یونیورسٹی سے پوچھو تو وہ کہتی ہے ”گھبراؤ نہیں۔ ہم نے خالص امریکی خطوط پر ریسرچ کا ادارہ بنادیا ہے جو بہت جلد پاکستانی کلچر کا سارا بکھیرا حل کر دے گا“ فلم کاروں سے پوچھو تو جواب دیتے ہیں ”ہم نے پنجابی فلموں میں پنجاب کے کلچر کی وضاحت کر دی ہے۔ اب یہ گاؤں دالوں کا کام ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالیں۔“ وزارتِ تعلیم سے پوچھو تو وہ کہے گی ”ہم نے تو اس کام کے لیے آرٹ کوئٹیں بنادی ہیں۔ اب کوئٹیں جانیں اور ان کا کام، کوئٹوں سے پوچھو تو وہ کہیں گی ”سیدھی بات ہے۔ کلچر کا مطلب ہے قوانین کراؤ، فرانسیسی ڈرامے لکھو اور باہر سے آنے والے ٹرڈ پیر کا زندہ ناچ کراؤ۔ اللہ اللہ خیر سلا“

اہلِ زبان سے پوچھو تو وہ کہیں گے ”میاں کلچر زبان کا ایک جزو ہے۔ اپنے رخ، ق ٹھیک کر لو تو مہذب و متمدن بن جاؤ گے ورنہ ڈھکے کے ڈھکے رہ جاؤ گے“ ادیبوں سے پوچھو تو..... لیکن ادیبوں کو پوچھتا ہی کون ہے؟

وزارتِ تعلیم نہیں پوچھتی۔ بے چاری مجبور ہے۔ چونکہ علم دوست ہے لہذا صرن

لرنڈ باڈیز کی دکان سجاؤ بیٹھی ہے۔ وزارت اطلاعات نہیں پوچھتی۔ شکر ہے نہیں پوچھتی۔ جو پوچھے تو صرف اس خیال سے پوچھے گی کہ ادیبوں سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ آرٹ کو نسل کیوں پوچھے؟ اسے تو صرف آرٹ اور آرٹسٹ سے تعلق ہے۔ آرٹ کو نسل کے نزدیک آرٹ کا مطلب خالص "ماڈ" ہے اور آرٹسٹ وہ ہے جس نے ٹی وی پر رول کر رکھا ہو۔ عالم اور دانشور نہیں پوچھتے کیونکہ ان کے نزدیک علم وہ ہے جس میں سے کتاب کی بو آئے اور جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے اُنٹا اُنٹیں مزید اُلجھا دے۔ شاید اسی لیے تفتین شاہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ پاکستان اور اسلام کو کبھی کسی اُن پڑھنے نے نقصان نہیں پہنچایا۔

آج ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ ہے "کلچر اور ادب"۔ امریکا نے اہم مسائل کو حل کرنے کا جدید طریقہ وضع کر دیا ہے۔ کوئی مل طلب مسئلہ ہو اس پر سیمینار کرادو۔ سیمینار کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو کمرائبر کنڈیشنڈ ہو، دوسرے کلام اور طعام ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لحاظ سے حلقہ ارباب ذوق کا یہ سیمینار خام ہے۔ کیونکہ اس میں خالی کلام ہی کلام ہے نہ کمرائبر کنڈیشنڈ ہے، نہ طعام کی خوشبو آ رہی ہے۔

آپس کی بات ہے۔ کہ دلوں تو کیا ہرج ہے۔ نفسیات کے لحاظ سے ادیب بچے ہوتے ہیں۔ کسی کو کچھ کرتے دیکھ کر محفل اٹھتے ہیں کہ "میں بھی"۔ یہ سیمینار بھی غالباً اسی جذبے کے تحت کرایا گیا ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ سیمینار دوسروں کو دکھانے، غیروں پر رعب ڈالنے یا بڑے آدمیوں کو متاثر کرنے کے لیے کرایا جا رہا ہے۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ صرف اس لیے کرایا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو حوصلہ دیں کہ ہم بھی مٹھ میں زبان رکھتے ہیں۔

حال ہی میں رومانہ کے شہر بخارہ سٹ میں ایک عالمی سیمینار ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے دو بھانڈ بھی جا پہنچے۔ ایک بھانڈ نے دوسرے سے پوچھا :

"یہ کیسا رولا گولا ہے؟"

”سیمینار ہو رہا ہے“ دوسرے نے جواب دیا۔

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”سیانوں کا اکٹھا ہوتا ہے۔“

”اکٹھے ہو کر سیانے کیا کرتے ہیں؟“

”باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے ہیں۔ پھر باتیں کرتے ہیں، پھر کھاتے پیتے

ہیں۔ حتیٰ کہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔“

سیمینار کے متعلق ابنِ انشا اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں :

”دورِ حاضر کی جدید ترین ایجاد سیمینار ہے۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی مشکل ہو، سیمینار

کر لیئے اور بھلے چنگے ہو جائیے۔ سیمینار میں اور بھی کئی ایک خوبیاں ہیں۔ کونسی پڑ بیٹھے بٹھائے

کام ہو جاتا ہے۔ کپڑے بھی میلے نہیں ہوتے۔“

ابنِ انشا نے اپنے کالم میں کھانے پینے کی بات نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ طبعاً وہ

نمک حرام نہیں ہیں۔ بلکہ حق نمک ادا کرنے کے شدت سے قائل ہیں۔ بہ طور کھانا پینا سیمینار

کا ضروری جزو ہوتا ہے۔ جو چاہو کھاؤ پیو۔ چاہے چائے پیو۔ چاہے آتشِ کیم کھاؤ۔ چاہے

کوک پر گزارہ کر لو۔ یا وہ پیو جسے پیے بغیر کلچرڈ ہونے کا دعویٰ جث ہے۔ ہاں تو ابنِ انشا

لکھتے ہیں :

”آج کل سیمیناروں کی ریل پیل ہے۔ کہیں قوم کے حالات پر سیمینار کہیں محقر و

کی ہستات پر سیمینار۔“

صرف بخارِ سٹ میں ہی نہیں ہمارے ہاں بھی اصلی اور ”وڈے“ سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے سیمینار کی طرح دسی اور غیر مذہب سیمینار نہیں بلکہ کلچر ڈ سیمینار ابھی پچھلے عینے ہی انظر کان میں کلچر کے موضوع پر سیمینار ہوا تھا۔ اس سیمینار میں ”زینو“ نے کہا تھا: ”ہمارے ہاں دستور ہے کہ کلچر ہر باتیں ہوتی ہیں۔ مُنہ زبانی باتیں۔ تخلیق نہیں ہوتی۔ کلچر کے ادارے صرف زندہ ناچ گانے کو اکو سرخرو ہو جاتے ہیں۔“

انظر کان کے اس سیمینار کی ردِ مداد پر ابنِ انشا لکھتے ہیں :

”سیمینار میں سوال اٹھا کہ پاکستانی کلچر کیا ہوتا ہے ؟ یہ سوال اٹھا تو اٹھا ہی چلا گیا۔ اسے بٹھانا مشکل ہو گیا۔ جب ملزم بکڑا ہی نہ جائے گا تو اسے سزا دینا کیا معنی ؟ اور بڑے شہروں میں سربفلک آرٹ کو نسلوں کی اہمیت تسلیم، جن میں امیر خاندانوں کی صاحبزادیاں درخ الوقتی کے لیے جمع ہوتی ہیں اور نمائش ہوتی ہے۔ اور نمائش دیکھنے والیوں کو دیکھنے کے لیے لوگ کشاں کشاں پہنچتے ہیں ! دروغ برگردانِ انشا، سیمینار میں حصہ لینے والے محققین کا متفقہ فیصلہ تھا کہ مسئلہ یہ ہے کہ کلچر کی نعمتیں جو آرٹ کو نسلوں میں بنی ہوئی ہیں، انھیں عوام تک کیسے پہنچایا جائے۔“

مجھے اس فیصلے سے پورا اتفاق نہیں۔ یہ درست ہے کہ کلچر کی نعمتیں آرٹ کو نسلوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کس طرح ان نعمتوں کو کلچر کے صمیم داروں یعنی اہل دیہات تک پہنچایا جائے مسئلہ تو یہ ہے کہ کس طرح آرٹ کو نسلوں کی توجہ نعمتوں سے ہٹا کر کلچر کی طرف مبذول کر لی جائے۔ کس طرح انھیں ”ماڈ“ سے ہٹا کر شدھ کا احساس دلایا جائے۔

بُرائے زمانے میں کسی ملک کو زیر اثر لانے کے لیے فوج کشی کی جاتی تھی۔ اسے فتح کر کے کالونی بنالیا جاتا تھا۔ اتنی مصیبت کون کرے ؟ آج کل ایک شارٹ کٹ دریافت کر لیا گیا ہے۔ فوجی حماد کی جگہ کلچر حماد کھول دو۔ گولیاں چلانے کی بجائے کوک بوتلیں چلا دو۔ حسن کے سنگار کا راز افشا کر دو۔ ٹینک کی جگہ جینز چلاؤ۔ مٹی کو حرکت میں لاؤ۔ آرٹ کو نسل کو

”ناڈ“ بنادو۔ آرٹسٹوں کا رُخ ہالی وڈ کی طرف پھیر دو۔

اقتصادی اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے ایلین کلچر نے پاکستان کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ حملہ آور خود محاصرے میں شامل نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے مقامی ایجنٹ جو ہیں شہر ہے۔ آرٹ کو نسلیں ہیں۔ کالا صاحب ہے۔ آسان سا تو کام ہے۔ بس یہی ناکہ دیہاتی کلچر کی تضحیک کرو۔

پھر کالے صاحب کے دد دُپ ہیں۔ بیورو کریٹ ہے جو علانیہ انگریزیت کو اڑھنا بچھونا بنائے بیٹھا ہے۔ بیگم ہے جو تحن کے سنگار کا بھید جاننے کی خاطر میم بنی پھرتی ہے۔ گزشتہ ۲۶ برس سے بڑے بڑے دانشور سوچ رہے ہیں کہ ہمارا کلچر کیا ہے؟ بالکل ایسے ہی جیسے فرنگی فلسفی دیہات کی ایک اُنکوں بھری کچی دیوار کے سائے میں بیٹھا سوچ رہا تھا، سوچے جا رہا تھا۔

دیہات کی ایک بی بی نے پوچھا ”بیبا، تو کیا سوچ رہا ہے؟“
فرنگی فلسفی بولا ”سوچ رہا ہوں کہ بھینس دیوار پر کیسے چڑھی؟“
بی بی نے حیرت سے فرنگی کی طرف دیکھا۔

فرنگی نے کہا ”بھینس نے دیوار پر گوبر کیسے کیا ہے؟“

دیہاتی ہنسی۔ بولی ”تو اتنی سی بات پر ہلکان ہو رہا ہے۔“ پھر اس نے گوبر کا ایک تازہ اُپلا بنایا اور زن سے پھینک کر دیوار پر لگا دیا۔

دانشوروں کی اس سوچ بچار کی نوعیت ”بغل میں کٹورا شہر میں ڈھنڈورائے مصلحت“ ہے۔ جی نہیں مانتا کہ دانشور کٹورے کے وجود سے بے خبر ہیں یا اس کی نشان دہی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دیہات کو اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر دیہات کو اہمیت دے دی گئی تو ان کے ہاتھ میں کیا رہ جائے گا؟

کلچر کو تلاش کرنے کی یہ دوڑ اُردو کو قومی زبان بنانے کی ۲۶ سالہ جدوجہد کے

مترا دت ہے۔ ۲۶ برس سے کیٹیاں بیٹھی سوچ رہی ہیں کہ کس طرح اُردو کو قومی زبان بنایا جائے؟ تجربہ شاہد ہے کہ جس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کیٹیاں بٹھادی جائیں، وہ کبھی حل نہیں ہوتا، کیونکہ کیٹیاں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو کمیٹی کے وجود کا جواز نہیں رہے گا۔

شہر کے لوگ کلچر کا مسئلہ حل نہیں کریں گے۔ سیدھی بات ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا تو شہر کی اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ شہر کے لوگ بیس فی صد ہونے کے باوجود ۸۰ فی صد دیہاتی عوام کے نمایندے بنے بیٹھے ہیں۔ شہر کے ساتھ کلچر اور آرٹ کے وہ ادارے بھی ختم ہو جائیں گے جو کلچر کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ مزید برآں اہل زبان کی عظمت بھی خاک میں مل جائے گی۔ کالے صاحب کے بعد اہل زبان کلچر کے اس کنٹور سے کو دریافت کرنے سے خوف زدہ ہیں۔ اہل زبان کے ہاتھ میں صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے زبان جسے وہ تلوار کی طرح چلانے پر مجبور ہیں۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اُردو کو فرنگی نے اس لیے رائج کیا تاکہ عربی اور فارسی کے اثرات کو رد کیا جائے۔

بہر طور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اُردو ایک درباری زبان ہے جس میں دربارداری کا رنگ ہے۔ چونکہ دربار دار ہے اس لیے بات بڑھا چڑھا کر کرتی ہے۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی ترجمان ہے۔ لورڈز کا ہے۔ چٹ کپڑی ہے، کلاہ اور طرہ سجائے بغیر دم نکلتا ہے۔ جذبات کا شہرہ اتنا گارھا ہے کہ حقیقت نگاری سے جی جڑاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی جڑیں لوک ریت میں پیوست نہیں۔ کیسے پیوست ہوں؟ نوابوں کی لونڈی کو لوک سے کیا واسطہ؟ جی تو اُردو میں نہ کوئی لوک گیت ہے، نہ لوک کہانی۔ اسی وجہ سے اہل زبان خائف ہیں کہ اگر کلچر کا مرکز گاؤں قرار دے دیا گیا تو زبان کے ہتھیار کی دھماکہ کند ہو جائے گی اور وہ نیتے ہو کر رہ جائیں گے۔ لہذا امان اسی میں ہے کہ کنٹور انٹل میں رہے اور تلاش جاری رہے۔ اب سننے میں آ رہا ہے کہ حکومت کی خواہش کے مطابق، کلچر کی ایک الگ وزارت بن رہی ہے۔ گھبراہٹ نہیں۔ اس وزارت میں ادب کا کوئی شعبہ نہیں ہوگا۔ اس میں کلچر ہوگا،

آرٹ ہوگا، سائنس ہوگی اور کھیل ہوں گے۔ ادب نہیں ہوگا۔ آرٹ کونسل نے گزشتہ دو سال میں ثابت کر دیا ہے کہ ادب آرٹ نہیں۔ لہذا ادب یا ادیب سے رابطہ رکھنا کونسل کے شایان شان نہیں۔

آپ کہیں گے یہ ادب کی بڑی بد نصیبی ہے کہ اسے وزارتِ کلچر میں کوئی مقام نہ ملے۔ نہ نہ نہ نہ۔ ایسی بات نہیں۔ نظرِ غائر سے دیکھیے تو آپ پر بھید کھل جائے گا کہ اُنٹایہ ادب کی خوش قسمتی ہے۔ کیونکہ وزارتِ کلچر شہری کلچر کو تقویت دے گی، مغربی آرٹ کو فروغ دے گی اور سچے دیہاتی کلچر کے لیے مزید تحقیر پیدا کرے گی۔ اگرچہ اس کا نام وزارتِ کلچر ہوگا لیکن کام ان عناصر کو تقویت دینا ہوگا جو ہمارے حقیقی کلچر کی زینح کئی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جہاں شکر ہے کہ ادیب اس فریب میں شریک کار نہ ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا وہ کون کون سا ہے جو درپردہ ادب اور ادیب کی اعانت کر رہا ہے؟ ہمیں فریب کاری سے بچانے کے لیے کوشاں ہے؟

ظاہر ہے کہ وہ کسی وزارت کا اہل کار ہوگا۔ اہل کاروں میں بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب موجود ہیں۔ ان میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن وہ کھل کر سامنے نہیں آتے۔ پیالے جمجور ہیں۔ اس لیے کہ حکومت ادیبوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ ہماری حکومت کی ہی بات نہیں، ہر حکومت ادیبوں سے بدظن ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حکومت اور ادیبوں کی ہمیشہ سے ان بن رہی ہے کیا پتا کسی دقت ترنگ میں اگر ادیب کیا کہ دے۔ اسی خطرے سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے تو منکلوں نے دربار میں رتن رکھنے کا رواج ڈالا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ادیب دربار دار بن جائیں۔

سچ پوچھیے تو سارا قصور میرا اپنا ہے۔ کیونکہ میں اہل کار ادیب کے سامنے جھکنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس بات پر ناز ہے کہ مولانا کوثر نیازی نے مجھ سے مسکراہٹیں کرنا کہیں کہیں کہیں۔ حنیف رامے نے ایک بار مجھے فون کیا تھا۔ مسعود مفتی نے مجھے سے پوچھا کہ کیا تھا۔ اور مجھے

فخر ہے کہ مختار مسعود نے میری خاطر ایک اصول توڑا تھا، ایک ادیب سے دفتر میں ملاقات کرنا منظور کیا تھا، دفتر میں ادب پر گفتگو کرنی گوارا کی تھی۔ اور مجھے فخر ہے کہ قدرت اللہ شہاب دوسرے اہل کاروں کے سامنے مجھے کرسی پر بیٹھے رہنے کی اجازت دیتے تھے۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ ادیبوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وزارتِ کلچر میں ادب کا کوئی شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ ورنہ وزارت اس شعبے کو سیکشن افسر کے حوالے کر دیتی اور سیکشن افسر سے آرٹ کونسلوں کے حوالے کر دیتا۔ اور کونسلیں ادیبوں سے قوانین کرواتیں اور کلچر کی خدمت کے لیے ہیں زندہ ناچ گانا بنا دیتیں۔

(یہ مضمون آرٹ کونسل کے سیمینار میں پڑھا گیا)

اشتہار، پی آر اور ادب

اشتہار دورِ حاضر کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اشتہار نے دراصل میس میڈیا سے جنم لیا۔ میس میڈیا بہت بڑی طاقت ہے، جسے برسرِ اقتدار لوگوں نے ایجاد اور رائج کیا ہے۔ میس میڈیا کا کام عوام کی سوچ کو مخصوص رخ عطا کرنا ہے، ایسا رخ جو برسرِ اقتدار لوگوں کے مفادات کے مطابق ہو اور انھیں بڑھاوا دے۔ یہ رخ ایسے انداز سے عطا کیا جاتا ہے کہ عوام کو شک نہیں پڑتا کہ عطا کردہ ہے۔ اُٹا دہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا ہے جو انھوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنا ہے۔

مثال کے طور پر میں خود کو ایک سکے بند دانشور سمجھتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ میں ایک سبکدوش مفکر ہوں۔ اخبارات میں میں صرف ”نیوز“ پڑھتا ہوں ”دیولز“ نہیں پڑھتا، اور حالات کے متعلق اپنی رائے خود قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے نقطہ نظر میں کون کون سا زاویہ عطا کردہ ہے اور کون کون سا میرا اپنا ہے۔ بڑی بڑی اور بہت سی طاقتیں مجھے اپنا زاویہ نظر عطا کرنے کے لیے مصروفِ کار ہیں۔ گھاس کے ڈھیر سے سچ کی سوتی کون تلاش کرے!

رخ عطا کرنے کے کام کی اہمیت اور عظمت شاید اس مثال سے واضح ہو سکے جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پُرانی بات ہے۔ چڑیا گھر لندن کے منتظین نے فیصلہ کیا کہ چڑیا گھر میں ایک بر فانی رکھ رکھا جائے۔ اسے رکھنے کے لیے ایک فراخ کمر تعمیر کیا گیا۔ اسی مشینیں لگائی گئیں جو

کمرے میں وہی ٹمپر پھر قائم رکھتی تھیں جس میں برفانی ریچھ رہنے کا عادی ہوتا ہے۔ کمرے کا فرش غیر ہموار بنایا گیا تاکہ ٹپلتے وقت وہ بیگانگی محسوس نہ کرے۔

انتظامات مکمل کرنے کے بعد ایک برفانی ریچھ مہیا کیا گیا۔ لیکن ریچھ اس کمرے میں چند ایک روز ٹھیک ٹھاک رہا۔ پھر بیمار پڑ گیا اور مر گیا۔ پھر دوسرا ریچھ منگوا یا گیا۔ وہ بھی چند دنوں کے بعد مر گیا۔

منتظین حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب ٹمپر پھر موزوں ہے، کمرہ بھی بہت فراخ اور فرش بھی ناہموار ہے، پھر ریچھ زندہ کیوں نہیں رہتا؟ انھوں نے پشلسٹوں سے مشورے کیے۔ ان کی بھی یہ مسئلہ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کسی نے کہا: سمجھی، اشتہار دے کہ جو شخص اس مسئلے کو حل کرے گا، اُسے انعام دیا جائے گا۔ اتفاق سے وہ اشتہار کسی پبلسٹی ایکسپرٹ کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اس نے جا کر موقع دیکھا۔ منتظین سے ملا۔ کہنے لگا: سیدھی بات ہے۔ ریچھ اس کمرے میں ایٹ ہوم محسوس نہیں کرتا۔ اسے یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ برفانی پہاڑوں میں مقیم ہے۔ لہذا کسی مینٹر کو بلائیے۔ اس سے کہیے کہ کمرے کی دیواروں پر برفانی پہاڑوں کی تصویریں پینٹ کر دے۔ اس کے بعد تیسرا ریچھ سالہا سال اسی کمرے میں بخیر و عافیت اور خوش و خرم رہا۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی کی چار دیواری پر کسی ناکسی ازم کے میڈیا نے اسی تصویریں پینٹ کر رکھی ہیں جن کے سوائے وہ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میڈیا کی طاقت کو محسوس کرنے کے بعد تاجروں نے اس راز کو پایا کہ اپنی مصنوعات کو بیچنے کے لیے وہ میڈیا کے اصولوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لہذا انھوں نے اشتہار ایجاد کیا۔

اشتہار آج کے دور میں بے پناہ طاقت حاصل کر چکا ہے۔ مثلاً پائے کی پتی کے سوداگروں نے سوچا کہ اگر چہ پائے ایک گرم مشروب ہے اور اسے گرم ملکوں میں رائج کرنا

دشوار ہے، لیکن گرم ممالک میں رائج کیے بغیر چارہ نہیں۔ لہذا عوام کی سوچ کو ایسا رخ دیا جائے کہ ان کے لیے چائے قابل قبول ہو جائے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب برصغیر میں طبیب یونانی کا دور دورہ تھا۔ عوام کسی چیز کو استعمال کرنے سے پہلے سوچتے تھے کہ چیز کی تاثیر کیا ہے۔ گرم ہے، ٹھنڈی ہے یا معتدل۔ ان دنوں لوگ لسی پینے کے عادی تھے اور حتیٰ الوسع گرم خشک اشیاء سے اجتناب کرتے تھے۔

ان باتوں کو مدنظر رکھ کر چائے کمپنیوں نے جو پہلا اشتہار جاری کیا وہ یہ تھا:
گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے، لیکن میں اسے ایک عظیم جملہ سمجھتا ہوں۔ اس جملے نے خامی کو ایک ایسا رخ بخش دیا کہ وہ خوشی بن گئی۔ اس جملے کو بار بار دہرایا گیا۔ اتنی بار دہرایا گیا کہ اب بھی جب کبھی شدت کی گرمی پڑتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ ایک پیالہ چائے کا پی کر گرمی کے ڈنک سے نجات حاصل کر لوں۔

اشتہار اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی تک محدود نہیں ہوتا۔ کئی ایک اشتہارات فضا میں چھوڑ دیے جاتے ہیں، جس طرح دیگر کمپنیوں کے اگراسٹ دھواں فضا میں چھوڑتے ہیں۔ کئی ایک اشتہارات زیرِ لبی کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر تقسیم سے پہلے جب جاپان نے اپنے کل پُنڈے نکلے تو انھوں نے یہ دتیرہ اختیار کیا کہ دلایت کی ہر نئی ایجاد کی نقل کر کے اسے کدھی قیمت پر منڈی میں پہنچانے لگے۔ اس پرولایت کے لوگ گھبرا گئے۔ گھبراہٹ کی بات تو تھی، کیوں کہ منڈی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے جاپان کی مصنوعات کی تذلیل کے لیے ایک زیرِ لبی چلا دی کہ ”جاپانی ہے۔“ مطلب تھا کہ ناقابلِ اعتبار ہے، سراسر ہوس، دیرپا نہیں۔

یہ زیرِ لبی اشتہار سرگوشیوں میں چلا اور پھر اس قدر عام ہو گیا کہ لوگ علانیہ کہنے لگے ”ہٹا دیا، جاپانی ہے۔“ پہلے چیزیں جاپانی ہوئیں، پھر خیالات جاپانی ہوئے۔ پھر

افراد کے متعلق کہا جانے لگا کہ جاپانی ہے۔ یعنی جاپانی کا مفہوم مصنوعی سمجھا جانے لگا۔ اگر جاپانی قوم اس قدر ضدی، ہسٹ دھرم اور غصتی نہ ہوتی تو اس زیر لبی اشتہار سے بچ نہ سکتی تھی۔ تحقیر کی اس دھار سے جانبر نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جاپانیوں کا جواب نہیں۔ اتنے بڑے دار کو ناکارہ کر دیا۔ اور دیکھیے آج صنعتی میدان میں جاپانی کس مقام پر نائز ہیں۔ انگریز نے ہندیوں کی تحقیر کے لیے بائو کا لفظ فضا میں چلایا۔ یا جو دراصل ”بیون“ کا مخفف ہے۔ بیون کا مطلب بند رہے۔ اور ملاحظہ ہو کہ ہم آج بھی بائو کہلوانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ میس میڈیا کے اس اشتہاری جوہر کی حیرت انگیز تاثیر کو دیکھ کر پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں نے اسے برتنا شروع کر دیا۔ مثلاً دفتر والوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ کام کرنا اور بات ہے، کام کرتے ہوئے نظر آنا اور بات۔ یعنی کام کرنا اہم نہیں، کام کرتے ہوئے نظر آنا اہم ہے۔ کامی ہونا اہم نہیں، کامی ہونے کا تاثر دینا اہم ہے۔ لہذا انھوں نے دفتر کے کارڈ میں لیں چلنا پھرنا شروع کر دیا جیسے شدت سے مصروف ہوں۔ اور چھٹی کے بعد اپنی میز پر ٹائلیں یوں پھیلانا شروع کر دیں کہ بڑے صاحب گزرتے ہوئے دیکھیں تو سمجھیں کہ کام میں اس قدر شدت سے مصروف ہے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ یہ بھی اشتہار کا ایک انداز ہے۔

یوں لوگوں کو اپنی ذات کے متعلق اشتہار دینے کی عادت پڑی۔ اس روش نے دوسرے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ مثلاً ادیب، شاعر اور فن کار۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ادیب اس روش سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے، کیونکہ ادیب عام لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔

پُرانے زمانے میں لکھنے والے بہت خوش قسمت ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو پنجاب کا ادبی میدان خالی پڑا تھا۔ چار ایک لکھنے والے تھے۔ کمپی ٹیشن کی کوئی صورت نہ تھی۔ میری پہلی کہانی ادبی دنیا میں چھپی۔ مفصلاً احمد

نے وہ کمائی ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ سالانہ میں چھاپی۔ پہلی ہی کوشش پر میں جانا بچانا ادیب بن گیا۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکڑی۔ حالانکہ میں اردو زبان سے قطعی ناواقف تھا، اور ادیب بننے کی نہ تو آرزو تھی نہ اُمید۔ کیونکہ پہلی کمائی بھی میں نے از خود نہیں لکھی تھی۔ مجھے لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اُس دور کے لکھنے والے بڑے خوش قسمت تھے۔ آج کل کے لکھنے والے بڑے بد قسمت ہیں۔ کمپیوٹیشن دوروں پر ہے۔ بھیڑ بہت زیادہ ہے۔ منڈھے مارے بغیر راستہ بنانا دشوار ہے۔ لہذا منڈھ مارنا پڑتا ہے۔ آگے نکلنے کا جذبہ قدرتی بات ہے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے کئی ایک طریقے رائج ہیں۔

سب سے بڑی مشکل تو پُرانے لکھنے والے ہیں جو اگلی صفوں میں دھرنامارے بیٹھے ہیں۔ جب تک انھیں ہٹایا نہ جائے، بات کیسے بنے۔ انفرادی طور پر ایک ایک پُرانے کو ہٹانا تو خاصا مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس لیے سمجھ دار لوگ حکمت عملی کو کام میں لاتے ہیں۔ لہذا ایک زیربلی چلا دی کہ پُرانا ادیب بوسیدہ ہے، بے کار ہے۔ دورِ جدید کے نئے خیالات، نئی حیات اور نئے اشارات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہذا ٹھہل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واقعی کمائی نہ ہو کر دی گئی اور علامتی اور تجربہ دی کمائی نے اہمیت حاصل کر لی، چلو، پُرانے کلہاٹیوں سے تو نجات ملی۔

نئی کمائی میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ وہ نئی ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ جو نئی ہوگی، اس میں تازگی ہوگی۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ چاہے مضمون ہو یا نہ ہو، کوشش بہت ہوتی ہے۔ مضمون نہ ہو تو کوشش اور بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ قاری کو تحقیق پر ابھارتی ہے، ذہنوں میں پُر اسرار حول پیدا کرتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ابہام کو ہتھیار کے طور پر برتی ہے۔ بات کہ بھی دیتی ہے، نہیں بھی کہتی۔ معنی کو دتے داری کے

بھنجھٹ سے بچائے رکھتی ہے۔ بہر حال، نیا پن بہت بڑا اشتہار بن جاتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے نئے لکھنے والے زیادہ ذہین ہیں۔ زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ زود حص ہیں۔ اشتہار کی عظمت سے واقف ہیں۔

پہلے، نئے افسانے کے زور پر پُرپانے لکھنے والے تو راستے سے ہٹ گئے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ نئے لکھنے والے دھڑا دھڑ میدان میں آ رہے ہیں۔ اب اس مشکل سے کیسے نپٹا جائے؟ نئے لکھنے والوں نے اس مشکل کا علاج یہ سوچا ہے کہ گروپنگ کر لو، اور من ٹرا حاجی گویم تو مر حاجی گو کے اشتہار کو کام میں لاؤ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہر محلے میں ایک ادبی انجمن قائم ہو گئی ہے، جس کا کام ساتھیوں کو اُچھالنا اور مخالفین کو گرانہ ہے۔ جگہ جگہ ادبی انجمنیں قائم ہو جانے کی وجہ سے ایہوں کی ایک خصوصی جماعت پیدا ہو گئی ہے، جو کچھ تخلیق نہیں کرتی، صرف مٹھ زبانی تنقید کے بل بوتے پر نام پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ ادبی اجلاس میں عالمانہ اور دانشورانہ رنگ میں باتیں کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ سیدھی بات ہے، اگر آپ مٹھ زبانی گفتگو سے شہرت حاصل کر سکتے ہیں تو پھر تخلیق کے بھنجھٹ میں کیوں پڑیں۔ خوا مخواہ درد نہ مول لینا دانشمندی نہیں پُرانے زمانے میں ادب میں گروپنگ کی بُنیاد ترقی پسندوں نے ڈالی۔ یہ ایک منظم تحریک تھی جس کی پشت پناہی ایک بگ پادر کر رہی تھی۔ انھوں نے اپنے مسک کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے ادب کو ایک ذریعہ بنایا تھا اور اس تحریک کا ایسا نام رکھا تھا جو بذاتِ خود ایک اشتہار تھا۔ میری دانست میں اس سے بڑا اشتہار آج تک تشکیل نہیں دیا جاسکا۔ کہن ہے جو خود کو ترقی پسند کہنا یا کلمونا نہیں چاہے گا؟

لیکن پرانے زمانے کی یہ گروپنگ ایک زاویہ نظر، ایک مسک پر قائم ہوئی تھی۔ آج کل کی گروپنگ زاویہ نظر یا مسک کی محتاج نہیں۔

دیے گروپنگ بڑی لاجواب چیز ہے۔ ایک بار اس کی لت پر جائے تو پھر جاتی نہیں۔

مثال کے طور پر ترقی پسندی کے زلزلے میں کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو اس تحریک سے الگ رہے ترقی پسندوں کو گوارہ نہ تھا کہ کوئی الگ ہے۔ جو الگ رہتے تھے انہیں ترقی پسندی کا حق دینے کے قائل نہ تھے۔ لہذا اس دور میں غیر ترقی پسندوں کی بڑی پٹائی ہوئی۔ اس پر کچھ لوگ حفظِ تقدم کے خیال سے مل بیٹھے۔ یوں ایک گروپ قائم ہو گیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ترقی پسندی کے انعطاف کے بعد یہ گروپ ختم ہو جاتا کیونکہ خطرہ مل چکا تھا، تحفظ کی ضرورت نہ رہی تھی، لیکن گروپ کے سربراہوں کو لیڈر شپ کی چاٹ لگ گئی تھی۔ لہذا یہ گروپ آج بھی قائم و دائم ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو متمول ہونے کی حیثیت سے ادب کو ذاتی اشتہار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے ادبی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ بڑے بڑے ہفتوں میں جلسے کیے جاتے ہیں۔ چائے پیسٹری کے دور چلتے ہیں۔ بڑے بڑے دزیروں اور اہلکاروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ادیبوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ جلسے میں اپنے اپنے مضامین پڑھیں۔ اس پر ادیب فخر سے چھوٹے نہیں سماتے۔ اس طریق کار کو پی آر کہتے ہیں۔ بہر طور دورِ جدید میں یہ رجحان چل نکلا ہے کہ تخلیق کی سروردی کے بغیر ادبی حلقوں میں شہرت اور اہمیت حاصل کی جائے۔ کچھ لوگ اس رجحان پر معترض ہیں۔ لیکن میری دانست میں یہ اعتراض جائز نہیں۔ اس لیے کہ اشتہارِ دورِ حاضر کا امتیازی نشان ہے، اور نئے ادیبوں کو حق حاصل ہے کہ وہ دورِ جدید کے نئے رجحانات کو اپنائیں اور ان سے مستفید ہوں۔

سائنس اور ادب

سائنس کے تین پہلو ہیں :

(۱) سائنس علم ہے۔ اس کے حوالے سے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔

(۲) سائنس ٹیکنالوجی ہے۔ یعنی ایسا علم جسے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کے کافی پہلو کی حیثیت اس قدر اہم اور فعال ہو چکی ہے کہ علم کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی سائنس نے مشین ایجاد کی اور صاحب حیثیت لوگ اسے برت رہے ہیں، اور سائنس ایسی ایجادات کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے جو صاحب حیثیت لوگ اپنے مفاد کے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ اس حیثیت سے سائنس ایک جن ہے جو اللہ دینوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے سائنس ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

(۳) سائنس ایک رویت ہے، ایک ذہنی رُخ ہے، ایک ایٹمی ٹیوڈ ہے جو آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور دانشوروں، یعنی آپ اور میں، ہم سب کے ذہنوں پر بھایا ہوا ہے۔ یہ رویت جسے ہم بڑے فخر سے سینے پر تنغے کی طرح سجاٹے پھرتے ہیں غلط ہے، جھوٹ ہے، مگر اہم کن ہے، جمالت پر مبنی ہے۔

صاحبو! یہ میں نہیں کہہ رہا۔ میری کوئی حیثیت نہیں کہ اتنی بڑی بات زبان پر لاؤں۔ یہ بات جدید ترین سائنس دان خود کہہ رہے ہیں۔

ویسے تو کتابی لوگ ایسی طور پر یہ کہنے کے عادی ہیں کہ ہر علم کے، جسے کام میں لایا جاسکتا ہے، دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خیر کا، دوسرا شر کا۔ لیکن یہ بات کہنے کی بات یہ مضمون قلم قبیلہ کے سیمینار میں پڑھا گیا۔

ہے۔ ہم ایسی ٹھنڈی میٹھی باتیں کر کے خود کو خوش رکھنے کے عادی ہیں۔ بہر طور اس حقیقت کو بھٹلایا نہیں جاسکتا کہ ہمیشہ ہر دور میں صاحبِ توفیق لوگ علم کو برتتے رہے ہیں۔ آج کے دور میں یہ لوگ کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایک با اقتدار طبقہ، دوسرا سرمایہ دار طبقہ۔

با اقتدار طبقے نے سائنسی علوم کو اسلحہ سازی کے لیے برتا۔ برت رہے ہیں سرمایہ داروں نے منافع خوری کے لیے برتا۔ برت رہے ہیں۔ اگر چلتے چلتے اتفاق سے خلقِ خدا کی خدمت بھی ہو گئی تو یہ ایک ضمنی بات ہے۔

سائنسی علوم کے برتتے جانے کا پہلا اس حد تک اہم ہو گیا ہے کہ اسے علمِ کنا میری دانست میں علم کے لفظ کی توہین ہے۔ سائنس، بیماری اب چاکر بن گئی ہے اور سائنس دان مفلوم۔ یادہ بکئے لگے ہیں یا انھیں اغوا کر لیا جاتا ہے۔ طوطی غلامی ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اقتدار پسندوں اور سرمایہ داروں کی ہوس کی تسکین کریں۔ صاحبو! اگرچہ لطیف ہے لیکن حق ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا: ایٹمی ٹیکنالوجی میں روس نے زیادہ ترقی کی ہے یا امریکا نے؟ دوسرے جواب دیا: میرے خیال میں جو جرمن انجینئرز روس کے تحت کام کر رہے ہیں وہ اتنے قابل نہیں جتنے وہ جرمن انجینئرز جو امریکا کے تحت کام کر رہے ہیں۔

جناب والا! یہ آج کے بڑے، جو بڑے کہلاتے ہیں، طاقت کے زور پر بڑے ہیں۔ بے شک بھینس ان کی ہے لیکن انھیں بڑا بننا نہیں آیا۔ ہمارے لیے بڑے کا مفہوم کچھ اور ہے۔ میں ایک بڑے کو جانتا ہوں۔ اسے بڑا مانتا ہوں۔ اس کا عمدہ اتنا اُدنچا تھا کہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہ خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتا تھا۔ کسی کو خود سے کم تر نہیں سمجھتا تھا۔ بڑا ہو کر بڑا نہیں بنتا تھا۔ میں صرف اس شخص کو بڑا مانتا ہوں جو اس بڑے کے نقشِ قدم پر چلے۔

اب یہی سائنسی رویے کی بات۔ میرے موضوع کا سائنس یا ٹیکنالوجی سے آنا

تعلق نہیں جتنا سائنسی رویے سے ہے، اور جس نے آپ کا میرا ہم سب دانشوروں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ اس سائنسی رویے سے مجھے سب سے پہلے برٹینڈرسل نے روشناس کیا۔ کہنے لگا: دوستو، شک کرو۔ ہر بات پر شک کرنا سیکھو۔ شک کے بغیر تم سچائی کو نہیں پاسکتے۔ شک کی تلقین کر کے اس نے مجھے مذہب سے کاٹ دیا۔ روایات سے کاٹ دیا۔ لوک دانش سے کاٹ دیا۔ یوں مجھ پر سائنٹیفک ایٹوڈ کا پالش چڑھ گیا۔ اس وقت یہ خیال نہ آیا کہ مجھے سائنسی رویے پر بھی شک کرنا چاہیے۔ آج بھی ہمارے دانشور اسی سائنسی اور عقلی رویے کو سینے سے لگاٹے بیٹھے ہیں۔ یہ رویہ اُنیسویں صدی کی سائنس کی پیداوار ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ پرانی کیچلی اُتر گئی۔ جس طرح سورج غروب ہونے کے بعد بھی ۱۲ منٹ تک ہم اس کی روشنی دیکھتے رہتے ہیں، اسی طرح ہم اُنیسویں صدی کی سائنس کی روشنی میں جی رہے ہیں۔ خود کو دانش ور سمجھ کر مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں تین بڑے اہم انکشافات ہوئے۔ ہم نے ان انکشافات کو سنا، جانا، مگر مانا نہیں۔ مان لیتے تو ہمیں اپنی ”بیلیف“ کی پرانی حویلی ڈھا کر نئی تعمیر کرنی پڑتی۔ اس لیے ہم نے اپنی آسائش کے لیے نیلن کی طرح اندھی آنکھ پر دو رہیں لگائی اور کہا کہ سامنے کوئی نئی بات موجود نہیں۔ مگن بیٹھے رہو۔ جب حشر کا دن آئے گا، اُس روز دیکھا جائے گا۔ پہلا انکشاف یہ ہوا کہ مادہ اور رُوح دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ٹہنی کے دو پتے ہیں۔ ہم نے دونوں کو الگ الگ دڑیوں میں بند کر رکھا تھا۔ سائنس کو پتہ چلا کہ مادہ صرف مادہ ہی نہیں بلکہ بیک وقت مادہ بھی ہے، انرجی بھی۔ بیک وقت جامد بھی ہے، متحرک بھی۔ اور وہ طرح طرح کے روپ بدل سکتا ہے۔ اس بات نے فزکس کی بنیاد ہی ہلا دی۔ ساتھ بے چاری منطق بھی پٹ گئی کہ کوئی چیز ایک وقت میں یا تو الف ہو سکتی ہے یا ب۔ بیک وقت الف یا ب نہیں ہو سکتی۔ یہ مفروضہ غلط نکلا۔ یعنی دلیل

کی مکر ٹوٹ گئی۔ پھر فرس پر یہ انکشاف ہوا کہ بچی منزلوں کے اصول سائنس کی اد پر کی منزلوں پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ کبھی تو روشنی سیدھی لکیر پر چلتی ہے اور کبھی سانپ کی طرح بل کھانے لگتی ہے۔ پہلے ہی ارسطو نے پتا نہیں کس خوش فہمی کے زیر اثر اعلان کر دیا تھا کہ انسان ریشل انیل ہے۔ کچے سیب کو زعم ہو گیا کہ میں پکا ہوا ہوں، لہذا اسی خوشی میں وہ ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔

اس بھلے آدمی کا مطلب یہ تھا کہ انسان میں ریشل ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ چاہے تو اس صلاحیت کو برت سکتے ہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ انسان اس صلاحیت کو برتنا نہیں چاہتا۔

صاحبو! ہم ریشل نہیں۔ ریشلائز کرنے کے شوق میں مقصد کی گاڑی کو چلانے کے لیے عقل کا گھوڑا آگے نہیں بلکہ گاڑی کے پیچھے جوتے ہیں۔ دینے ہوں تو دو اور دد تین گنتے ہیں۔ لینے ہوں تو پانچ۔

انسان کی سب سے امتیازی خصوصیت عقل نہیں، جذبہ ہے۔ کتابی لوگ کہیں گے جذبات اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی ہوتے ہیں بے شک بُرے بھی ہوتے ہیں لیکن اچھے جذبات کی فراوانی ہے۔ بُرے آٹے میں نمک کی مصداق ہیں۔ بے شک ذائقہ نمک کا عادی رہتا ہے لیکن آٹے کی فراوانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا ایمان ہے انسان کے خمیر میں جب شرفیر پر عادی ہو جائے گا تو زندگی کا دھارا سُوکھ جائے گا۔ ہاں تو، میں مادے کا ذکر کر رہا تھا۔ بیسویں صدی میں مادے کے متعلق نئی باتوں کا پتا چلا۔ پہلے ہم سمجھتے تھے مادہ جتنا بھی ہے، اتنا ہی رہے گا۔ نہ وہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ پتا چلا کہ یہ غلط ہے۔ مادہ آتا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے آتا ہے۔ انوکھے طریقوں سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ مادے کی بارش بھی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ فرس میں یہ کتنا ناممکن ہو گیا کہ فلاں عمل ممکن ہے، فلاں ناممکن۔ یا فلاں اصول اٹل ہے۔ یعنی بے چارے

فرز کس کا پھلکا اڑ گیا۔

دوسرا انکشافِ وقت کے متعلق تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ وقت آتا ہے، جاتا ہے۔ پتا چلا کہ نہ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ وقت ایک اٹل اور دوامی چیز ہے۔ ماضی، حال، مستقبل اس کے تین روپ ہیں جو ہمارے شعور نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ آئن سٹائن کے چیلے اب حال کے سوا کسی روپ کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہی بات صوفی کہا کرتے تھے اور ہم ان پر ہنسا کرتے تھے۔

اگر وقت ایک زندہ اور پابندہ چیز ہے تو ”پری کالگنیشن“ یعنی کشف ایک سائنسی حقیقت ہے۔ اب لوحِ قلم سے انکار کون کرے۔ پھر شعور کی عظمت مسلم ہو گئی۔ تمام ”اکلٹ“ سائنسوں کو جن پر فرز کس ہنسا کرتی تھی، عزت کا مقام حاصل ہو گیا۔ سپرنچرل کا لفظ بے معنی ہو کر رہ گیا۔ کیوں کہ ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارا نیچرل کالکسپٹ غلط ہے، محدود ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے شعور کی اہمیت سامنے آ گئی۔ اندر کا انسان اتنا ہی اہم ہو گیا جتنا باہر کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سائنس اُنیسویں صدی کا چترہ لگائے بیٹھی تھی۔ اُکلٹ سائنسز کو نہیں مانتی تھی۔ اُن دنوں ای ایس پی نے ٹیلی بیجنگی کا شور مچا رکھا تھا۔ فرز کس اس پر ناک بھوں جڑھا رہی تھی۔ کوئی سائنس دان ایسا نہ تھا جو ٹیلی بیجنگی کو آزمانے کے لیے تیار ہو۔

دفعۃً روسی فوج کو سوچھی کر ٹیلی بیجنگی کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ جب فوجی کمیونیکیشن کے دوسرے ذرائع فیل ہو جائیں تو کیوں نہ اسے آزمایا جائے۔ آزمانے کے لیے وسیع قسم کے تجربات کیے گئے۔ کچھ کچھ ٹھیک پایا تو بولے: ہاں، کام لیا جاسکتا ہے۔ ٹیلی بیجنگی کو بحیثیت علم نہیں مانا۔ بحیثیت کام کی چیز مان لیا۔ آج کارووسی تحقیقی سنٹر جو پاداسائیکولوجی پر تجربات کر رہا ہے، اسے علم کی حیثیت نہیں دے رہا بلکہ ہتھیار کی حیثیت

دے رہا ہے۔ لہذا تحقیق کے نتائج کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ صرف پارا سائیکا لوجی کی بات نہیں، سائنس کی جدید ترین دریافتوں کو بھی خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں :

۱۔ ہتھیار کاراز دشمن تک نہ پہنچے۔

۲۔ نئی دریافتیں عوام کے دلوں پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اگر عوام کو پتا چل گیا تو رویتے بدل جائیں گے۔ ذہنوں کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ مذہب مفروضہ کی حیثیت سے نکل کر حقیقت بن جائے گا۔ روحانی دنیا کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ خارجی دنیا کی حیثیت کم ہو جائے گی۔ عقل و دلیل دم دبا کر بیٹھ جائیں گے، اور اللہ میاں برسرِ عام کُرسی پر براجمان ہو جائیں گے۔

بیسویں صدی میں جو تیسرا انکشاف ہوا وہ اہم ترین تھا کہ ہم انسانی ذہن کے صرف دسویں حصے سے کام لے رہے ہیں۔ دس میں سے نو صلاحیتیں خوابیدہ پڑی ہیں۔ اس بات کا پتا لگانا نہ بس ضروری ہو گیا کہ انسان میں کیسی کیسی قوتیں پنہاں ہیں۔ سائنسدانوں کا رُخ خارجی حقائق سے ہٹ کر داخلی کیفیتوں پر مرکوز ہو گیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ دروازے کھلنے والے ہیں۔ پردے اُٹھنے والے ہیں۔ سائنس کا زاویہ نظر بدل گیا ہے۔ نئے علوم سامنے آئیں گے۔ نئی طاقتوں کا ظہور ہوگا۔

دقت یہ ہے کہ سائنس دانوں کا بس نہیں چلتا۔ انھیں علم کی تلاش سے بھوکا جا رہا ہے۔ صاحبِ اقتداران کی آزادانہ تحقیق میں مزاحم ہیں۔ یہ باحیثیت لوگ اور اقتدار پسند ملکوں کے سربراہ نہیں ہیں۔ یہ لوگ سربراہوں کی کرسیوں کی اوٹ میں بیٹھے ہیں کھل کر سامنے نہیں آتے۔ مثلاً مشہور زمانہ ہے کہ انگلستان پر بینکروں کی حکومت ہے۔ امریکا پر یہودی کارخانہ دار قابض ہیں۔ فرانس پر فری میسنرز کی اجارہ داری ہے۔ اس لیے ہم، آپ اور میں اندھیرے میں ہیں۔ اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے اندھیرے میں رہیں گے۔ ہمارا ذہنی رویہ دہی اُتیسویں صدی والا رہے گا اور خود کو دانشور سمجھ کر موچھ مرد پڑتے رہیں گے۔ تو صاف ہوا!

یہ ہے آج کی سائنسی دُنیا کی صورتِ حال۔ میں نے اسے خاصی وضاحت سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم ادب کی ضرورت کا جائزہ لے سکیں۔ سائنسی صورتِ حال کے متعلق مندرجہ ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں :

۱۔ آج کے پڑھے لکھے لوگوں اور ادیبوں کو جدید سائنس کے رجحانات کا شعور نہیں۔
۲۔ ہمارا ذہنی رویہ قدیم سائنس کی بنیادوں پر قائم ہے جو بیشتر غلط ثابت ہو چکی ہیں۔

۳۔ صاحبِ اقتدار لوگ جو میس میڈیا کو کنٹرول کر رہے ہیں، نہیں چاہتے کہ عوام کو جدید سائنس کے رجحانات کا علم ہو۔
۴۔ سائنس دان خود زبان بند ہیں۔
اب ایسے ادب کی بات۔

میں ادب کے مفہوم کی وضاحت نہیں کروں گا۔ کیونکہ نہ تو میں محقق ہوں نہ نقاد۔
الحمد للہ کہ نقاد نہیں ہوں۔ الحمد للہ کہ عالم نہیں ہوں۔ نکتہ دان نہیں ہوں۔ نکتہ چین نہیں ہوں۔ قلم قبیلے کا ایک عام تخلیق کار ہوں۔

سائنس کے متعلق جو گزارشات میں نے پیش کیں وہ میری نہیں بلکہ مستند سائنسدانوں کے بیانات سے اخذ کی گئی ہیں۔ ادب کے متعلق جو گزارشات پیش کروں گا وہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ آپ انھیں مانیں یا نہ مانیں۔ آپ کی مرضی۔ اب سوال یہ ہے کہ سائنس اور ادب میں کیا فرق ہے؟

۱۔ سائنس عقل کی بات کرتی ہے۔ ادب جذبات کی بات کرتا ہے۔
۲۔ سائنس اصولوں کی بات کرتی ہے۔ ادب انسانوں کی بات کرتا ہے۔
۳۔ سائنس کا کام قوتوں کو زیر کرنا ہے۔ ادب کا کام انسان کو انسان کے قریب تر لانا ہے۔

- ۴۔ سائنس کی اپیل ذہن پر ہے، ادب کی دل پر۔
 ۵۔ سائنس باہر کے انسان سے تعلق رکھتی ہے۔ ادب اندر کے انسان سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ کو علم ہے کہ ہر فرد ایک جزیرہ ہے۔ دوسرے فرد سے دُور۔ درمیان میں سمندر حائل ہے۔ ہر فرد کے اپنے مسائل ہیں، اپنی مشکلات ہیں، اپنی مجبوریات ہیں، جسے دوسرا فرد نہیں جانتا، نہیں سمجھتا۔ افراد میں صرف ایک چیز مانجی ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب حواسِ خمسہ میں مقید ہیں۔ دقت یہ ہے کہ یہ حواسِ خمسہ بھی ایک جیسے نہیں۔ کچھ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں کچھ زیادہ سُننے ہیں۔ مثلاً میں اپنے بیٹے عکسی کی نسبت کم سُننا ہوں۔ اپنے دوست اشفاق احمد کی نسبت کم دیکھتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب کی نسبت کم دیکھتا اور کم سُننا ہوں۔ اپنی سیلی بالوقدیرہ کی نسبت کم محسوس کرتا ہوں۔

میری دانست میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ ان جمیروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ فرد کے جذبات اور احساسات کا دوسروں کو شعور دلایا جائے۔ دلوں میں ہمدردیاں پیدا کی جائیں۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے خلاف غم و غصہ بھڑکایا جائے۔ لوگوں کو کمٹنٹ پر مجبور کیا جائے۔

میری دانست میں ادیب کی کمٹنٹ بنی نوعِ انسان سے ہے۔ جس طرح حضورِ اعلیٰ کی کمٹنٹ بنی نوعِ انسان پر رحمت تھی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ربِّ المسلمین نہیں ربِّ العالمین ہے۔

بیرونی طاقتوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جس طرح وہ سائنس کو کام میں لارہے ہیں، اسی طرح ادب اور ادیبوں کو کام میں لائیں لیکن یوں کہ احساس نہ ہو کر انھیں کام میں لایا جا رہا ہے بلکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے مطلب کے خیالات کا گڑ ہمارے ہاں بھیجتے رہتے

ہیں تاکہ ادبی کھیاں اس پر چھینٹائیں اور ”ادینین میکرز“ کی حیثیت سے یہ گڑ جگہ جگہ پھیلائیں تاکہ بیرونی طاقتوں کے مفادات کا پرچار ہوتا رہے۔

تقسیم سے پہلے بدیشی اقتدار پسندوں نے ایک بہت بڑی ادبی تحریک چلائی تھی، جو بہت کامیاب ہوئی اور جس میں ہمارے کئی ایک نامور ادیب شامل ہوئے۔ کچھ انجانے میں کانٹے پر لگ گئے۔ کچھ فیشن کی مقبولیت کے لیے شامل ہو گئے۔ کچھ چودھری بننے کے چاؤ ہیں۔ تحریک کا نام ترقی پسند ادب تھا۔ اس ادبی تحریک کا کنٹرول کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ ادیبوں سے کام لیا جاتا تھا لیکن خصوصی مقاصد سے بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔ پاکستان بننے پر ہند کی کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ پاکستان اور ہند کے ترقی پسند ادیبوں کا مرکز ہند ہی میں رہے گا جہاں سے وہ دونوں کو کنٹرول کریں گے۔ یہ بات پاکستانی ادیبوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ اگرچہ چودھری اسٹ کا شوق تھا لیکن دل میں پاکستان کا جذبہ بھی تھا۔ لہذا چھوٹ پڑ گئی اور یہاں یہ تحریک ختم ہو گئی۔ لیکن آج کل ہمارے ادیب اُن جانے میں پھر سے ترقی پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ انٹلکچوئل ازم کی وبا فرانس سے آئی اور آج کل بھی زوروں پر ہے۔ مجھے واضح طور پر علم نہیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں۔ لیکن نتائج سے ظاہر ہے کہ:

- ۱۔ ادب کی تجربہ جذبات سے ہٹا کر ذہن کی طرف مرکوز کر دی جائے۔
- ۲۔ ادب کو دانشور بنا کر عوام سے کاٹ دیا جائے۔
- ۳۔ ادیب کو اسلام سے کاٹ دیا جائے۔ اس کے ذہن میں مذہب اور روایت کے لیے تحقیر پیدا کی جائے۔

پتا نہیں اہل مغرب اسلام سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ یورپ میں کئی ایک ایسی انجینئرس کام کر رہی ہیں جن کا واحد مقصد اسلام دشمنی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں صدر گھر میں ملازم تھا تو مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یورپ میں ایسی ۱۲۶ انجینئرس باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ آج بھی ہمارے کچھ نوجوان ادیبوں میں انٹلیکچول بننے کا شوق عام ہے۔ وہ خود کو خواص سمجھتے ہیں۔ نزدیک کی کوٹھی لانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اُوپچی اور پچی باتیں کرنے کے مشتاق ہیں جو عوام کی سمجھ میں نہ آئیں، اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

صاحبو! سچی بات یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں۔ ادیب دراصل وہ علاقائی صوفیانے کرام تھے جن کی تصنیفات صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی عوام کے دلوں پر نقش ہیں۔ مخد زبانی حفظ ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں کتابیں لکھیں جن میں دانشورانہ باتیں کیں۔ نہ عوام نے مخد نگار کا یا نہ نقادوں نے گھاس ڈالی۔ پھر اتفاق سے ایک عوامی کتاب ”لیٹک“ لکھی۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے عام لوگوں کے تقریباً دہزار خطوط موصول ہوئے۔ ہر کسی نے کہا: مفتی، تو نے میرے دل کی بات کہ دی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ خوشی سے دل باغ بارخ ہو گیا۔ پھر دفعہ ”مجھ پر سات آٹھ گم کرے۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔ یہ علماء کے خط تھے۔ وہ وہ ڈانٹ بڑی کہ خون خشک ہو گیا۔ اے اے ادب، گستاخ، ناہنجار، لیکن پھوٹے۔ پھر سے تلخ یاد تازہ کرنے کا فائدہ؟ بڑی مشکل سے انھیں بھلایا ہے۔

آئیے، اب ذرا ادب اور ادیب کا جائزہ لیں :

- ۱۔ اس وقت ادب اور ادیب دونوں کا عوام سے رابطہ نہیں ہے۔
- ۲۔ ادیب کی ذہنیت پر شہر سوار ہے۔ یعنی ادیب ”سٹی اور مینڈ“ ہے۔ وہ دیہات کو گنتی شمار میں نہیں لاتا۔ اس کے نزدیک عوام سے مفہوم شہری عوام ہیں۔ شہر ایک قیامت ہے جو ہم پر انڈسٹریل ریلوڈ لیویشن نے ڈھائی۔ شہر پاکستان کا مائندہ نہیں ہے۔ شہر میں ایک بیگانہ کچھڑی کچھڑا جاتا ہے۔ خیال کے مغربی فیشن اس کچھڑی کچھڑی کو پسندتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسے کوکا کولا کچھڑی کہا جاتا ہے۔ شہر کے لوگ مغربی فیشن اور انڈسٹریل ریلوڈ لیویشن کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مصنوعی ہیں۔ ان کا اپنے کچھڑ اور روایات سے تعلق نہیں۔
- تاجر کپٹیٹن اور مفاد پرستی کی دھن میں سرگرداں ہیں۔ عہدے دار سٹیٹس زدہ ہیں۔

مزدور اس سوشلزم کے نعرے لگانے میں مصروف ہیں جس کے بارے میں انھیں کچھ علم نہیں۔ عالم، جو مغرب سے تحصیلِ علم کر کے آئے ہیں، بدیشی خطوط پر سوچتے ہیں۔ طلباء اُن جانے میں ہڑ بولنگ مچاتے ہیں۔ سیاستی ذاتی اقتدار کی ہوس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

بے شک شہر ایک دیدہ زیب جنت ہے۔ "کسے را با کسے کارے نہ باشد" قسم کی جنت، جہاں ہر کوئی اپنی دھن میں لگا ہے۔ آج کے ادیب کے لیے شہر ہی دُنیا ہے۔ شہر ہی زندگی ہے۔

۳۔ حکومت ادیب اور ادب سے یکسر بے تعلق ہے۔ کوئی ادیب فوت ہو جائے تو اظہارِ افسوس کا بیان چھپ جاتا ہے کبھی کبھار کوئی وزیر یا اہل کار اعلان کرتا ہے کہ اب ادیبوں کا فرض ہے کہ قوم کو راستہ دکھائیں۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خود ادیبوں کے راستے بند پڑے ہیں۔

۴۔ چند ایک سرکاری ادارے جو ادب اور ادیبوں کے لیے بنائے گئے ہیں، سال میں ایک دن ٹاٹے کا جلسہ کرتے ہیں اور باقی سال بیٹھے اد نگھتے رہتے ہیں۔ بچا سے کیوں نہ اُد نگھیں۔ ادیب کی فلاح سے متعلق ان کی تجاویز متعلقہ حکمے میں یوں بے تعلقی کا شکار ہو جاتی ہیں جیسے بینک میں فقیر گھس آئے۔ کبھی کبھار یہ ادارے سیمینار قسم کا اکٹھا کر دیتے ہیں جس میں باتیں ہوتی ہیں، نیک خواہشات بھری باتیں، علمی باتیں، کتابی باتیں، مٹھ زبانی باتیں۔

ادب کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کتابیں نہیں بھپتیں۔ ایک طرف تخلیق کی دُنیا میں طوفان آیا ہوا ہے۔ نوجوان جذبہ تخلیق سے یوں بھرے بیٹھے ہیں، جیسے انا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف پروجیکشن کے ذرائع مسدود ہیں۔ مزید مسدود ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوان ادیب بظلم میں مستودے دبائے پھرتے ہیں۔ پبلشر انھیں گھاس نہیں ڈالتے۔ بیشتر ادیب شوقِ اشاعت سے مجبور ہو کر قرض لے کر اپنی کتاب خود چھاپنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر بفرقز محال پبلشر کتاب چھاپ دے تو سالہا سال ایک ہزار کا ایڈیشن

چلتا ہے۔

ادبی حیدر سے روز بروز بند ہوتے جا رہے ہیں۔ میڈیا انھیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ اشتعال سے نوازے۔ وہی محدودے چند لوگ انھیں پڑھتے ہیں جنہیں پرچہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک اندازے سے پانچ ہزار لائبریریاں ہیں۔ اس کے علاوہ سکول اور کالج ہیں جہاں ادبی پرچوں اور کتابوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکار کو ادب پر اعتماد نہیں۔ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتی، ورنہ یقیناً ایک سرکاری پبلشنگ ادارہ قائم ہو چکا ہوتا۔ ویسے بھی ادبی تحریر بے اثر ہے۔ آج کے دور میں جس میں بگڑی اُچھالنے کی طاقت نہیں، وہ تحریر بے اثر ہے۔ ادب کی کیفیت صوبہ بلوچستان کے مزاد ہے۔ اتنا بڑا صوبہ جس میں دو ایک سڑکیں، باقی بے سڑک، بے رابطہ۔ اتنا بڑا ادب جس میں دو ایک پگڈنڈیاں، باقی لت دق میدان۔

جنابِ والا! میں اکیلا ہی نہیں، قلم قلیلہ میں میرے اور بھی بھائی ہیں جو سچی بات کہتے ہیں، سادہ بات کہتے ہیں۔ جو اسپورٹسٹ ادبی فیشنوں کو ٹھنڈ نہیں لگاتے۔ اپنی مٹی کی خوشبو کا احساس رکھتے ہیں۔ علاقائی رنگ میں لکھتے والے اس ضمن میں پیش پیش ہیں۔ ویسے بھی بدقسمتی سے اردو زبان درباری زبان ہے، اردو دربار داری ہمارا قومی وصف ہے۔ اردو زبان میں سچی اور سادہ بات لکھنا بے حد مشکل ہے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ کچھ ہی کلچر، مغرب زدگی، ظاہر پسندی اور چمک دمک کا دور آخری دھوئیں پر ہے۔ اس دور نے باہر کے آدمی کو دیوتا بنایا۔ اس کی پوجا کی۔ اسے منایا۔ باہر کے آدمی کو اسٹیشن بم پہنچائیں۔ اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے نوازا۔ اس حد تک نوازا کہ لاون بن گیا۔ راکشش بن گیا۔ تباہیخ شاہد ہے کہ باہر کے آدمی کا دور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ دور میرے ہوش میں آیا تھا اور اب میرے سامنے ہی اس کے اختتام کے عوامل واضح طور پر نظر ہو رہے ہیں۔

جب چیونٹیوں کو پر لگ جائیں تو جان لو کہ جلد ہی جلے ہوئے پروں کا ڈھیر لگنے والا ہے۔
 یہ قدرت کا اصول ہے۔ یقین کیجیے کہ باہر کے انسان کا راون گم رہا ہے۔ اندر کا دمام ابھر
 رہا ہے۔ سانس دم توڑ رہی ہے۔ مذہب اندر کے انسان کا سواگت کرنے کے لیے آگے
 بڑھ رہا ہے۔ ادب کی بے قدری کا دور ختم ہونے کو ہے۔

پاک سوسائٹی
 ڈاٹ کام

آپ کا نام

ناموں کی اہمیت کا احساس مجھے فقیر چند نے دلایا۔ تقسیم سے پہلے کی بات ہے، فقیر چند میرا ہم جماعت تھا، درست تھا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں ہم لکھے پڑھتے تھے۔ فقیر چند کی منگنی ہنسے دالی تھی۔ پھر سنا کہ وہ ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے فقیر چند سے پوچھا ”یار، تیری منگنی ٹوٹ گئی ہے کیا؟“

بولا ”کوئی نہیں۔ میں نے توڑ دی۔“

”کیوں؟ کیا لڑکی اچھی نہ تھی؟“

بولا ”اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔“

”پھر تو نے منگنی توڑ کیوں دی؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ”میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جس کا نام بسنت کو رہو۔“

اس کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا ”یار، تو تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ پھر ناموں کو

اہمیت دیتا ہے؟“

کہنے لگا ”اے، ہوں۔ اور نام کو اہمیت دیتا ہوں۔ سو دہاڑے؟“

میں نے کہا ”بھئی، نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

بولا ”پڑتا ہے۔ بہت پڑتا ہے۔“

”جو ایسی ہی بات ہے تو اس کا نام بدل کر کوٹلیا رکھ لو۔“

کہنے لگا ”یار، تم بھی احمق ہو۔ جو لڑکی بسنتو بسنتو کہلا کر جوان ہوئی ہو، اب اس کا

نام بدلتے کا فائدہ؟ چھوڑو، یار، بس کہ جو دیا کہ میں بسنتو سے شادی نہیں کر سکتا۔
میں نے کہا، یار، عقل کی بات کر۔

بولاً ”بھائی، پسندنا پسند عقل کی بات نہیں ہوتی۔ تجھے اتنا بھی نہیں
معلوم؟ پھر ہنس کر کہنے لگا ”دیکھ، پھلوں میں مجھے خربوزہ پسند ہے حالانکہ خربوزے میں پھل کی
بات نہیں۔ نہ صفرج ہے، نہ خوشبودار ہے، نہ ذائقے دار ہے۔ اس کے باوجود مجھے پسند ہے۔
کرے میرا کیا کہنا ہے؟“

اس زمانے میں مجھ میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ میں عقل کا پرستار تھا۔ ہر بات عقل کی
کسوٹی پر رکھ کر جانچتا تھا۔ فلسفے کا طالب علم تھا۔ رسل، ہکسل، فرائیڈ، برگساں اور نیٹسے کا
فین تھا۔

اس روز میرے دل میں شبہ سا بیٹھ گیا کہ کیا نام اتنا ہی اہم ہے کہ ایک نوجوان نام کی
بنا پر بیاہ کرنے سے انکار کر دے؟ یا کسی لڑکی سے اس کے نام کی وجہ سے محبت کرنے لگے؟
اب مجھے شعور ہے کہ نام بہت اہم ہوتے ہیں اور وہ افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

حال ہی میں پاکستان ٹیلی وژن نے اپنے جانے پہچانے پر دو گرام فنی و فنی میں نام کی تاثیر
پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ ایک صاحب سڑک پر سکوڑ پر جا رہے تھے۔ غلط طریقے سے موڑ کاٹا تو
ٹرینک سپاہی نے روک لیا۔ جیب سے چالان کی کاپی نکالی۔ پوچھا ”کیا نام ہے تمہارا؟“ سکوڑ سوار
نے جواب دیا ”مستمر تارڑ“۔ نام سن کر سپاہی گھبرا گیا۔ پھر سے پوچھا۔ سکوڑ سوار نے اپنا نام دہرایا۔
سپاہی منہ میں پنسل ڈال کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا ”جا جا۔ آئندہ اس طرح موڑ نہ کاٹنا۔ سمجھا؟“
ناموں کی بات ہو رہی تھی۔ محفل میں ایک ڈپٹی کمشنر بیٹھے تھے۔ بولے ”ہماری کچری میں
ایک مجسٹریٹ ہیں، کوٹا خان۔ پڑھے لکھے ہیں۔ مزاج کے کر دے نہیں۔ بہتر وہ ہیں۔ معقول ہیں۔
لیکن جس کا مقدمہ ان کی کچری میں لگاتا ہوں، وہ کچری بدلنے کی درخواست دے دیتا ہے۔ بڑی
مشکل میں پڑے ہیں ہم۔“

نام کے تین پہلو ہوتے ہیں: صوتی اثر، مفہوم اور تاثیر۔ کچھ نام صوتی اثر کے لحاظ سے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ کچھ بھاری بوجھل ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی گاڑھے ہوتے ہیں۔ اور کچھ حلق میں یوں پھنس جاتے ہیں جیسے پھٹی کا کاٹا۔ ان کا بونا حلق پر ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مثلاً "غضنفر" ایسا نام ہے جسے آپ بار بار بولیں تو یقیناً آپ کو ٹانسز کا عارضہ لاحق ہو جائے۔

ادور سیز پاکستانیہ فاؤنڈیشن میں میرے ایک دوست تھے۔ ان کا نام غضنفر تھا۔ میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ میرا گلا تو پہلے سے ہی مضروب ہے۔ میں نے سوچا، اب کیا ہو گا؟ روز گھر جا کر منک کے غراسے کرنے پڑیں گے۔ وہ تو اللہ نے کرم کر دیا کہ ان کے نام کا دوسرا حصہ مددی نکلا، دوسرے مجھ پر ای این ٹی کے پھیرے لگانے لازم ہو جاتے۔

کراچی میں میرے ایک ہم کار تھے، کمکشاں حقانی۔ میں ان کے ساتھ چھ مہینے رہا۔ آج تک گلے کا کدو اسوجا ہوا ہے۔

ہمارے ایک جانے بچانے ادیب ہیں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مزاج کے باغ و بہار ہیں۔ انھیں صرف اس لیے دوست نہیں بناسکا کہ ان کا نام خشک ہے۔

ناموں کے معاملے میں ایک اور دقیقہ ہے۔ ماں باپ بچے کا مقدس نام نہ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً محمد علی، اللہ بخش، محمد حسین۔ محمد علی کو نہ آپ محمد کہہ کر بلا سکتے ہیں نہ علی کہہ کر۔ پھر یہ بھی ہے کہ پیار سے نام بگاڑ بھی نہیں سکتے۔ میرا تجربہ ہے کہ اظہارِ محبت کے لیے نام بگاڑنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً میرے بیٹے کا نام عکسی ہے۔ اگر میں اسے عکسی کہہ کر بلاؤں تو اجنبیت سی محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے میں اُسے اچھی کہہ کر بلاؤں۔

پتا نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ جس کے لیے آپ کے دل میں محبت ہے آپ اس کے نام کو بگاڑتے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ رضیہ کو رضو کہتے ہیں۔ اقبال کو بال، مقبول کو بولی۔

مقدس نام موزوں نہیں رہتے۔ کم از کم نام کا ایک حصہ ضرور غیر مقدس ہونا چاہیے کہ آپ اسے بُرا بھلا کہہ سکیں، غصے میں گالی دے سکیں۔ دُر بچھے مُٹھ کہہ سکیں۔

فرض کیجیے آپ کا نام غلام محمد ہے۔ چلیے ایک حصہ تو مقدس نہیں۔ لاڈلیا، چل، غصے کا اظہار اس حصے کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن غلام محمد میں ایک دقت پیدا ہوگئی۔ لوگ آپ کو غلام غلام کہہ کر پکارتیں گے۔ آپ ہی سوچیے کہ اگر ایک فرد سا لہا سال غلام کی آواز پر جی ہاں کہتا رہے گا تو اس کی نفسیات کا تو فائدہ بن جائے گا۔ بے چارہ بالکل ہی غلام بن کر رہ جائے گا۔ ایسا نام رکھنے پر تو بے رحمی والوں کو الیکشن لینا چاہیے۔

پھر ایک اور دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چلیے ماں باپ تو مقدس نام رکھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ غلام محمد جوان ہوا، تحصیل علم سے فارغ ہوا، بڑے عمدے پر فائز ہوا تو بے چارے کو نام کی دقت پر گئی۔

آج کل کے مغرب زدہ دور میں کچھ لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کے نام سے مذہب کی بو آئے۔ وہ سیکر بننا پسند کرتے ہیں۔ نام سے مذہب کی بو آئے تو سٹیٹس میں فرق آتا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ اپنے نام کے ساتھ ایک اور لفظ بڑھا دیتے ہیں، بطور تخلص۔ مثلاً غلام محمد نے سرشار کا لفظ بڑھا لیا۔ پھر مذہبی نام کو کیا فلاح کر لیا۔ یوں وہ اپنا نام جی ایم سرشار لکھنے لگے۔ نذر محمد خود کو ن م راشد لکھنے لگتا ہے۔ محمد حسین ایم ایچ چٹھ میں پناہ لیتا ہے۔

معنوی پہلو سے نام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً میرا ایک دوست ہے، نور دین۔ اس کی شخصیت دیکھیے تو نام کی ضد ہے۔ نہ اس میں نور ہے، نہ دین ہے۔ نام لینے والا خواہ مخواہ شرمندہ ہوتا ہے۔ جیسے بر ملا ٹھوٹ بول رہا ہو۔ پھر میری ایک عزیزہ ہیں۔ ان کا نام حسینہ ہے۔ دیکھنے میں انھیں حُسن سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ جب انھیں حسینہ کہہ کر بلایا جاتا ہے تو ان کی بے صوفی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ایک خاتون پر اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں، جمال خان۔ ان کے خدو خال بڑے نستعلیق ہیں۔ رنگ گودرا

ہے۔ چہرہ اس قدر کلچر ڈھے کہ جمال پر بالکل فٹ بیٹھا ہے۔ لیکن خان سارا طلسم توڑ دیتا ہے۔ سیدی بات ہے کہ خان کے ساتھ بہت سے نام لگتے ہیں۔ مثلاً بیسبت خان، دلاور خان، بہادر خان، اکھر خان، عظمت خان، جلال خان۔ جمال نہیں لگتا۔ کہاں جمال کہاں خان۔ میں نے اپنے دوست جمال خان کو کئی بار سمجھایا ہے کہ بھائی میرے یہ گنگا جمنی نام نہیں چلتا۔ ایک حصہ میٹھا دوسرا نمکین۔ بات نہیں بنتی۔ لیکن اس نے کبھی میری بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ چلو، ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔

نام کے دو حصوں میں بے ربطی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ نام اور شخصیت ہم آہنگ ہوں۔ اہل مغرب نے نام کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے ناموں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئی خود کو ناس کہلاتا ہے، کوئی دُلف، کوئی گولڈ ڈاٹر کا نام رکھے بیٹھا ہے، کوئی باٹل نک۔ حیرت ہے کہ اتنے مذہب، لیکن اتنے بے حس۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے بے معنی نام انھیں سُجھتے کس طرح ہیں؟ نہ معنی نہ سُر نہ تال۔ روسی ناموں سے اللہ پناہیں رکھے۔ میں روسی لکھنے والوں کا مداح ہوں۔ دوسروں کی کافین ہوں۔ دوسروں کی کامطالعہ کیا تو سب سے بڑی مشکل ناموں نے پیدا کی۔ آدھی آدھی سطر کا ایک ایک نام۔ ادھر ہر نام میں تقریباً ساری اے بی سی ڈی سمائی ہوئی۔ میں نے تو پورا نام کبھی نہیں پڑھا۔ دیکھ لیتا۔ پہچان لیتا۔ پہلا حصہ پی سے شروع ہوتا ہے، دوسرا وی سے۔

تقسیم سے پہلے یہاں ایک انگریز کمشنر تھے، مسٹر ٹمون۔ میں نے مون صاحب کو بہت سمجھایا۔ میں نے کہا ”آپ دولت انگلشیہ کے نمائندہ افسر ہیں۔ آپ کی مملکت بڑی عظیم ہے جس پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ اتنی عظیم مملکت کے نمائندے کو زیب نہیں دیتا کہ خود کو مون کہلوئے۔ اول تو چاند میں نسائیت کا عنصر ہے، دوسرے چاند گھٹا بڑھتا، ادا بدلتا رہتا ہے۔ تیسرے روشنی کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ جناب والا، بہتر ہوگا کہ آپ مون کی جگہ اپنا نام سن رکھ لیں۔ مسٹر مون نے میری بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ سمجھ لیتے تو آج سلطنت انگلشیہ پر سورج

غروب نہ ہو پاتا۔ بہر صورت، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔
صرف مومن کی ہی بات نہیں، ہم آپ کو بھی سمجھا رہے ہیں۔ آپ سمجھیں نہ سمجھیں۔ آپ
کی مرضی۔

میرے کئی ایک دوست ہیں جن کے ناموں پر مجھے اعتراض ہے۔ مثلاً آفتاب ہے۔
میں نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا ہے کہ یار! یہ نام بہت گرم ہے۔ دیکھو تو، یہاں پہلے ہی اتنی گرمی
ہے۔ صرف سورتج کی ہی نہیں، اس کے علاوہ نئی نسل کی بھی تو ہے۔ موڈیوں ادلتے بدلتے
ہیں جیسے بادل شکلیں بدلتا ہے۔ غصتے ناک پر دھرے ہیں۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر
رہے ہیں۔

میں نے کہا ”بھائی آفتاب“ یہ نام شاید ٹھنڈے ملکوں میں چل جائے۔ یہاں نہیں چلے
گا۔ ہماری پرہیزگار قوم تو ٹھنڈے رہنا ہے۔ تو کوئی ٹھنڈا میٹھا نام رکھ لے۔ آفتاب کی نسبت تو
کو کا کو لا ہی اچھا ہے“ لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔

پھر میرے گرم فرما جلال ہیں۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ جناب جلال کوئی قابل حصول
کیفیت نہیں۔ اُلٹا جذبہ بتیہ پیدا کرتی ہے۔ اس میں سے ایگریشن کی بو آتی ہے۔

پھر ایک محترم ہیں، لطیف۔ اب میں انھیں کس طرح بتاؤں کہ لطیفہ کو کوئی مسخیدگی سے
نہیں لے گا۔ لوگ صرف تفریح سمجھیں گے، اور یہ کتنی بُری بات ہے۔

صاحبو! اب میں کس کس کا نام گنواؤں۔

پھر ہمارے ادیبوں نے ناموں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے تو ناموں کے ساتھ
تخلص جوڑے۔ کوئی محمد ہے۔ کوئی آہ ہے۔ کوئی سوزن ہے۔ کوئی لال ہے۔ زیادہ تر غمخوار
قسم کے۔ پھر یوں کیا کہ نام کے ساتھ جنم بھری کا نام ٹانک دیا۔ مثلاً مجید لاہوری، ضیا بانڈھری،
بابر بٹالوی۔ ایک صاحب مونچھ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ
مونچھو دی بڑھا دیا۔ اس پر ہم خوف زدہ ہو گئے کہ کہیں ریاست پونچھ کے کوئی ادیب پونچھو

لکھنا شروع نہ کر دیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے بیسیوں ادیب آج بھی اپنے نام کے ساتھ دہلوی، اجیری، اللہ آبادی، اکبر آبادی لکھ رہے ہیں، حالانکہ انھیں اب ان شہروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اب ذرا اداروں کے نام بھیجیے۔ الحمد للہ کہ پاکستان اب اسلامی جمہوریہ ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ کے تحت کئی ایک نام بدل جانے چاہئیں تھے، جو آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ مثلاً سرکار کو ہم اب بھی گورنمنٹ آف پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا لفظ آج تک قائم ہے۔ اگر آپ اسے حکومت کہیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے کارندے حکمرانی کریں گے۔ مونچھ پرتاؤ دیے رکھیں گے۔ کارسٹنٹ رہیں گے۔ گردن اکڑی رہے گی۔ ساتھ بیٹھ کر بھی اُدب لکھیں گے۔

فرض کیجیے آپ حکومت کے لفظ کو بدل کر خدمت کا لفظ رائج کر دیتے ہیں۔ یعنی خدمتِ پاکستان، تو لازم ہوگا کہ کارندوں کی نفسیات پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے۔ خدام بنیں نہیں، حاکم نہیں رہیں گے۔ بادشاہ کو تو ہم نے صدر کا لقب دے دیا۔ خوب کیا۔ لیکن وزیر اور وزارت جوں کے توں رہے۔ جو وزیر ہیں وہ تو وزارت کہیں گے، اور وزارت من مانی کرے گی۔ کیوں نہ کرے؟ کیوں نہ مونچھ مروڑ کر بیٹھے؟ کیوں نہ محام سے متنازع رہے؟ نام کے اثر سے خود کو محفوظ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ عمدہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ جیسی تو کچھ ممالک نے وزارت کو نظامت میں بدل دیا ہے۔

پھر چھوٹے عہدوں کی بات بھیجیے۔ آپ مجھے ڈائریکٹ بنا دیں تو مجھے احساس ہونے لگے گا کہ میرا کام ڈائریکٹ کرنا ہے۔ ہدایات دینا ہے۔ حکم چلانا ہے۔ مشورہ لینا نہیں۔ فیصلے کرنا ہے۔ اسی طرح کنٹرولر ہے۔ کنٹرولر تو کنٹرول کرے گا۔ وہ کسی کی کیوں مٹے؟ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم میں یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ نام بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ فرد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ہم اس کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔

میں نے زندگی میں ایک نام دیکھا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل، جامع اور پرفیکٹ ہے۔ صوفی، معنوی، نفسیاتی ہر لحاظ سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اس میں مُسر ہے، لے ہے، نغمگی ہے، معنوی لحاظ سے مثبت اثرات سے بھرپور ہے، ماڈرن ناموں کی طرح مختصر ہے، جامع ہے، پیارا ہے، مفہوم کے اعتبار سے قابلِ احترام ہے، قابلِ ستائش ہے۔ اور وہ ہے محمدؐ — سبحان اللہ! کیا نام ہے!

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

غصیل دور

آج کا دور بڑا غصیل دور ہے۔ ہر کوئی غصہ ناک پر دھرے پھرتا ہے۔ ہر کوئی مُستظر رہتا ہے کہ کوئی بات ہو، بہانہ ہاتھ آئے تو وہ غصے کی تلوار نکال کر اسے لہرائے۔

اوروں کی بات چھوڑیے۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ بات بات پر تانڈ کھا جاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک کمزور اور نرم آدمی ہوں۔ کمزور اور نرم آدمی کو غصہ یوں بھجھوڑتا رہتا ہے جیسے بچے ہیری کے درخت کو بھجھوڑتے ہیں۔ مضبوط یا طاقتور انسان پر غصے کا بس نہیں چلتا۔ تو ظاہر ہے کہ آج کا غصیل دور کمزور اور نرم لوگوں کا دور ہے۔

آج کل لوگ اپنی نسوں سے یوں کھیلتے رہتے ہیں جیسے وہ کھلونے ہوں۔ ذرا سی بات ہوئی تو تانڈیں آگئے اور لگے اپنی نسوں کو بجانے۔ حتیٰ کہ وہ یوں چھڑ جاتی ہیں جیسے سارنگی کے تار ہوں۔ پھر ان کی بھن بھن کی دھنکی بھی ہے اور یہ بھن بھن سارے جسم میں یوں گونجتی ہے جیسے اندر کھیلوں کا چھتا چھڑ گیا ہو۔ پھر خون اُبلنے لگتا ہے اور عقل دہوش دھندلا جاتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غصہ بُری چیز ہے۔ غصہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو انسان کو اس لیے عطا ہوئی ہے کہ خطرے کے وقت اپنا بچاؤ کر سکے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غصے کی تلوار بخش رکھی ہے کہ جب کبھی خطرہ سامنے آئے تو یہ تلوار نکال کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم نے اس تلوار کو کھلونا سمجھ لیا ہے اور ہر وقت اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔

عالموں کا کہنا ہے کہ بے شک غصہ ایک ڈیفنس میکانزم یعنی حفاظتی چیز ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ فرض کیجیے اچانک دو آدمی آپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ میں صرف آدھ کھوپڑیاں

موجود ہے۔ دو آدمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آدھ کلوقاقت ناکافی ہے۔ انسانی جسم ایک لاجواب مشین ہے۔ آپ کے جسم نے صورتِ حال کو دیکھا۔ فٹ سے ایک تھیلی کے منہ کو کھولا اور اس میں سے چند قطرے خون میں ٹپکا دیے۔ اس معمول کو ڈاکٹر لوگ ایڈریلین کہتے ہیں۔

جوئی ایڈریلین آپ کے خون میں داخل ہوتی ہے وہ کھولنے لگتا ہے۔ نسون میں اک طوفان آجاتا ہے۔ بلیے اٹھنے لگتے ہیں جیسے سوڈے میں چٹکی بھرنے لگتے ہیں۔ پھر خون تیزی سے جسم میں چلتا ہے۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ کنپٹیاں تھرکنے لگتی ہیں۔ یعنی آپ کی آدھ کلوقاقت بڑھ کر ایک کلوقاقت ہو جاتی ہے تاکہ آپ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس سارے عمل کو غصہ کہتے ہیں۔ آج کے غصیل دور کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خطرے کا مقام ہو یا نہ ہو، مقابلے کی صورت ہو یا نہ ہو، اپنی حفاظت کی ضرورت ہو یا نہ ہو، لوگ خواہ مخواہ غصے میں آجاتے ہیں۔ بلکہ یوں کیسے کہ غصے کے عالم میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ناجائز طور پر استعمال کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔

پُرنے زمانے میں جب انسان جنگلی دور میں تھا تو غصہ ایک اندھا جذبہ ہوا کرتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ اگر آپ پر کسی نے پتھر پھینکا اور پھر جھاگ گیا، اس پر آپ کو غصہ آجاتا۔ آپ اپنا تیرکان اٹھا لیتے اور گھر سے باہر نکل جاتے۔ باہر کوئی بھی چلتا پھرتا نظر آتا، چاہے وہ انسان ہو یا پرندہ یا پروسی کی بھینس، آپ اس پر تیر جلا دیتے۔ اور پھر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد جھونپڑے میں داخل ہو کر آرام سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے۔ اس زمانے میں بدلے یا انتقام کا سوال نہ تھا۔ صرف دل ٹھنڈا کرنے کی بات تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ انسان مہذب ہونا لگیا اور اُس کی سمجھ میں آگیا کہ غصہ نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ دلانے والے کو مزادی جائے۔ آج کی صورتِ حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر سے جنگلی دور میں جا داخل ہوئے ہیں۔ جب بھی ہم غصے میں آتے ہیں تو جوش میں باہر نکل جاتے ہیں۔ سڑک پر چلتی بسیوں کو روک کر انہیں آگ لگا دیتے ہیں۔ چلتی گاڑیوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ چار ایک نورے لگاتے ہیں۔ مٹخ سے جھاگ نکالتے ہیں اور یوں

دل ٹھنڈا کرنے کے بعد اپنے کارنامے پر نازاں خوشی خوشی گھر لوٹ آتے ہیں۔

بکھ میں نہیں آتا کہ دورِ جدید کے لوگ ہر وقت غصے میں کیسے رہتے ہیں! بھی غصہ تو ایک آنی جانی چیز ہے۔ لیکن اسے قائم کر لینا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ سیالوں کا کہنا ہے کہ غصہ پہاڑ کی برفیلی چوٹی کی طرح ہے۔ آپ چوٹی پر جا سکتے ہیں۔ وہاں قیام نہیں کر سکتے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں اکثر غصے میں آجاتا ہوں۔ لیکن جو غصے میں آتا ہوں، جی جانتا ہے کہ باہر نکل جاؤں۔ پتا نہیں کیوں۔ لیکن غصہ آجائے تو وہ مجھے کاٹنے لگتا ہے۔ وہ مجھے اپنے جنگل میں بکڑ لیتا ہے اور پھر یوں توڑتا مروتا پخوڑتا ہے جیسے کوئی کپڑا دھو بی کے ہاتھ چڑھ گیا ہو۔ اس مار پیٹ سے تنگ اگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری جان پھوٹ جلے۔ پھر جب غصہ اُتر جاتا ہے تو میں مسکھ کا سانس لیتا ہوں۔ اب اس وقت میں سوچتا ہوں کہ یہ غصہ کیسی، بیودہ چیز ہے جو دوسرے کو نقصان پہنچانے کی نسبت مجھے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ مجھے توڑتا ہے، مردہوتا ہے، میرے جسم کو بونی کی طرح بلور کر رکھ دیتا ہے، میرے ذہن کی پھچھوندی اڑا دیتا ہے۔ سیانے سچ کہتے ہیں واقعی غصہ ایک ایسی ٹھہری ہے جو انسان اپنے ہی سینے میں بھونک لیتا ہے۔

پُرانے زمانے میں لوگ غصے کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ غصے میں آتو جاتے مگر تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ غصے میں ہیں۔ اور پھر جب غصہ اُتر جاتا تو اپنی اس کمزوری پر شرمسار ہوتے اور دل ہی دل میں اپنی حماقت پر شرمیانی محسوس کرتے۔

ان دنوں کوئی بھی غصے یا تشدد پر فخر نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس آج کل لوگ غصے اور تشدد کے گُن گاتے ہیں۔ انھیں یوں اپنے سینے پر سجانے پھرتے ہیں جیسے وہ تمغے ہوں۔ لوگ علانیہ تشدد کا پرچار کرتے پھرتے ہیں، اور جو شخص ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پتا نہیں سوچ کا یہ انداز ہمارے ہاں کہاں سے آگیا ہے! ضرور دسادور سے آیا ہوگا کیونکہ یہ انداز مشرقی نہیں۔ اس میں ہماری روایات کا رنگ نہیں۔ بلاشبکہ دہشتہ یہ کوئی بیرونی

ہیز ہے جسے چوری چوری ہمارے ملک میں سمگل کر کے بھیجا گیا ہے تاکہ ہماری مٹی میں نوپائے،
پھلے پھولے اور غار دار بھاڑی کی طرح پھیل جائے اور تخریب کے کانٹے بکھیر دے۔

بڑی طاقتیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ چھوٹی مملکتیں امن چین سے جیئیں۔ اس لیے وہ ایسی
سوچوں کے جراثیم بھیجتی رہتی ہیں جو ذہنوں کو مشتعل کریں، جذبات میں جوش پیدا کریں، غصہ
اُبھاریں، تشدد پسندی کو شہ دیں۔

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

آپا

اپنے ایک افسانے کا تجزیہ

آپا میری جانی پہچانی کردار کہانی ہے۔ کچھ لوگ تو اسے میری پہچان سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود میرے نزدیک وہ ایک "فل گیپ" کہانی تھی۔ اب بھی ہے۔ اس کی دوجہ تھیں: پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے لوگ میرے ٹمن تھے۔ مجھے اُن کے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پُورا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پُورا کرنے کی خواہش چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، پھر بھی اس سے عمدہ براہِ ناجان چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنی خواہش کے یا آمد کے تحت نہیں لکھی تھی۔ اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسری وجہ بھی سُن لیجیے۔ میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی پیشگی طور پر مل گئی، اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں، بار بار لکھتے ہیں، پھر چھپتے ہیں، بار بار چھپتے ہیں۔ پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فرمائش پر لکھی تھی۔ خواہش یا آمد کا عنصر نہ تھا۔ ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی۔ خالی چھپی ہی نہیں بلکہ بڑے دھوم دھڑکے سے چھپی۔ یوں بیٹھے بٹھلے اُن جانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آپڑی کہ مجھے سنجیدگی سے

سوچنا پڑا کہ کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ سوچ سوچ کر میں نے یہ طے کیا کہ افسانے کا موضوع انوکھا ہو۔ گہرا ہو۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام نہیں، اعظیم۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جتنی دُور کی کوڑی لاؤں، اتنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کردار تھا۔ ہر گھر میں چولے کے قریب چوکی یا پیروھی پر ایک نہ ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو رنگا پیں جھکائے رکھتی۔ پلو کی ادھ میں مسکاتی اور دھیمی آواز میں بات کرتی۔ اس زمانے میں بھی آپا کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہیں چاہتا تھا۔ البتہ ان دنوں سا جو باجی عام نہ تھی۔ بڑے بوڑھے اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بڑی بوڑھیاں مُنہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔ نوجوان سا جو باجی کو دیکھتے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ ہاچھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر، بازاروں میں، دکانوں پر، بسوں میں، روٹوں پر، گلیوں میں، ہر جگہ سا جو باجیوں کی بھیر لگی ہے۔ آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی، بے مد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے پیشگی شہرت مل چکی تھی، آپا سے عام موضوع پر قلم اٹھانا بھلا کوئی بات تھی۔ ان دو وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک آپا کی حیثیت ایک ”فل گیپ“ افسانے سے زیادہ نہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ یعنی آپا لکھنے کی فرمائش کرنے والے لوگ کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی۔ اور میں اس فرمائش کو بُرا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کرنی لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک سہمرد اور صاحبِ رسوخ دوست سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلادے۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے۔ بولے ”ٹیوشن کر دو گے؟ ارادہ بدل تو نہیں گیا؟“ میں نے کہا ”ضرور کر دوں گا۔ ارادہ اور بھی

پکا ہو گیا ہے۔“ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے ”آؤ، میں تمہیں تمہارے شاگردوں سے ملا دوں۔“ معزز رئیس میرا تعارف کر کے چلے گئے تو میں نے آزادانہ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے رُوبرُو بیٹھی ہیں: آپا اور ساجو باجی۔ آپا بڑی تھی، سالنی تھی، نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ کبھی کبھار لکھنوں سے دیکھتی اور تلو کی اوٹ میں مسکاتی۔ ساجو چھوٹی تھی، گوری تھی، چلبلی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکراتے جاتی اور لگتا رہا میں کیے جاتی۔

کچھ دیر تک وہ دونوں میرا جائزہ لیتی رہیں۔ آپا ٹھکی ٹھکی آنکھوں سے، ساجو علانیہ طور پر۔ ساجو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا ”کیا پڑھو گی؟“ ساجو چپکے سے اٹھی اور حساب اور الجبرے کی کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔ حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرے کے پرپے میں میں نے ۱۰۰ میں سے صرف ۱۶ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن انگریزی کی ہوگی اور انگریزی میں میں اپنے آپ کو تین ماہاں سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ اپنی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ ماتھے پر پسینا آگیا۔ ساجو بات کو جانپ گئی، اور اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ اپنا ردِ حال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھا دیا۔ میں نے کہا ”اُس دعویٰ سے کیلبنے گا۔ گھر سے کوئی تھان اُٹھا لاؤ۔“ بس اس جملے نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا ”ہٹاؤ، اس مضمون کو۔ ہم بنیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو۔ مضمون ہونا۔“ ساجو بولی ”انگریزی کیوں پڑھیں؟ اس میں تو ہم آپ لائق ثابت ہوں گے۔“ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھنے نہیں آؤں گا۔ لہذا ادھر ادھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں اُنھیں پڑھانے نہ گیا۔ تیسرے روز وہ رئیس بزرگ سکول میں

آگئے۔ بولے میاں، تم نے کمال کر دیا۔ ایک روز آئے، اس کے بعد سید ہی نہ دی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ جناب عالی، حساب پڑھانا اپنے بس کا روگ ہی نہیں۔ بولے ”میاں، کس نفسی کی حد ہوتی ہے۔ رطکیاں تو کتنی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ لائق اتالیق کبھی دیکھا ہی نہیں۔“ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ساجو کی مسکراہٹ میں سکندر اعظم کی جھلک تھی۔ میں نے بے تکلفی سے کہا ”کیوں مجھے حساب کے جھجھٹ میں ڈال رہی ہو تم؟ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چھٹانک بھر خون خشک ہوتا ہے۔“

اس پر ساجو نے اٹھ کر میرے سامنے دو حل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ نعمایہ امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔ آپا نے سوئیں سے سوئیں لپے تھے اور ساجو نے سوئیں سے ۸۷۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجو بولی ”آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے۔“ میں نے کہا ”تو پھر ٹیوشن کا کیا مطلب؟“ ساجو بولی ”پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو مٹانی ہوتی ہے۔“

پورے دو ماہ ہم تینوں کوفت مٹاتے رہے۔ کتابیں سامنے پھیلا کر گئیں مارتے رہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ میں حاجت مند ہوں، اور وہ حاجت روائی کر رہی تھیں۔ جب ساجو مجھے ماہوار معاوضہ دیتے ہوئے مسکراتی تو میں کہتا ”اچھا تو یہ ہماری حرام کی کمائی ہے۔“ اس پر وہ جھٹ بولتی ”حلال کی کمائی سے کبھی کوئی موٹا ہوا ہے کیا؟“

دو مہینے کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے ازراہ مذاق کہا ”کاش کہ میں کوئی خدمت کر سکتا؟“ اس پر آپا نے ساجو کو اشارہ کیا۔ ساجو بولی ”کہہ سکتے ہیں آپ۔“ میں نے پوچھا ”وہ کیسے؟“ بولی ”آپ ہم پر ایک کہانی لکھ سکتے ہیں۔“ ان دو ماہ کے دوران انھیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپا نے دبی زبان سے کہا ”کہانی ضرور لکھیے گا۔“ آپا کی وہ سرگوشی ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے۔

آپا چھٹی تو گویا سلگتی پرتیل پڑ گیا۔ پیشگی شہرت مُصدّقہ ہو گئی۔ اس کے باوجود میں نے

اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ عام حقیقتیں کس قدر غیر مانوس ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو چھپانے کے لیے عایت کا پردہ دبیز ترین پردہ ہے۔ لیکن بڑھتی سے میں نے اس حقیقت کو صرفت جانا، مانا نہیں۔ آج تک نہیں مانا۔ آج تک یہ حقیقت میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں افسانے کے لیے انوکھے موضوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چچی تو مشہور نقاد اور افسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا ”آپا بہت پسند آئی۔ لیکن انراہ کرم کسی سا جو باجی کا پتا لکھ بھیجیے“ میرے اس افسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں معافی کی بھرپور لگی ہوئی تھی۔ آج بھی جبکہ سا جو باجیاں گھر گھر موجود ہیں اور سا جو باجی کا پتا پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں، آج بھی حسن عسکری کا وہ مجھ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہادت عام ہے: ”جنٹلمن پریفر بلانڈ زبٹ دے میری بروٹس“۔ مطلب یہ کہ مٹرفانیلی آنکھوں والی خواتین کو پسند کرتے ہیں مگر شادی کالی آنکھوں والی سے کرتے ہیں۔

میرا افسانہ آپا اس کہادت کی ضد تھا۔ میں نے اس افسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مداح ہوتے ہیں لیکن سا جو سے بیاہ کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے کہ جس تیز رفتاری سے سا جو باجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں، اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی میرے اس افسانے کو پڑھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ سا جو باجی بہت پسند آئی، کسی آپا کا پتا بتائیے۔

حالات کا رخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کڑاہ کی حیثیت اختیار کرے، اور آپا کی محبت کی تفصیلات الف لیلہ کی باتیں معلوم ہونے لگیں، اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت کھودے۔ لیکن تا یہ رخ شاہد ہے کہ کئی ایک بار سا جو باجیاں زمین کے کئی خطوں پر کھنڈیوں کی طرح اگیں۔ مٹی دل کی طرح حملہ آور ہوئیں، لیکن ہیشہ ریکندہ عظم

آنہی کی طرح آیا اور گولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی اُن جانے اُھول کے مطابق صدیوں کے بعد سا جو باجیوں کا دور آتا ہے، اور صرف اتنی دیر رہتا ہے جتنی دیر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اور پھر صدیوں آپائیں راج کرتی ہیں۔ یعنی لوگ انھیں بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن سا جو باجی کا پتا تو پچھتے پھرتے ہیں۔

سا جو باجی ازلی محبوب ہے، اور قدرت سا جو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کھودے اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں، صحنِ عسکری کا وہ مجید اپنی آفاقت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ محبت کئی ایک روپ دھارتی ہے۔ اور یہی نہیں، کئی بار بات اُلٹ بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے جذبے محبت کا سوانگ بھر لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک بھڑ بھن بھن کرتی ہوئی پردہ انوں کی محفل میں آدھکی۔ بھن بھن کر کے بولی "میں بھی ہمدانہ ہوں۔۔۔" اسی طرح کبھی نفرت کا جذبہ بھن بھن کر کے کہتا ہے "میں محبت ہوں" کبھی انتقام کا جذبہ اپنی تسکین کے لیے محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کبھی ضرورت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پردوں کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ہاں، میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دُور دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ اُن جانی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا موٹا لکھاری تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا، اور کسی عام کردار کی پیش کرتا۔ آپا تو ایک عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا۔ لیکن قاری نے آپا پڑھ کر تالیاں بجائیں اور میرے محبت کے دُوسرے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں اُلٹی ضد

پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں۔ میں کیا عام آدمیوں کے لیے لکھتا ہوں؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو غلوں سے خالی ہے۔ یکسر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنف ہوں، خالق ہوں، میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ آب دار موتی دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے۔ اس کی عظمت کا اندازہ کیجیے۔ لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود سا جو باجی کا پتا پوچھتا پچرا۔ کسی سا جو باجی کا پتا بتائیے۔ بلکہ کسی سا جو کا پتا بتائیے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا ”آپا خوب ہے۔ بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی سا جو باجی کا پتا بتائیے۔“

شاہراہِ ریشم

رپورٹاژ

پھڑپھڑ

”اُرسے! لیڈ نے پیچ ماری ”دہ دکیو، دہ!“
 سب کی نگاہیں آگے کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے نہ شاہ تھی، نہ راہ تھی، نہ ریشم تھا۔
 جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سڑک پر چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن سے
 چینی یوں چھٹے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلیوں سے چوڑے۔ چینی ہی چینی۔ چوڑے ہی چوڑے۔
 ڈرائیور نے فوراً دہیل گیز لگایا۔

جیب پتھروں کے ڈھیر پر ریگنے لگی۔ سواریاں اُچھلنے لگیں۔ بھٹیاری کی کڑاہی میں
 دانے بھٹنے لگے۔ جیب کے پیچھے ڈیڑھ دو سوڑک ہو نکلتے، شور مچاتے، ڈولتے ہوئے، پتھروں
 پر لڑھکے لگے۔

دائیں بائیں، دونوں جانب، سنگلاخ چٹانوں کی اُدچی اُدچی دیواریں کھڑی تھیں۔
 نہ درخت، نہ بھاری، نہ ٹہنی، نہ پتہ۔ سر پر سوڑج بے رحمی سے چمک رہا تھا۔ سڑک پر سائے کا
 نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، نہ کوئی گاؤں نظر آ رہا تھا، نہ گھر۔
 جیب ریگتی رہی۔ لڑھکتی رہی۔

ہر چند میل کے بعد چینی کیمپ آجاتا۔ دس بارہ دم پخت قسم کے خیمے، جن کے قریب فزٹیر
 فوس کا سیکورٹی حوالدار بندوق اٹھائے، گدون گرائے، ہو پتھر لٹکائے کھڑا تھا۔

دو دویہ سسنان، دیرلان، چٹیل چٹانوں سے گرمی کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ پٹرول کی
 بوساری وادی میں پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے دُور نہ جانے کہاں دریا بہ رہا تھا۔ کھیتوں کا چھتا بھنا

رہا تھا۔

صدیاں بیت گئیں۔ جیب کا چھکڑا رینگٹا رہا۔ ٹرکوں کا قافلہ طحلتا رہا۔ سورج گردش کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس نے ہمارے سروں پر جھنڈا گاڑ لیا۔

دفعہ ایک دھچکا لگا اور جیب رُک گئی!

سامنے پتھروں کے ڈھیر، برچینیوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ ہاتھ اٹھا رکھے تھے سب ایک زبان ہو کر چلا رہے تھے "چون۔ چون۔ چن چن۔ جیٹن جیٹن۔ بلاشٹن بلاشٹن"۔
"یہ کیا تماشا ہے؟ لیڈر غزایا۔"

"جیٹنی تماشا" وٹ بولا۔

"بلاشٹن کا مطلب؟ انجینئر نے پوچھا۔"

"ٹن کا مطلب تو واضح ہے۔ بلاشٹن کا پتا نہیں!"

"یہ کیا وٹ بھاڑنے کا موقع ہے؟ لیڈر نے منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے کہا۔"

"وٹ اور وٹھ میں کچھ زیادہ فرق نہیں" داستان گو بولا۔ شاعر نے تمغہ مارا۔

اتنے میں جیٹن کیسے ملے خیمے سے حوالدار بندوق اٹھائے آگیا۔

"کیا بات ہے، حوالدار؟ ڈرائیور نے پوچھا۔"

"صاحب، آگے بلاسٹنگ ہو رہا ہے۔ ٹریفک بند ہے۔ بلاسٹنگ ہو گا تو اُد پر سے

پتھر گرے گا۔ سواری لوگ نیچے اتر آئیں۔ ٹرکوں تلے کور" لے لیں۔ جلدی جلدی، صاحب!

جلدی!"

"کب تک ٹریفک بند رہے گا، خان؟ ڈرائیور نے پوچھا۔"

"دودن" حوالدار نے مونچھ پر تاد دیا۔

"دودن؟ سب نے حیرت سے دہرایا۔"

"ہم کب تک ٹرکوں تلے کور لیے رہیں گے؟" لیڈر غصے سے غزایا۔

”جب تک ہمارا مُرتا نہ بن جائے، دُٹے ہنسا۔

دُٹا... دُٹا... دُٹا... ایک دھماکا ہوا۔ پہاڑوں نے دُہرا کر اُسے خوفناک بنادیا۔ دُڑ کر سب نے جیب سے پھلانگیں لگادیں، اور کُدر لینے کے لیے ٹرکوں کی طرف بھاگے۔

ہم کل سات تھے؛ لیڈر، انجینئر، داستان گو شاعر، وٹ، ڈرائیور اور میں۔ ہمارا مُشکل یہ ہے کہ ساتوں بہت سیانے ہیں، ضرورت سے زیادہ سیانے۔ ہمارا ہر رُکن مذہب، سیاست، ادب، دفتریات، سائنس، فلسفہ غرض ہر موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس لیے دُوسروں کو سمجھانا اور راہِ راست پر لانا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔ اور چونکہ حرفِ آخر ہے، اس لیے دُوسروں کی بات سُننا یا اسے سمجھانا اس کی شان کے منافی ہے۔

دُنیا داری میں ہم سب الیپ کے سیانے کو تے کی طرح پانی کی سطح اپنی چونچ تک اُبھارنے کے لیے مرتبان میں پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔

ہم ساتوں رنگ رنگ کے مکے ہیں۔ کوئی چوکور، کوئی گول، کوئی مخروطی، جو بد قسمتی سے ایک لڑی میں پرورے گئے ہیں۔ اس لڑی کا نام ہے ”چھڈیاری“۔

چھڈیاری ایک چوکڑی ہے جو اتفاقاً وجود میں آئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک روز اُن جانے میں ہم سب پر ایک دیانت بھرا لمحہ نازل ہو گیا۔ اس کے تحت ہم سب نے غمخس کیا کہ سیانف اور معتبری کا بوجھ ہم کو بھروسے سے زیادہ بوجھل ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ہر سال آٹھ دس دن کے لیے تمام بوجھوں اور بندھنوں پر ”چھڈیاری“ کہ کر باہر نکل جایا کریں، اور چھڈیاری منائیں۔ چھڈیاری کے بنیادی قوانین بظاہر بڑے آسان ہیں۔ پر ہیں بے حد مشکل؛

۱۔ کہ ہر سال دس بارہ دنوں کے لیے چھڈیاری ماننا لازم ہوگا۔

۲۔ کہ باہر جاتے وقت اپنے اپنے سیانے معززہ عمدے دار کو گھر چھوڑ کر جانا ضروری ہے۔

۳۔ کہ باہر جانے سے پہلے ہر کوئی اپنے اندر کے دم بختِ مظلوم بچے کو باہر نکالے گا۔
اس کا مٹھ دھوئے گا، چوڑے گا، پچکا لے گا، پھر کندھے پر بٹھا کر ساتھ لے جائے گا۔
۴۔ کہ اس آؤ تنگ کے دوران کوئی رُکنِ عقل کی بات کرنے کی کوشش نہیں کرے گا،
اور نہ دوسروں کو عقل سکھانے کی عیاشی کا سزاوار ہوگا۔ البتہ بحث کرنے پر کوئی
پابندی نہیں، کیونکہ بحث ایک معصوم اور بے ضرورت کٹی ہے۔ بحث سے کبھی کوئی
قائل نہیں ہوا۔ بحث نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔

بھٹیاری کے سات بنیادی رکن ہیں۔ سب سے پہلے لیڈر ہے، جس کی جملہ خبریوں
کی وجہ سے اُسے متفقہ طور پر لائف لیڈر منتخب کیا گیا۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ سیانف اور
معتبری کے بوجھ سے ہمیشہ کے لیے اندلی طور پر آزاد ہے۔ اس کے اندر کا بچہ ہمہ وقت اس
کے کندھے پر سوار ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر پہنچ کر اس کے اندر کا شرپا بیدار ہو جاتا ہے پھر اس
کا جی چاہتا ہے کہ کسی لمبری کو کندھوں پر اٹھا کر چوٹی پر گاڑ سکے، جس طرح ہمارے تمام شرپے
کیا کرتے ہیں۔ لیڈر کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ اسے چودھری کہہ کر بلایا جائے۔ مطالبہ صرف کہہ
بلانے کا ہے، سمجھنے کا نہیں۔ پکارنے کے بعد چاہے آپ اُسے اپنے کام میں لگائے رکھیں۔
دہ سودا لائے گا، آپ کے لیے کھانا پکائے گا، برتن دھوئے گا، چائے پکائے گا، اور ضرورت
پڑے تو آپ کے پاؤں دبا لے گا۔ لیکن خبردار! اسے مسلسل چودھری جی کہنا ضروری ہوگا ورنہ
نتائج کی ذمہ داری خود آپ پر ہوگی۔ اس لحاظ سے لیڈر کی حیثیت خالص مردِ حبشی ہے۔

ہمارا دوسرا رکن شاعر ہے۔ شاعر کا زاویہ نگاہ سائنسی ہے۔ نثر نگار کی طرح
سوچتا ہے۔ غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے، لیکن شعر کہتا ہے۔ اچھے اور بُرے مافیٰ شاعر
کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے دفتر کو مندر کا رتبہ دے رکھا ہے۔ شاعر کے اندر
کا بچہ طویل دفتری تہمتیا کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی ذمہ داری شاعر پر نہیں،
بچے پر ہے۔ وہ اس قدر جاندار تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں مر سکا۔

ہمارا تیسرے رکن دٹ ہے۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کو اس کے ماتحت کام کرنا پڑے۔ اگر وہ آپ کا ماتحت بن جائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی۔ حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ خافند کی حیثیت سے چون و چرا ہے۔ لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شفقت ہے۔ مسلسل مفرح مسکراہٹ خدمت گار۔ مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھوار اڑتی رہتی ہے۔ مزاج اور حاضر جوابی کی بنا پر اسے اعلیٰ درجے کا مزاح نگار ہونا چاہیے تھا۔ کیوں مٹھ نہ بانی رہ گیا؟ یہ بھید آج تک نہیں کھلا۔ بہر طور اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہم نے اس کا نام دٹ رکھ دیا ہے۔

ہمارا چوتھا رکن داستان گو ہے۔ داستان گو بڑا گئی آدمی ہے۔ بڑا معروف جاننا پہچانا۔ مگر طبیعت کا برا من ہے۔ ذات پات کا بڑا قائل اُونچا بیٹھ کر بات کرتا ہے۔ لیکن بات کا دھنی ہے۔ باتوں کا ایسا جال پھیلاتا ہے کہ سنسنے والوں میں خود اسیر ہونے کی خواہش چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ ذات کا پٹھان ہے۔ اندر سے خالص اور اوپر سے ”کاٹھا“۔

ہمارا پانچواں رکن انجینئر ہے۔ انجینئر تضادات کی کچھڑی ہے۔ ایک پگڑ میں ایمان بندھا ہے، دوسرے میں کُفر۔ ایک جیب میں فنون کا شوق، دوسری میں مشینوں کی پرستاری۔ اعمال کٹر مسلمان کے۔ خیالات کٹر مادہ پرست کے۔ کندھے پر تصوف کا چولا۔ ماتھے پر حجت کا ٹیکا۔

ہمارا چھٹا رکن ذک لویا ہے، جو اعزازی طور پر ڈرائیوڈ کا کام کرتا ہے۔ اسے مناظر سے دلچسپی نہیں، لوگوں سے ہے۔ لوگوں سے بھی نہیں، اُن کی رہت بہت سے ہے۔ وہ ایک ایسا بادام ہے جس میں دو مغز ہیں۔ ایک صوفی فلاسفر ہے۔ دوسرا شہ انگریز۔ جب وہ یونیورسٹی (ارتقا) کی بات چیر دے تو پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔ اور وہ ہمیشہ تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور یونیورسٹی کی بات چیر دے۔

آخر میں میں ہوں۔ میں جو میں میں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مئی ۱۹۷۷ء میں چھڈیار کا اتفاقہ اکٹھا ہوا۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال سخت پریشان کن تھی۔ ہم سب سیاست میں کود رہے ہیں۔ سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ خوب سمجھتے ہیں۔ لہذا سیاست پر بات کرنا ہمارے لیے بہت بڑی عیاشی ہے۔

ہمارا دوسرا دھنچکا یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو کسی انزم سے وابستگی نہیں۔ ہم سب کو ایک فکر و امن گیر رہنا ہے کہ امن و امان قائم رہے۔ اگر ہمیں یہ یقین دلایا جائے کہ امنِ عامہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو سیاسی لڑائیاں، جھگڑے، فساد ہوتے ہیں تو بسم اللہ ہوں، ہم صورتِ حال پر کتابی بحثیں کر کے دل خوش کر لیتے ہیں۔

ان دنوں ملک کی سیاسی صورتِ حال بڑی پریشان کن تھی۔ سیاسی لیڈروں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مذاکرات میں باتیں ہوتی ہیں ”سب اچھا، سب اچھا“ کی رپوٹیں ہوتی ہیں۔ نہ نتیجہ ہوتا ہے نہ فیصلہ۔

لوگ گھبرا کر سڑکوں پر نکل آئے تھے، کیونکہ کسی ستم ظریف نے قوم کو یاد دلایا تھا کہ ہمارا ایک نصب العین تھا۔ ایک منزل تھی۔ ایک سمت تھی۔ ایک رخ تھا۔

اس روز سیاسی صورتِ حال پر ہماری بہت بحث ہوئی۔ اتنی بحث ہوئی کہ ایک نے ”اگتا کہ کما“ چھڈیار۔

دوسرا بولا ”ہاں، چھڈیار۔“

چھڈیار کی یہ اتفاقہ تحریک زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ سب چلانے لگے ”چھڈیار، چھڈیار۔“ ایک بولا ”خبردار! یہ فرار ہے۔“

دوسرا ہنسنا ”فرار سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ آنکھیں بند کر لو اور خود کو محفوظ کر لو۔“ تیسرے نے کہا ”خوش فہمی ایک دھوکا ہے۔“

چوتھے نے کہا ”خوش فہمی کیا ہے؟ خوش فہمی۔“

پانچویں نے کہا ”چھڈیار۔“

”چھڈیار، چھڈیار“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

یوں اتفاق رائے سے چھڈیار کا فیصلہ ہو گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟ یہ سوال بہت طے تھا سوال ہے۔ جب بھی یہ سوال اٹھتا ہے تو چھڈیار کے ارکان بھی منڈی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تو تو میں میں ہوتی ہے۔ ہمسکامکا ہوتا ہے۔ جو تم پیزار ہوتی ہے۔ منہ زبانی۔ دماغ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب دانشور ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ درجے کے۔ اس لیے آج تک ہم کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے۔

ہمارا لیڈر پہاڑوں کے حق میں ہے۔ وہ پہاڑوں میں پیدا ہوا۔ وہیں پل کر جوان ہوا۔ اُس میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ پہاڑ پر لیوں چڑھ جاتا ہے جیسے کبری۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اپنی اس عظیم صلاحیت کی نمائش کرے۔ نمائش بھی ہو سکتی ہے جب ناظرین موجود ہوں۔ چھڈیار اسے صرف اس لیے محبوب ہے کہ اس کے لیے ناظرین حتماً کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے پہاڑ پر جانا انہیں ضروری ہے۔ اس لیے وہ پہاڑوں پر جانے کے حق میں ہے۔ کرتا ہے، پک نک سے پہاڑ نکال دو تو وہ کو فٹ بن جاتی ہے۔ لہذا میدانی علاقے میں چلنا بے معنی ہے۔

لوک ریاستی سیاست کا دیوانہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہاڑ پتھر ہیں۔ پتھروں سے کیا دل چسپی۔ اصل چیز تو لوگ ہیں۔ لوگوں کو دیکھو۔ ان سے باتیں کرو۔ انہیں سمجھو۔ انجینئر بہت گھوما پھرا آدمی ہے۔ اس نے پاکستان کے دور دراز علاقوں کو دیکھا ہے۔ وہ سب تفصیلات جانتا ہے۔ لہذا ہر بات کے بیچ بول اٹھتا ہے: اُدھر جاؤ گے تو یہ ہوگا۔ اُدھر جاؤ گے تو وہ ہوگا۔

لیڈر کو اس بات پر غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں جانتا ہے۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ جاننے کا حق صرف لیڈر کو حاصل ہے۔ اگر وہ نہیں جانتا تو بھی جانتا ہے۔ کیونکہ لیڈر ہے۔

لوک ریاستی کہتا ہے ”چلو، صحرا میں چلو۔ صحرا کی کیا بات ہے۔ دلائل ایک عجیب عالم

ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ کیا صبح ہوتی ہے! کیا شام ہوتی ہے! سبحان اللہ!“
 ”حاک ہوتی ہے“ لیڈر غزتا ہے ”دھول اُٹتی ہے“

شاعر کے پاس ایک ایٹم قسم کا قہقہہ ہے۔ ایٹم بم حدت اور ہوا کے تھپیڑے مارتا ہے۔ شاعر کا قہقہہ آواز اور تسخر کے تھپیڑے سے مارتا ہے۔ شاعر جسے قتل کرنا چاہے، اس پر قہقہے کا بم چلا دیتا ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ طبعا وہ طرف دار نہیں۔ لہذا کبھی اس کو مارا کبھی اُس کو۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ اس کی خوشی صرف اس بات پر ہے کہ محفل میں لاشے نظر آئیں۔

داستان گو تماش بینی کا رسیا ہے۔ لوگ بھگڑیں تو اُسے خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بھگڑا نمٹانے کے بجائے اسے ہوا دیتا ہے۔

وٹ بھگڑے میں پھول پتیاں سماتا رہتا ہے اور یوں ریلیف سمیٹتا رہتا ہے مقصد یہ نہیں کہ قہقہہ لگے اور بھگڑا ختم ہو، بلکہ یہ کہ پارٹیاں تازہ دم ہو کر بھگڑیں۔

رہا میں، تو آپ سے کیا پردہ۔ مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو دوسروں کے بھگڑوں میں ملوث ہونے سے بچا پھرتے ہیں۔

غیر صاحب، اس بات پر ہمارا بہت بھگڑا ہوا کہ جاؤں تو جائیں کہاں؟

ایک نے کہا ”نیم دادی میں جائیں“

دوسرے نے کہا ”اتنا وقت نہیں۔“

تیسرے نے کہا ”بالو سر چلیں۔“

چوتھا بولا ”راستہ کھلا نہیں۔“

پانچواں بولا ”چولتان سہی“

چھٹا بولا ”وہاں لیڈر نہیں جائے گا۔ کیونکہ لیڈر صرف وہاں جانا پسند کرتا ہے جہاں ساگ ہو۔“
 یہ ساگ کیا چیز ہے؟ اس کی جھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ چھڈیا رہیں ساگ بہت

اہم ہے۔ بات بات پر ساگ کی بات کرنا بلے حد ضروری ہے۔ بات کریں، ضرور کریں، بار بار کریں۔ لیکن اس کی وضاحت کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر رکن کو اختیار حاصل ہے کہ ساگ کو جو چاہے سمجھے۔

ایک رکن بولا "اب کی بار کافرستان چلو"

دوسرا بولا "وہاں جانے کا تب مزا ہے جب جہنم کے دن ہوں"

تیسرا بولا "یہ سب باتیں چھڑیا کی سپرٹ کے منافی ہیں۔ مقصد چھڑیا رہے۔ کوئی مقام نہیں، منزل نہیں، جگہ نہیں، قیام نہیں۔ کسی ایسی سمت چل دو جہاں چھڑیا کی جنت ہو۔ کوئی خبر نہ ملے۔ نہ ملک کی نہ سیاست کی، نہ ہیرا پھیری کی، نہ گھر کی، نہ دفتر کی۔" شاہراہ ریشم "ایک چلایا۔

پچھلے سال ہمارے دو ارکان کو شاہراہ ریشم پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ پنڈی سے تھانہ کوٹ تک، ۱۳ میل لمبی سڑک پر، ریشم ہی ریشم بچھا ہوا تھا۔ ہزارہ کے پہاڑوں کے نیچوں بیچ ریشم کا اتنا چوڑا تھان بچھا دیکھ کر حیرت سے آنکھیں اُبل آئیں، اور اُبل کر سڑک پر مرکز ہو گئیں۔ پھر نہ پہاڑ رہے، نہ سبزہ زار ہے، نہ وادیاں، نہ چوٹیاں، نہ ساگ، نہ پات۔ ساری کائنات ریشمی سڑک کی اداسی میں آگئی۔ سب کچھ معدوم ہو گیا۔ صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔ "میں نہیں مانتا" لوک چلایا کہ ایسی سڑک بھی ہو سکتی ہے جو سر اٹھا کر دیکھے نہ دے۔ "ہو سکتی ہے۔ ہے۔ ہے۔"

"کیا پاکستان میں ہے، وہ سڑک؟"

"ہاں پاکستان میں"

شاعر کا تہقہ گو نجی "چھڑیا"

پھر وہی ہوا جو ان حالات میں ہوتا ہے۔ یعنی شرط بد گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ شرط تو صرف بد کرتی ہے۔ پوری کرنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ البتہ شرط بدنے کا ایک

فائدہ ضرور ہوا کہ شاہراہ رشیم پر جانے کا فیصلہ پختہ ہو گیا۔

فیصلے کے بعد دوسرا مرحلہ تیاری کا ہوتا ہے۔ تیاری کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک سامان تیار کرنا، دوسرا خود کو تیار کرنا۔ اگر آپ پک نمک پر جائیں تو سامان تیار کرنا بے حد اہم ہوتا ہے، اور خود کو تیار کرنا قسطی اہم نہیں ہوتا۔ چھڈیاری کے تحت سامان تیار کرنا قسطی اہم نہیں ہوتا۔ خود کو تیار کرنا بے حد اہم اور دشوار ہوتا ہے۔ چونکہ چھڈیاری کے منشور کی دوسری شق کے مطابق ہر رکن پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بوجھ اور اپنی اپنی گھڑیاں گھر چھوڑ کر جائے۔ اگر آپ اپنے عہدے کی گھڑی، معتبری کی گھڑیاں، اپنی ٹیں کی گھڑی گھر چھوڑ دیں تو پھر سفر میں ہلکے پھلکے رہتے ہیں۔ جولا، کھالیا۔ جہاں رات پڑ گئی، پڑ کر سو گئے۔ مُنہ دھویا نہ دھویا۔ بال بنائے نہ بنائے۔ کپڑے بدلے نہ بدلے۔ بلکہ ہمزہ سے کہ نہ بدلے۔ دھول میں بیٹھ گئے۔ سڑک پر لیٹ کر سو گئے۔ جب ٹیں نہ رہے تو سامان اہم نہیں رہتا۔ لیکن ٹیں کو خود سے اُتار پھینکنا مشکل ہے۔

چھڈیاری کا مطالبہ ہے کہ بے سروسامانی میں سفر کرو۔ سامان سر پر اٹھا کر بسوں کے پیچھے بھاگو۔ سواروں میں ٹکس ٹکس کر بیٹھو۔ ریسٹ ہاؤس ریز رو نہ کرو۔ بلکہ جا کر چوکیدار کی منتیں کرو۔ اُسے بخشش کا لالچ دو۔ وہ نہ کر دے تو از سر نو تازہ دم ہو کر منتیں کرو۔ پھر بھی نہ مانے تو ٹلو نہیں، وہیں بیٹھے رہو اور تیموں کی طرح اس کی طرف دیکھتے رہو۔ سفر کے دوران بازاء اور سڑکوں پر چلتے ہوئے عوامی چیزیں کھاؤ۔ مثلاً چنے چھاؤ، گنڈیاں چوسو، گنے کا ٹکڑا مل جائے تو بسمان اللہ۔ کپڑے کھاؤ تاکہ دیکھنے والے تمہیں خواص نہ سمجھیں، اور تمہارے اندر کا عہدیدار یا دانش ور سر نہ اٹھائے۔ گراب کی بار شاہراہ رشیم جاتے وقت ہم سے ایک بھول ہو گئی۔ لیڈرنے کہا ”بھئی، بسوں کا کیا ہو گا؟“

شاعر بولا ”وہی جو ہوتا ہے۔ یعنی بسیں چلیں گی۔ بسوں کی یہی بُری عادت ہے۔“

چلتی رہتی ہیں۔“

”مگر پہنچتی نہیں“ وٹ نے لقمہ دیا۔

انجینئر نے کہا ”یہاں سے ایبٹ آباد، ایبٹ آباد سے مانسہرہ تو عام ملیں گی۔ مانسہرہ سے بمشام کی بھی مل ہی جائیں گی۔ لیکن بمشام سے چلاس تک کا پتہ نہیں۔ چلاس سے گلگت تک ضرور ملے گی۔ گلگت سے ہنزہ بھی ملے گی۔ ہنزہ سے خجراب کا پتہ نہیں۔“

”پتا نہیں، پتا نہیں“ لیڈر نے قہقہہ لگایا ”کچھ پتا بھی ہے تجھے؟“

”ٹھیک تو ہے“ وٹ بولا ”جب سڑک پر ریشم بچھا ہے تو بس نہ ملنے کا مطلب؟“

”بھئی، بس ریشم نہیں دیکھتی۔ سواری ڈھونڈتی ہے۔ سواری ہوگی تو چلے گی۔“

انجینئر بولا۔

”بھئی، سواریاں ہم جو ہیں“ وٹ نے کہا۔

”بالکل ہیں“ شاعر نے قہقہہ لگایا۔

”بھئی، بس کے لیے وہ سواری نہیں ہوتی جو اندر بیٹھی ہو۔ وہ ہوتی ہے جو باہر

نکلے“ داستان گو نے کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے“ وٹ بولا ”ہم تو اندر بیٹھیں گے۔ باہر کون نکلے گا؟“

”باہر لیڈر کو نکلکا دیں گے“ شاعر نے قہقہہ لگایا۔

”پھر تو ٹھیک ہے“ انجینئر نے کہا۔

”ساتھ ساگ پات بھی دیکھتا جائے گا“ داستان گو بولا۔

”میں بتاؤں“ لوک نے کہا ”مانگے کی جیب میں کیوں نہ چلیں“

”وہ کہاں سے آئے گی؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”یہ بات مجھ پر چھوڑ دو“ لوک نے جواب دیا۔

”ارے! سب خوشی سے چلا اٹھے۔“

”لیکن ہاڈوں پر ڈرائیونگ کون کرے گا؟“ انجینئر نے طنز اُٹھایا۔

”میں کروں گا“ لوک بولا۔

اس چھت پھاڑ قسم کی آفرید سب بوکھلا گئے۔ یہ ہماری سب سے پہلی اور فاحش غلطی تھی۔ ایک ایسی حماقت جس کا خیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ بظاہر تو یہ خالص خوش قسمتی تھی۔ کون نہیں چاہتا کہ سفر پر اپنی گاڑی ہو، اپنا ڈرائیور ہو۔ جہاں چاہا رک گئے۔ جہاں تک چاہا، رکے رہے۔ جب چاہا، چل پڑے۔ اس خوش نعمتی کا سب سے بڑا اثر تو یہ ہوا کہ ہم سب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر اگردن اکڑا کر، مونچھ مروڑ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ معزز عہدے دار، جسے ہم سب بعد شکل شانوں سے آوارہ گھر پھوڑا گئے تھے، ہمیں اپنی جیپ میں سوار ہوتے دیکھ کر پک کر پھر سے کندھوں پر آچڑھا۔ جیپ میں سوار ہونے سے پہلے لیڈر غزیا ”بوائز! پہلے جائزہ لو کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔“

لوک آگے بڑھا اور بولا ”لیڈر! سر! آپ کو علم ہونا چاہیے کہ جیپ سفر کے لیے کیل کاٹے سے لیس ہے۔ ہمارے پاس کیا نہیں۔ سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس دو خیمے ہیں۔“

”خیمے؟“ سب چلائے۔

”ہاں، خیمے“ لوک کے اندر کا انگیز باہر نکل آیا ”یہ خیمے آپ ہر جگہ لگا سکتے ہیں۔ پہاڑ پر، دریا کے کنارے، ریت پر، جنگل میں، کہیں بھی۔“ اس نے سیلزمین کی طرح دوپٹی ہوئی چھڑیاں باہر نکالیں اور فخر سے بولا ”دیکھیے حضرات، یہ کتنی کم جگہ گھیرتے ہیں۔“

”یار، یہ چھڑیاں تو رنگ دار بھی ہیں“ وٹ بولا۔

”چھڑیاں نہیں، خیمے“ لوک نے کہا ”خیمے سمجھتے ہو؟“

”یہ رنگ دار خیمے تو ہمیں مون خیمے لگتے ہیں“ انجینئر بولا۔

”تو پھر اپنی اپنی بیویاں ساتھ لے چلیں“ شاعر نے قہقہہ مارا۔

”لا حول ولا۔ چھڈیا میں بیویاں ساتھ لے جاؤ“ لوک ہنسا۔

”اور کیا کیا اکو پمٹ ہیں، اس جیپ میں؟“ وٹ نے لوک سے ٹوچھا۔

”ہر قسم کی اکو پینٹ۔ ادنا، ریپ ریکاڈر، مائیکروفن، کیمرا، دوربین اور ہڑول کے بھرے ہوئے کین“

”یار، ہم کیا پروفیشنل ٹور پر جا رہے ہیں؟ انجینئر چلا یا۔

”بھئی، کوئی کھانے کی چیز بھی ہے؟“ وٹ نے پوچھا کہ اکو پینٹ پر ہی گزارہ ہوگا؟

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ شاہراہ رشیم پر تو ہوٹل ہی ہوٹل ہوں گے“

”پھر بھی ایجنسی کے لیے ہم نے دو درجن تافٹانے لے لیے ہیں۔“

”وہ کیا ہوتے ہیں؟“

”میدے میں انڈا گھی ڈالو اور تندور میں روٹیاں لگا لو“

”دیکھو، بوائیز“ لیڈر چلا یا ”میں لیڈر ہوں۔ میں تمہاری ہر ضرورت کا ذمے دار ہوں۔

راستے میں عیش کراؤں گا۔ پراٹھے اور بھنا گوشت کھلاؤں گا۔ چائے کافی جب طلب کرو“

”اور ساگ پات؟“

”بکنیں“ لیڈر غصے میں آگیا ”لوک رسیا، تم ڈرائیور ہو۔ آئن یور سیٹ۔ بوائیز!

گٹ ان اینڈری گو“

سب سے پہلا مرحلہ ایئر پورٹ پر جا کر داستان گو کو ریسو کرنا تھا، اور وہاں سے آئن دی روڈ۔

ایئر پورٹ پر داستان گو ایک بڑی سی بوری اٹھائے ہوئے برآمد ہوا۔

”ارے؟“ سب چلائے ”اتنی بڑی بوری!“

”خان، کیا راستے میں اخروٹوں کا کاروبار کرو گے، جو بوری بھر کر لے آئے ہو؟“

”احمقو!“ داستان گو بولا ”یہ بوری نہیں، ہیورسک ہے“

”ہیورسک!“ سب چلائے۔

”تھیں پک نمک پر جانے کا سلیقہ ہو تو معلوم ہو کہ ہیورسک کے بنیر پک نمک پر

جانا ممکن نہیں۔“

”اے ابھر ہم کیسے جا رہے ہیں؟“ دٹ بولا۔

”گھبراؤ نہیں،“ ڈائٹور نے آنکھیں چمکائیں، ”ہمارے پاس سات سیلپنگ بیگ ہیں۔“

”یک نہ شدید دوشد“ انجینئر ہنسا۔

”چھڈیار“ شاعر نے قہقہہ لگایا۔

”اچھا، چھڈیار ہے یہ“ لیڈر ہنسا، ”کہ ساتھ خیمے ہیں، سیلپنگ بیگ ہیں ہیوریک

ہے۔“

”برخوردار، پہلے سیاح بننا سیکھو، پھر بات کرو“ داستان گونے دبی زبان سے کہا۔

”سٹیلنس پلیز!“ ڈائٹور نے اعلان کیا ”دی آر آن دی روڈ“ — اور جیپ

چل پڑی۔

تھا کوٹ

جیب چلانے سے پہلے ڈرائیور نے اعلان کیا "ہمارا پہلا پڑاؤ اہل ریسیٹ ہاؤس ہے۔ وقت کم ہے، فاصلہ زیادہ۔ لہذا گاڑی راستے میں کہیں نہیں رُکے گی۔"
 "ارے؟ وٹ بولا" یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا۔ حکم صادر کر رہا ہے۔
 "بوائے؟ لیڈر نے غصے میں کہا "گاڑی روکنا یا چلانا میرا کام ہے۔ میں لیڈر ہوں۔"
 "لیکن رات پڑنے سے پہلے گاڑی کو اہل ریسیٹ ہاؤس تک پہنچانا میرا کام ہے" ڈرائیور بولا۔

"یار یہ تو میدانی علاقہ ہے" شاعر نے کہا "تم تو پہاڑی علاقے کے لیڈر ہو۔ جب پہاڑ پر پہنچیں گے تو بے شک تمہارا حکم چلے گا۔ فی الحال جو وہ کہتا ہے اُسے کہنے دو۔"
 گاڑی ایبٹ آباد کے بازار میں پہنچی تو سب نے شور مچا دیا "روکو، رکو، رکو" "معقول دجہ کے بغیر گاڑی نہیں رُکے گی" ڈرائیور بولا۔
 "لیڈر، میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا تھا" وٹ چلایا "کہ مانگے کی گاڑی میں دھجوا اپنی لیڈری کھو بیٹھو گے۔"

"روکو، رکو" سب نے شور مچا دیا۔
 "میں حکم دیتا ہوں کہ گاڑی رکو" لیڈر غر آیا۔
 "بھئی، بھئی گوشت کی خوشبو آ رہی ہے" شاعر بولا۔
 "یہ ڈرائیور کیسا مسلمان ہے، لیڈر، جو بھئی گوشت کی خوشبو پر بھی نہیں رکتا؟ وٹ نے کہا۔"

”مک جاؤ، مک جاؤ“ لیڈر غزرا ”ہیں یہاں سے ایک کیتلی خریدنی ہے۔“
 ”بالکل ٹھیک۔ ہاں بھی، گوشت کی خوشبو پر رکنا لازم ہے، بشرطیکہ کیتلی خریدنے کا بہانہ موجود ہو“ شاعر ہنسا۔

جیب مک گئی۔ سامنے ادین انیر ہوٹل میں سیخوں پر سٹکے جھونے جا رہے تھے۔
 ”ہم یہاں بیٹھ کر تنکے کھاتے ہیں۔ لیڈر بازار جا کر کیتلی خرید لائے“ انجینئر نے کہا۔
 ”بالکل ٹھیک“ شاعر نے قہقہہ لگایا ”جس کا کام اسی کو سچے۔“
 ”لیکن تم نے کیتلی کس لیے خریدنی ہے؟ داستان گو نے پوچھا۔
 ”راستے میں چائے بنانے کے لیے“ لیڈر بولا۔

”چائے بنانے کے لیے کیتلی نہیں، تام لوٹ خریدنا چاہیے“ داستان گو نے کہا۔
 ”تام لوٹ؟ سب نے حیرت سے دہرایا ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”کیتلی صرف چائے بنانے کے کام آتی ہے“ داستان گو بولا ”تام لوٹ میں چائے بنا لو،
 دودھ گرم کر لو، شیو کر لو، کنوئیں سے پانی نکال لو، ہنڈیا پکا لو۔“
 ”اور گوری کے نام لو لیٹر بھیج دو“ وٹ نے نکتہ دیا۔
 ”ہاں، ہاں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے“ داستان گو چلا یا۔
 ”ہٹا ڈیار، اس بھگڑے کو۔ جو خریدنا ہے، خرید لو۔ ہم یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کریں گے“ انجینئر نے کہا۔

جب لیڈر اور داستان گو تام لوٹ خرید کر بازار سے لوٹے تو شاعر نے قہقہہ لگایا
 ”یہ تام لوٹ ہے کیا؟ بھئی، یہ تو ڈول ہے ڈول۔“
 ”جس بات کی سمجھ نہ ہو، اس میں دخل نہیں دیا کرتے“ داستان گو بولا۔
 ”بالکل درست“ انجینئر نے کہا ”پہلے تام لوٹ اور ڈول میں تمیز کرنا سیکھو۔ پھر

بات کرو۔“

”تھیں اتنا بھی پتا نہیں“ ڈرائیور بولا کہ ڈول تو بڑا ہوتا ہے۔
 ”بھئی، یہ تو شاعر ہے۔ اسے کیا پتا کہ بڑا کیا ہوتا ہے، چھوٹا کیا ہوتا ہے“ انجینئر ہنسا۔
 تنگے کھانے کے بعد ہم ایبٹ آباد سے روانہ ہو گئے۔ مانسہرہ کے بعد دفعۃً لیڈر
 چلایا ”روکو، رکو“

”کیوں؟ وجہ؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”یہ بفع ہے“ لیڈر نے کہا۔

”بفع کیا ہوتا ہے؟“

”اس گاؤں کا نام ہے“

”چلو، مان لیا کہ یہ بفع ہے“ ڈرائیور بولا ”پھر؟“

”یار، یہ ہمارے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کا گاؤں ہے۔ اس لیے رکنانِ مزدوری
 ہے“ انجینئر طنزاً ہنسا۔

”ہمارے سیاسی لیڈروں کا سب سے بڑا گاؤں تو اسلام آباد ہے۔ وہیں لے کے رہتے۔
 ادھر آنے کی تکلیف کرنے کی مزدورت ہی کیا تھی؟“ شاعر نے کہا۔

”ارے نہیں“ لیڈر غر آیا ”بفع کا کھویا بہت مشہور ہے۔ بالکل خالص ہوتا ہے۔“

”میں نہیں مانتا“ شاعر بولا ”کہ سیاسی لیڈر کے گاؤں کا کھویا خالص ہو“

”ہو ہی نہیں سکتا“ وٹ بولا۔

”بھئی، ہے، ہے، ہے“ لیڈر نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوگا“ ڈرائیور نے گاڑی تیز کر دی۔

”ٹھہرو، ٹھہرو۔ پہلے فیصلہ کر دو کہ لیڈر کون ہے“ لیڈر چلایا۔

”ہاں بھئی، یہ ٹھیک ہے۔ یہ ڈرائیور تو لیڈر بن بیٹھا ہے“

”بالکل نہیں“ ڈرائیور بولا ”میں تو ڈرائیور رہوں“

”اور میں کنڈکٹر ہوں“ لیڈر نے کہا ”کنڈکٹر کا کام جاننے ہو؟“
 ”کنڈکٹر کا کام تو سواروں سے لڑنا بھگڑنا ہوتا ہے، اور ڈرائیور کا گاڑی چلانا“
 شاعر نے کہا۔

”نہیں، نہیں“ لیڈر بولا ”یہ گاڑی میرے کنبے پر چلے گی۔ میرے کنبے پر رُکے گی۔“
 گاڑی رُک گئی۔ لیڈر نے پھلانگ لگائی اور گاڑی کی گیلیوں میں غائب ہو گیا۔ جب
 وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک بڑا سا ڈنڈا تھا، جس میں بھورے رنگ کی کوئی چیز بختی۔
 ”ارے! یہ تو لٹی نظر آتی ہے۔ پھٹک رہی ہے۔“ دٹ بولا۔

”ایسا کھویا تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔“
 ”بل یار، کھویا تو قائم ہوتا ہے۔ ٹھوس ہوتا ہے۔“
 ”بھئی، یہ سیاسی کھویا ہے۔ قائم کیسے ہو؟ یہ تو پھٹکے گا۔“
 دفعۃً انجینئر چلا ”کوہم شاہراہ ریشم پر چڑھ گئے۔“ سب کی توجہ سڑک پر مرکوز
 ہو گئی۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

”یہ سڑک تو بھئی، ریشمی نہیں محملی ہے“ ڈرائیور بولا ”گاڑی کتنی ہے، مجھے چھوڑ دو، دو کو
 نہیں۔“

”میں نے کہا نہ تھا“ لیڈر چلا یا۔
 ”یار، اتنی چوڑی سڑک! شاعر بولا۔
 ”مال روڈ لگتی ہے۔“
 ”اُونہوں۔ مال روڈ کی اماں کہو۔“

ارد گرد پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں جن میں ہر مالی کے کارپٹ بچھے ہوئے تھے، اور
 نیچے وہ محملی سڑک تھی۔ اتنی چوڑی، اس قدر ہموار کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”میں نے کہا نہ تھا“ لیڈر چلا یا ”یہ سڑک کسی کو سرائی نہ نظر کو دیکھنے نہیں دیتی،“

”یار، میرے چٹکی بھرنا“ دٹ بولا۔

”اُونوں۔ دیکھتے رہو۔ خواب دیکھتے رہو۔“

دیر تک جیب میں خاموشی طاری رہی۔ سب سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ جیب کے پیٹے بھی خاموش ہو گئے تھے۔

”یہ تو جیب پر بہت بڑا ظلم ہو گیا“ ڈرائیور بولا ”آٹھ روز اس سڑک پر چلنے کے بعد یہ واپس پنڈی کی سڑکوں پر کیسے چلے گی؟“

”تم کیوں چُپ ہو؟“ لیڈر نے دٹ سے پوچھا۔

”سڑک کو دیکھ کر اس کی دِٹ وٹھن کر رہ گئی ہے“ داستان گونے دبی زبان سے کہا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں“ دٹ بولا ”کہ یہ سڑک کس نے بنائی ہے؟“

”یہ سڑک چین اور پاکستان کے اشتراک سے بنی ہے، مانسہرہ سے چینی سرحد خجڑاب

تک۔“

”وہ تو ٹھیک ہے“ دٹ بولا ”اشتراک تو ہے، لیکن بنائی تو پاکستانیوں نے ہے نا۔“

”پاکستانی کا دیگر تو بہت ہیں۔ اس میں شک کیا ہے۔ لیکن انھوں نے ہماری ٹرمینیشن

کو برباد کر دیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”بھئی، شندھ مسالا لگا دیا۔ سمجھ لو کہ ہماری ریت کا جنازہ نکل گیا۔“

”ہاں، کہتا تو ٹھیک ہے“ لیڈر ہنسا۔

”اتنی چوڑی سڑک پہاڑوں پر بنادینا، انسان کا نہیں، جنوں کا کام ہے۔“

”یہ چینی جن ہی تو ہیں۔“

”جن تو بھئی، ہم بھی ہیں“ داستان گونے کہا ”بس مفاد بی بی کے سر پر چڑھے ہوئے ہیں۔“

”وہ دیکھو،“ لیڈر چلاتا ”وہ پہاڑی پر گاؤں۔“

”گاؤں پہاڑیوں پر ہی تو ہوتے ہیں۔“

”نہیں، نہیں“ وہ بولا ”دیکھو تو، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بتی گاؤں ہو۔“

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پہاڑ کے اُپر گاؤں لیں بنا ہوا تھا جیسے کوئی بڑا سا پگھڑا ہو۔ پہاڑی کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں سے سورج کی شہری شعاعیں پھن پھن کر پہاڑی کی چوٹی پر پڑ رہی تھیں۔ نیچے اندھیرے رینگ رہے تھے اور ان کے نیچے کالی مٹل کی سڑک بھی ہوئی تھی۔

سب خاموشی سے سڑک کو دیکھنے میں غوطے۔ دقت تھم گیا۔ سڑک ابھرتی گئی، ابھرتی گئی، حتیٰ کہ کائنات پر چھا گئی۔

دفعۃً گاڑی سڑک چھوڑ کر پہاڑی کی طرف مڑ گئی۔ جیپ کی سواریاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔

”ارے! یہ کیا کیا، ڈرائیور؟ لیڈر غمزایا۔“

ایک اور دھچکا لگا۔ دوسرا موٹر گاڑی کہ جیپ رُک گئی۔

”لو، ہم اہل ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے“ ڈرائیور نے بے نیازی سے کہا۔

سامنے ہموار ٹیلے پر اہل ریسٹ ہاؤس تھا۔ سب گاڑی سے اُتر آئے۔ چوکیدار موجود

نہ تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے پختہ فرش کا چبوترہ بنا ہوا تھا، جسے مسجد کے طور پر کام میں لایا جاتا تھا۔ سب مسجد کے فرش پر بیٹھ گئے۔

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چوکیدار سے کس طرح بات کی جائے؟“ وٹ نے کہا۔

”ان پہاڑی لوگوں سے صرف ایک طریقے سے بات ہو سکتی ہے“ لیڈر بولا ”اسلامی

طریقے سے۔ یہ لوگ پکے مسلمان ہیں۔“

”بس یہی تو خطرہ ہے“ وٹ بولا ”اگر چوکیدار پکا مسلمان نکلا تو بات کرنے کا کوئی

فائدہ نہیں ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی، چونکہ ہمارے پاس پریٹ نہیں لہذا وہ یہیں جگہ نہیں دے گا۔ اور اگر ہم نے رقم پیش کی تو جوتے مار کر ہمیں یہاں سے نکال دے گا۔“ وٹ نے وضاحت کی۔

”ہاں بھئی، ٹھیک کہتا ہے۔ دُعا کرو وہ پکٹا مسلمان نہ ہو“ داستان گوبولا۔

”یار، ہمارے ہاں اسلام نافذ ہو گیا تو“ میں نے کہا ”مشکل پڑ جائے گی۔“

”اسلام تو آگیا بھئی، اب اسے کوئی روک نہیں سکتا“ داستان گوبولا۔

”اونہوں“ شاعر نے کہا ”جب تک سیاست دان موجود ہیں، اسلام نہیں آئے گا۔“

”وہ کیوں، جناب؟“

”بھئی، اسلام سیاست دانوں کے مفاد میں نہیں“ شاعر نے تہققہ لگایا۔

”پھر انھوں نے نظامِ مصطفویٰ کا انوکھوں لگایا ہے؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”انھوں نے نہیں لگایا، غلطی سے لگ گیا ہے“ داستان گوبولا ”جب قدرت کو

منظور ہوتا ہے تو سیاست دان اپنے پاؤں پر خود کھماری مار لیتے ہیں۔“

”ہٹاؤ یار۔ چوکیدار کی بات کرو“ انجینئر بولا ”اس وقت سب سے بڑی حقیقت

چوکیدار ہے۔“

”چوکیدار سے بات کرنا مجھ پر چھوڑ دو“ ڈرائیور نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تم کیسے کرو گے، بات؟“ لیڈر غمزایا۔

”بیورو کریٹ کے انداز میں“ ڈرائیور نے جواب دیا ”جو طریقہ ہمارے ملک میں

سال ہا سال سے رائج ہے۔ بیورو کریٹ بن کر بات کرو تو سب سمجھتے ہیں۔ گاؤں دے دیے بھی،

شہری بھی، دانش ور بھی۔“

”ہٹاؤ یار، بیورو کریٹ کو تو شہری نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں“ انجینئر نے کہا۔

”بالکل، دیکھتے ہیں، نفرت کی نظر سے“ ڈرائیور بولا ”لیکن سر تسلیم خم بھی کر دیتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک، چونکہ تسلیم ختم کرتے ہیں، پھر خود پر غصہ آنے لگتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ خود سے نفرت تو کم نہیں کر سکتے، اس لیے یورو کریٹ سے نفرت کرتے ہیں“ داستان گو ہنسا۔

چوکیدار ایک ڈاڑھی والا جوان تھا۔ اس نے ہمارے لیے ریسٹ ہاؤس کھولنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسلامی اور یورو کریٹ دونوں طریقے فیمل ہو گئے۔ پھر کچھ گرم طریقہ آزمایا گیا۔ اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں باری باری ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ آزمایا۔ آخر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔

”چلو بھئی“ ڈائریور بولا ”لگاؤ نیچے“

”خیموں کی کیا ضرورت ہے۔ بچاؤ سیلنگ بیگ“ اور ہم جیپ سے سامان اُتارنے میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ بھاگا بھاگا آیا۔ زیر لبی انداز میں بولا ”مار لیا میدان!“ سب چوکتے ہو گئے۔

”چوکیدار مان گیا کیا؟“ شاعر نے پوچھا۔

”اونوں۔ مانا نہیں، لیکن ماننے کے واضح آثار پیدا ہو گئے ہیں“ وہ کیسے؟

”چوکیدار کا سر ادا بیوی آگئے ہیں“ سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

”یار تم اتنے جاہل ہو“ وٹ غصے سے جھلایا ”اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، جی حضور یا ہے، اور پیسے کی اہمیت کو جانتا ہے۔ پھر چوکیدار کی بیوی بھی تو ساتھ آئی ہے۔ وہ مسلمان کو راہِ راست پر لے آئے گی۔ بیوی مسلمان کو ہمیشہ راہِ راست پر لاتی رہی ہے۔“

”تو تو سیانا ہو گیا“ داستان گو بولا۔

”دیکھ لو“ دٹ ہنسا۔

”ابھی بتا چل جائے گا“ لیڈر بولا۔

عین اس وقت ایک بوڑھا آدمی قریب آیا۔ بولا ”السلام علیکم۔ صاحب جی،

یہاں نہ لیٹئے۔ ادھر سانپ ہوتے ہیں۔“

”تو پھر ہم برآمدے میں پڑ رہیں گے“

”نہیں“ وہ بولا ”صاحب! بکرمہ سونے کے لیے اچھی جگہ نہیں۔ آپ اندر ہی آجائیں“

اس کے عقب میں چوکیدار ریسٹ ہاؤس کا تالا کھول رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان رکھ کر ہم سب نے چھڑیاں سنبھالیں اور باہر سریر کو نکل گئے۔

چاند نکل آیا تھا۔ غالباً وہ چاند کی تیرھویں یا چودھویں رات تھی۔ چاندنی میں سڑک چمک رہی تھی۔ ارد گرد پہاڑیاں اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھیں۔

”یار، یہ ہزارہ کا علاقہ کتنا خوبصورت ہے“ ڈرائیور نے کہا۔

”اور زرخیز بھی تو ہے“ انجینئر بولا۔

”یہاں کے لوگ پکے مسلمان ہیں“ لیڈر نے کہا۔

”پکے مسلمان وہیں ملتے ہیں جہاں سے شاہراہ دُور ہو“ داستان گو بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”بھئی، شاہ راہ آئی تو نئے شوشے آئے۔ اپنے اور لگتوں کی قدریں ختم ہوئیں“

”بالکل غلط“ شاعر بولا ”مری کو دیکھ لو۔ سالہا سال سے مری ایک تفریح گاہ ہے۔

کہتے ہیں کہ جہاں تفریح گاہ ہوگی وہاں مقامی لوگوں کے اخلاق تباہ ہو جائیں گے۔ عورتیں بیکس

لگی۔ مرد بھڑوے بن جائیں گے۔ لیکن مری نے یہ مفروضہ غلط ثابت کر دیا۔ آج تک مری کی کسی

مقامی خاتون نے مال روڈ پر قدم نہیں رکھا۔“

”یار، بات تو عقیقہ کرتا ہے، تو“ لیڈر بولا۔

”یاد رکھو، شاہراہ ہزار یوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

”اونوں“ ڈرائیور بولا ”یہ شاہراہ مری جیسی تفریحی شاہراہ نہیں ہوگی۔ جب چین کی دیوہیکل بسیں ادھر چلیں گی تو ہزارے کی شکل بدل جائے گی۔“

”پھر تو یہاں کی مسلمانی بھی چند روزہ سمجھو“ میں نے کہا۔

”مطلب یہ ہوا کہ شاہراہ سسر اور پوری کا سا اثر رکھتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھلوا دیتی ہے، شاعر نے تمغہ لگایا۔“

”ذرا سوچو“ ڈرائیور بولا ”جب یہ شاہراہ حرکت میں آئے گی تو کیا ہوگا۔ ہزارہ کے یہ مزاح، جو آج مشکل سے دو وقت کی روٹی کھاتے ہیں، خوش حال ہو جائیں گے۔ یہاں جگہ جگہ ہوٹل اور سٹور کھل جائیں گے۔ یہ باغات، جن کا میوہ منڈی تک نہیں پہنچ سکتا، کیش کراپ پیدا کریں گے۔“

”بالکل، بالکل“ انجینئر بولا۔

”اور یہاں چل پل ہو جائے گی۔ اکنامک ایفلوائنس“ ڈرائیور نے دانش مندانہ انداز سے کہا۔

”ہاں“ داستان گو بولا ”یہاں وہی چل پل ہو جائے گی جو ہمارے شہروں میں ہے۔ لوگ مفاد کے چکر میں پڑ جائیں گے، اور تباہی کا وہی منظر یہاں بھی نظر آئے گا جس کے ہم شکار ہیں۔“

شاعر ہنسنا ”اسی کو ڈیولپمنٹ کہتے ہیں۔ ترقی یا ڈیولپمنٹ اسلام کو بخیر و شر رکھ دیتی ہے۔ ایمان کو دھوکہ صاف کر دیتی ہے۔ لگتوں کی گفتگو ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔“

داستان گو نے ہاتھ اٹھا کر کہا ”یا اللہ! اس اکنامک ایفلوائنس سے محفوظ رکھ۔“

”آمین!“ شاعر بولا۔

”لیکن“ میں نے بات کرتی چاہی۔

”یہ لیکن اگر مگر جو کچھ چنانچہ ہی تو تہذیب کے ستون ہیں“ وٹ نے کہا۔

”چھٹیاریا“ شاعر نے قہقہہ مارا ”ہم تو بھگوان گوتے ہیں۔ تہذیب، دانشوری اور سیاست سے بھاگے ہوئے۔ بڑی مشکل سے جان بچوا کر آئے ہیں۔ اب یہیں آکھ دن تو جی لینے دو۔“

”جو بھائی، جیو“ لیڈر ہنسنے لگا۔

”یہ دیکھو۔ یہ چھائی ہوئی گہری خاموشی۔ اس کی بات سنو“ داستان گودنے بات شروع کی۔

”ہاں، ہاں۔ وہ بول رہی ہے۔ کچھ کہہ رہی ہے“ وٹ نے روٹا اٹکایا۔

”سنو، سنو“ سب نے شور مچا دیا۔

وادئ میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کی آواز میں عجیب سا یدم تھا۔ دو طرفہ اندھیر کی دیواریں کھڑی تھیں۔ دور کوئی گارہا تھا۔ بین کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں ہلاکی اُدا سی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم اہل ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہو گئے۔ چند میل کے بعد انجینئر جلا یا ”وہ دیکھو۔ وہ بٹل ہے۔“

”بٹل کیا؟“ وٹ نے پوچھا۔

”ہمارے ہاں تو بٹل ایک گہری پرات کو کہتے ہیں“ شاعر بولا۔

”بٹل یہاں ایک بازار ہے“ انجینئر بولا۔

”دیکھیں تو کیسا بازار ہے“ ڈرائیور بولا۔

”اگر ہم راستے کا ہر گراؤں اور بازار دیکھنے لگے تو پھر کہیں پہنچنے کی بات تو ختم سمجھیں“

لیڈر غصے سے چلا یا۔

”بھئی، ہم پہنچنے کے لیے تو نہیں نکلے۔ ہم تو دیکھنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستہ ہی

ہماری منزل ہے“ شاعر بولا۔

”بالکل ٹھیک“ داستان گو نے کہا ”راستے کو نکال دو تو منزل بے معنی ہو جاتی ہے۔“
شاعر نے قہقہہ مارا ”زندگی خود ایک راستہ ہے۔ خالی خوبی راستہ ہے۔ بٹل بھی راستہ پر ہے۔“

”نہیں، نہیں“ لیڈر غر آیا ”ہم بٹل بازار میں نہیں جاسکتے۔ بازار سڑک سے آدھ میل سٹ کر ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔“
”چھڈو“ شاعر بولا ”ہم تو وقت سے بے نیاز ہونے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت نہ وقت ہے نہ منزل۔“
”بہر حال، لیڈر کا حکم ہے“ ڈرائیور نے آنکھ ماری۔
”ہاں، لیڈر کا حکم ہے کہ ہم بٹل کے بازار میں نہیں جائیں گے۔ کیوں ڈرائیور؟ انجینئر ہنسنے لگا۔

”بالکل نہیں جائیں گے“ ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا، اور ساتھ ہی گاڑی روک لی۔
”ارے! سب چلائے“ یہ گاڑی کیوں روک گئی؟
”بائیں! سب ہٹا بکا رہ گئے۔ گاڑی بٹل کے بازار میں کھڑی تھی۔“
لیڈر نے ڈرائیور پر قصائی کی نگاہ ڈالی، لیکن ڈرائیور اس کی زد سے نکل کر بازار میں ٹہلنے لگا۔

وہ ایک مختصر سا بازار تھا۔ بارہ پندرہ کچی دکانیں تھیں۔ دکاندار کسبوں میں پھٹے ہوئے ادنگھ رہے تھے۔ چند ایک لوگ بازار میں کھڑے دھوپ تاپ رہے تھے۔ سارا بازار گاہکوں کے انتظار میں سہما ہوا تھا۔

”آہ! کتنا خوبصورت منظر ہے!“ انجینئر نے کہا ”ذرا ادھر دیکھو۔ چڑھتے سورج کی روشنی میں پہاڑ کی چوٹی بھل بھل مل کدہ ہی ہے۔“

”حد ہو گئی“ ڈرائیور بولا ”لوگ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں، پتھروں کو دیکھتے ہیں، ہندی نالوں

کو دیکھتے ہیں، جنگلوں کو دیکھتے ہیں، لیکن اشرف المملوکات کو کوئی نہیں دیکھتا۔
”لو بھئی، لوک جاگا“ دٹ بولا۔

”یار، یہ پہاڑی لوگ اتنے اُداس کیوں ہوتے ہیں؟“ انجیئر نے پوچھا۔
”حسین مناظر میں رہتے ہیں نا، اس لیے۔ حُسن اور اُداسی میں ایک گہرا رشتہ ہے۔“
داستان گوبولا۔

”اُمونوں، یہ حسین مناظر میں نہیں رہتے“ میں نے کہا۔
”کیا مطلب؟“ وہ سب مجھ پر برس پڑے۔
”ذرا ارد گرد نگاہ دوڑا کر دیکھو“ شاعر بولا۔
”ارد گرد نگاہ دوڑا کر جو ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے“ میں نے جواب دیا۔
”کیا مطلب؟“ سب نے شور مچا دیا۔

”جب میں نیا نیا اسلام آباد میں آکر بسا تھا تو مجھے گرد و پیش میں، روستوں میں، سرسبزگیوں
میں، مورخوں میں، پہاڑیوں میں، عمارتوں میں، فضا میں، اتنا حُسن نظر آتا تھا کہ فرط انبساط
سے سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا۔ راستہ چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بات سوچنی مشکل ہو جاتی تھی۔
ٹریفک پر تو بے دریاہ ہو جاتا تھا۔ سوچتا یا اللہ! اتنا حُسنِ فِرداں، اتنی دل آویزی، اتنی
دل کشی! لیکن آج میں وہاں نہایت آرام اور اطمینان سے گھومتا پھرتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھار شک
پڑتا ہے کہ منظر حسین ہے۔“

”آہ!“ شاعر بولا ”نالوسیّت بھی کیا نعمت ہے جو انسان کو معمول پر لے آتی ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے“ دٹ چلا ”نالوسیّت بڑی نعمت ہے۔ لیکن پہاڑی لوگ اُداس
کیوں ہوتے ہیں؟“

”ہر جگہ کے نہیں ہوتے“ داستان گوبولا ”سرسبز پہاڑیوں کے باسی اُداس ہوتے ہیں۔
سنگلاخ پہاڑیوں کے خو خوار ہوتے ہیں۔“

”یہ لیڈر بھی تو پہاڑیا ہے، لیکن نہ یہ اُداس ہے نہ خوشخوار۔ اس کا کیا کریں؟“ دٹ نے کہا۔

لیڈر نے قہقہہ مارا ”تم کیا جانتے ہو پہاڑیوں اور پہاڑوں کو۔ مجھ سے پوچھو، مجھ سے۔ میں جو پہاڑوں میں پیدا ہوا ہوں۔ پہاڑوں میں پلا، جوان ہوا۔ ایسی پہاڑیاں نہیں جو تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر تم دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھو تو سمجھ میں آجائے کہ پہاڑ کسے کہتے ہیں۔“

”میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ دیکھے ہیں“ میں نے جواب دیا۔
 ”تم۔۔۔ لیڈر ہنسنا“ تم تو دہاں صرف چھ ماہ رہے تھے۔ چھ مہینے میں پہاڑ نظر نہیں آتے۔“

”چھٹیڈی“ شاعر نے قہقہہ لگایا ”وہ تو کتا ہے پہاڑ صرف دو ایک مہینے نظر آتے ہیں۔ پھر آٹھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور تو کتا ہے چھ مہینے نظر ہی نہیں آتے۔“
 ”بھئی، بات تو پہاڑیوں کی ہو رہی ہے، پہاڑوں کی نہیں“ دٹ نے آگ پر تیل چھڑکا۔

”میں نے دھرم سالہ کے پہاڑ بھی دیکھے ہیں“ میں نے جواب دیا ”کانگڑا کے نچانوں پر مرد خود پسند تھا۔ عورتیں گویا آگ کی بھٹیاں جلائے بیٹھی تھیں۔ ہر آتے جاتے کو یوں دیکھتیں جیسے سالہا سال سے اسی کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ اور نچائیوں پر مرد اُداس تھے۔ اور چوٹیوں پر گدگی لوگ ڈل اور بے حس تھے صرف محنت ہی محنت۔ مشقت ہی مشقت۔“
 ”خدا صبر کرو“ انجیئر بولا ”ہزارہ کی اس سرسبز وادی سے جب ہم نکلیں گے اور کوہستان کی حدود میں داخل ہوں گے تو کوہستانیوں کو دیکھ کر تمھارا خون جم نہ گیا تو کہنا۔“
 ”چھٹیڈی“ شاعر ہنسنا ”اب وہ بات نہیں رہی۔ جو خطرہ تہذیب کی زد میں آجاتا ہے۔ دہاں کے لوگوں کی ساری غورخواری چو جاتی ہے۔“

”آج سے پچاس برس پہلے“ میں نے کہا ”پنڈی سے آگے پشاور تک جلتے ہوئے
دل دہلتا تھا۔ ریلوے سٹیشن قلعہ منا ہوتے تھے۔ ریل گاڑی آتی تو قلعے کے دروازے بند
کر دیے جاتے تھے۔ قبائلیوں کو دیکھ کر پیشاب خطا ہوتا تھا“

”بالکل“ وٹ چلایا اور داستان گو کی طرف اشارہ کر کے بولا ”اب یہ بھی تو پتہ ہے۔
ذرا دیکھو اس کی طرف۔ اس میں پٹھانیت کی ذرا سی رشت بھی باقی ہے؟“

انجینئر بولا ”ایک بارہم کاغان گئے تھے۔ وہاں ایک کوہستانی آگیا۔ بولا: زیرہ لو، یا بولو۔
اس کی شکل دیکھ کر اور آواز سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے انجمنے میں بٹوان کالا
اور منہ مانگے دام پیش کر دیے، حالانکہ مجھے زیرہ کی قطعی ضرورت نہ تھی“

”اب تو قبائلیوں کو سات پانیوں میں دھو کر ٹھنڈا کر دیا گیا ہے“ شاعر نے کہا۔
”کون سے سات پانی؟“

”تمیز، پیسہ، سڑک، فیشن، باڑا، تعلیم، آرام پسندی“

”وہ دیکھو، وہ“ دفعۃً انجینئر چلایا۔ سب نے نگاہ سڑک کی طرف دوڑائی۔ سامنے
سڑک کے کنارے، ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ دونوں یوں اداس بیٹھے تھے جیسے ان پر
کوئی تازہ ہونی بیت گئی ہو۔

”ذرا گاڑی روک لو“ وٹ چلایا۔

ڈرائیور نے الٹا گاڑی اور تیز کر دی۔

”دونوں ہی مظلوم نظر آتے ہیں“ انجینئر نے کہا۔

”ہاں، شادی کے بعد ابتدا میں دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں“ میں نے جواب دیا
”پھر آہستہ آہستہ دلن مظلومیت کی گھڑی اپنے سر سے اتار کر میاں کے سر پر رکھ دیتی ہے“

”بالکل غلط“ وٹ ہنسا ”یہ لیڈر کو دیکھ لو۔ اس کے سر پر تو مظلومیت کی گھڑی
نہیں رکھی، بیگم نے“

”ساری بات ہی غلط ہے“ داستان گو بولا ”یہ مفتی کتاب دشنید کی باتیں کرتا ہے۔ کتا ہے، پہاڑوں کی چٹانوں میں عورت بھٹی جلا کر بیٹھی ہوتی ہے۔ اب ہزارہ اور آزاد کشمیر کے بچانوں کو دیکھ لو۔ یہاں عورتیں اتنی پاکیزہ ہیں کہ جواب نہیں“

”بالکل درست“ لیڈر نے کہا ”آزاد کشمیر میں سڑک پر اجنبی آجائے تو عورتیں پہاڑ کی طرف منہ کر کے رُک جاتی ہیں، بیٹھ جاتی ہیں۔ اجنبی گزر جائے تو پھر سے سڑک پر چل پڑتی ہیں۔ ادھر برقعے کا پردہ نہیں، آنکھ کا پردہ ہے، لاج کا پردہ ہے۔“

”صرف مظفر آباد ہی نہیں، ہزارہ، کاغان، سوات، ایبٹ آباد بھی۔ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ بہت مذہبی اور پاکیزہ ہیں“ انجینئر نے کہا۔

”مانتا ہوں، مانتا ہوں“ میں نے کہا۔ ”لیکن.....“

”کوئی لیکن دیکھ نہیں۔ ہم تمہارے لیکن کے چکر میں نہیں آئیں گے“ وٹ نے قہقہہ لگایا۔

”شملہ جاؤ، چنبہ جاؤ، کانگڑا دیکھو“ میں نے چلا کر کہا۔

”یہاں کی بات کرو“ شاعر بولا۔

”کافرستان جاؤ۔ گلگت کے شمالی علاقوں میں دیکھو۔“

”کافرستان تو ایک عجیب علاقہ ہے“ ڈرائیور بولا۔

”وہاں اُداسی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اتنی اُداسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ حُسن اور اُداسی۔ لوگ گانے کے پردے میں بین کرتے ہیں۔ یوں ناچتے ہیں جیسے غم کے بوجھ تلے لٹکھڑا رہے ہوں۔“

”رود کو، رو کو؟“ لیڈر چلا ”وہ سامنے تھا کوٹ کا ہینگنگ پُل ہے، وہ سامنے“

ہمارے سامنے دریا پر ایک چھوٹا سا نازک سا پُل لٹک رہا تھا۔ پُل کے قریب دو ایک بارکیں تھیں۔ یہاں وہاں، الٹی سیدھی قسم کی مشینیں کھڑی تھیں۔

”یہاں نہیں“ ڈائٹبولڈ ہم دریا پار کر کے دو کیں گے۔“
 ”ہاں، ہاں“ انجینئر چلا یا ”ادھر تو ملری ایریا ہے۔ سول آبادی ادھر ہے۔ ارے
 یار، سول آبادی کو چھوڑو۔ کھانے پینے کی بات کرو۔ ہوٹل کہاں ہے؟“ شاعر بولا۔
 ”یا اللہ!“ لیڈر چلا یا ”میری قوم مجھ سے منحرف ہو رہی ہے۔ اسے غارت کر۔“ سب نے
 قہقہہ لگایا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں“ شاعر بولا ”یہ انحراف کا دور ہے۔ قوم لیڈر سے منحرف ہے۔
 لیڈر قوم سے منحرف ہے۔ سنا تم نے، لیڈر؟“
 ”عجب شورہ شوری کا دور ہے“ لیڈر نے کہا۔

”شورہ شوری نہ ہوتی تو ہم چھڈیا رمنانے کا فیصلہ کیوں کرتے؟“ شاعر نے قہقہہ مارا۔
 ”اور اس وقت تھا کوٹ میں نہ ہوتے“ وٹ بولا کیوں، داستان کو تو کیا کہتا ہے؟“
 ”لیڈر بڑے ہوشیار ہوتے ہیں“ داستان گونے کہا ”کوئی پیچھے چلنے والا نہ ہو پھر بھی۔“
 دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے بلکہ یوں مونچھ مروڑے رکھتے ہیں جیسے ساری قوم ان
 کے اشارے کی منتظر ہو۔ لیکن ہمارا لیڈر ایسا احمق ہے کہ اپنے منہ سے اعلان کر رہا ہے کہ
 کوئی پیچھے نہیں چلتا ”سب قہقہہ مار کر رہے۔“

”ہنسو نہیں“ انجینئر بولا ”پل پر چلتے ہوئے کورس میں قہقہہ لگانا منہ ہے۔“
 ”وہ کیوں؟“ وٹ نے پوچھا۔

”پل بوجھ سے نہیں ٹوٹتا۔ دانی بریشن سے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔“

”لا حول دلا قوۃ“ لیڈر ہنسا ”قہقہے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اچھا پل ہے یہ۔“
 ”پتا ہے تجھے کہ پل پر فوجیں فارمیشن میں مارچ نہیں کرتیں“ انجینئر نے کہا۔
 ”بالکل“ ڈرائیور بولا ”نے بھرا شور ایک تحریری طاقت ہے۔“

”نے بھری سُر بھی تو تحریری طاقت ہے“ انجینئر بولا۔

”بالکل“ شاعر نے کہا ”دل کا سستیاس کمرہ دیتی ہے۔“

”جب تک ہم پل سے گزرنے جا رہے ہیں، کوئی بات نہ کرے“ لیڈر بولا ”ورنہ جماعتی قہقہے کا خطرہ ہے۔“

جیپ آہستہ آہستہ دریا عبور کر رہی تھی۔ فوجی معلق پل کے تختے کڑاؤں کڑاؤں کر رہے تھے۔

تھا کوٹ ایک فراخ میدان میں واقع ہے، جس کے درمیان میں دریا بہتا ہے۔ چٹانی زمین کی دھبے سے دریا کا دھارا تنگ جگہ میں مقید تھا۔ اگرچہ پانی بہت گہرا اور موجیں بلند تھیں، پھر بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دریا نئے سندھ ہے۔ سندھ اور اتنے لمبے دکھاؤ سے بے پلے پچھلے میدان علاقوں میں پہنچ کر تو گویا اس کے سر پر جن سوار ہو جاتے ہیں۔ میں نے سیلابوں میں دیکھا ہے کہ اس کا پاٹ چالیس میل پر محیط ہو جاتا ہے۔

دریا کے مشرقی کنارے کے پہاڑ سرسبز تھے۔ شاہ کوٹ کے مقام پر وہ شمال کی طرف مڑ گئے تھے۔ مغربی کنارے پر سوات کا علاقہ تھا جو ریتلا اور بخر تھا۔ ان پہاڑوں سے مڑہ مٹی کی بو آ رہی تھی۔

”ارے! اس ریشمی سڑک کو موڑ کر ادھر بخر علاقے میں کیوں لے آئے؟“ داستان گو نے پوچھا۔

”ہاں یار۔ راہِ راست تو ادھر ہی تھی، ہزارہ کی طرف“ لیڈر نے کہا۔

”راہِ راست کو کون پوچھتا ہے“ شاعر ہنسا۔

”راہِ راست بڑا پھیکا راستہ ہے۔ دو ایک کجیاں شامل ہو جائیں تو رنگینی پیدا ہو جاتی ہے“ میں نے کہا۔

”اونوں۔ یہ سیاسی کجی ہے۔ سوات کو حصہ دینا مقصود تھا“ انجینئر ہنسنے لگا۔

ہم دریا پار کر چکے تھے۔ بائیں طرف پہاڑ تھا۔ دائیں لٹکھ پتھر کی بنی ہوئی چنڈا ایک

دکانیں تھیں۔

”ہوٹل، ہوٹل!“ لیڈر چلایا۔

”خشبو، خشبو۔ مجھا گوشت“ وٹ نے ہونٹ سنوارتے ہوئے نعرہ لگایا۔

”آگیا، آگیا! دائیں ہاتھ موڑو، دائیں ہاتھ“ لیڈر بولا۔

”اُسے!“ ڈرائیور چلایا ”بریک نہیں لگ رہی۔“

جیپ کھٹاک سے ایک چارپائی سے ٹکرائی۔ تراخ تراخ چارپائی کے پرچھے اُڑے۔

سب چھلانگیں لگا کر جیپ سے باہر نکل آئے۔

”ویری ساری، ویری ساری“ لیڈر چلایا ”ہم تادان ادا کریں گے“

”بالکل بالکل“

”بسم اللہ، بسم اللہ“ ایک درمیانے قد کا دُبلّا پتلا آدمی ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کھنڈ لگا

”یہ چارپائیاں ہم نے ٹوٹنے کے لیے بنائی ہیں، تاوان بھرنے کے لیے نہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ۔ اندر“

آئیے۔ چھوٹے، اندر کا کمر صاف کر دے، ان کے لیے بڑی دیبر کے بعد دُودھ کے مہمان آئے

ہیں۔ بسم اللہ، بسم اللہ، بسم اللہ۔ بڑی برکت ہے۔ اوصاف دے، دودھ کے مرغی حلال کر۔ یہ میرے

اپنے مہمان ہیں، خاص انخاص۔ فتنے، ذرا پانی پلا مہمانوں کو“ یہ کمرہ اندر باد پرچی خانے

میں داخل ہو گیا۔

”بھئی واہ! وٹ بولا“ یہ تو صوفی دیکھتا ہے“

”جشتیر رنگ ہے“ داستان گو نے کہا ”بالوں کی سیاہی، آنکھوں کی چمک، پیشانی

کا عجز“

”صوفی جی، تازہ چائے بناؤں؟“ اندر شیڈ سے آواز آئی۔

”بالکل تازہ۔ اور الگ الگ۔ سمجھ؟“ اندر سے صوفی بولا۔

”لو بھئی، یہ تو واقعی صوفی نکلا“ انجینئر ہنسنے لگا۔

”نام بھی صوفی، کام بھی صوفی“ شاعر نے کہا۔

لیڈر صوفی کے پیچھے گیا اور کمرے میں بھانک کر واپس آکر بولا ”یار، بروہی آچھی جگہ

ہے۔ نیچے دریا بہتا ہے۔ سامنے ہزارہ کے پہاڑ استادہ ہیں“

”اے، جگہ کے ساتھ صوفی بھی تو ہے“ انجینئر نے کہا۔

”ہاں یار، بڑا اچھا آدمی ہے“ لیڈر بولا۔

”اس کا ردیہ بڑا انان مکرشل ہے“ ڈرائیور نے کہا ”پھر اس کا ہوٹل کیسے چل رہا ہے؟“

”پتا نہیں، یار۔ ان لوگوں کا کسی نے بھید نہیں پایا“ داستان گورنے جواب دیا۔

”تمھارا بھید بھی تو نہیں پایا، شاہ جی“ انجینئر نے داستان گور سے کہا۔

”ادمنوں۔ اسے شاہ جی نہ کہو، یار“ ڈٹ زیر لب بولا ”پتا چل گیا تو مصیبت کھڑی

ہو جائے گی۔“

”پتا چل گیا تو کہہ دیں گے کہ تلقین شاہ ہے۔ کیوں، شاہ جی؟“

”بسم اللہ، بسم اللہ“ ملحقہ کمرے سے صوفی کی آواز سنائی دی ”جہم جہم بھاگ کر تلقین شاہ

ہمارے گھر آئے۔ شاہ جی، میں نے کئی سالوں سے آپ کا پروگرام مس نہیں کیا۔“

وہ ایک چھوٹا سا مستطیل کمراتھا جس میں دریا کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ کمرے

میں چار چار پائیاں بھی ہوئی تھیں۔ دو ایک چھوٹی ٹیبلز تھیں۔ ایک اونچی چار پائی پر

محافوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

”اچھا بھئی، ہم ذرا جپ کی بریک ٹھیک کرالیں“ ڈرائیور اٹھ بیٹھا۔

”بسم اللہ، بسم اللہ“ صوفی بولا ”دریا کے پار میکنک ہے۔ فوجی ورکشاپ بھی ہے۔

چائے پی لیں۔ پھر گاڑی ادھر لے جائیں۔ جب تک آپ بریک فٹ کرائیں گے، میں کھانا

فٹ کر دوں گا۔“

”صوفی جی، آپ ہمیشہ ہوٹل کا کام کرتے آئے ہیں کیا؟“ داستان گور نے پوچھا۔

”نہیں، شاہ جی۔ بڑے پا پڑیلے ہیں۔ پہلے کلینزی کی، پھر ڈیلوی، پھر موٹر مکینک،
لوہارا۔ لیکن شاہ جی، ان کاموں میں مزاح نہ آیا“

”مزا کیوں نہ آیا، صوفی جی؟“ شاعر نے پوچھا۔

”یہ سب کام“ میں ”کہ پالنے پرستے ہیں“ صوفی نے جواب دیا ”میں پھول کہہ گیا بن
گئی۔ پھر سرکار کی پیشی ہو گئی۔ سرکار نے اس میں بچکر کر دیا۔ ساری ہوا نکل گئی تو بوسے پتر، ایسا
کام کہ جس میں دوسروں کی ٹل سیوا ہو۔ اپنی ہیٹی ہو۔ بہت سوچا کہ ایسا کام کون سا ہو سکتا
ہے۔ پھر بات سمجھ میں آگئی۔ شاہ جی، دوسروں کو جی آیاں تو کرنا، اُن کے جوتے اتارنا، پانی
پلانا، اور سب سے بڑھ کر مسافروں کو روٹی کھلانا، اس سے بہتر کوئی کام نظر نہ آیا۔ پھر میں
نے کہا، چل صوفی، بیکر اسیکھ لے اور ڈٹ جا خدمت پر۔ سوچی، آج یہاں ہوٹل کمرہ ہوں“
”کسی شہر میں ہوٹل کیوں نہیں کرتے، صوفی جی؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”شہر میں مسافر نہیں ہوتے، جی“ صوفی نے جواب دیا۔

”مسافر تو ہوتے ہیں“ لیڈر بولا۔
”وہ جو مسافر ہوتے ہیں جی، وہ تو میں سے ٹن ٹن کرتے ہیں۔ یوں تن کر بات کرتے
ہیں جیسے مالک ہوں۔ مسافر تو جی تھکا ہارا ہوتا ہے۔ ٹنٹا ہوا ہوتا ہے۔ بے بس ہوتا ہے۔
عاجز ہوتا ہے“

”سچ کہتے ہو، صوفی جی“ انجینئر نے متاثر ہو کر کہا۔

”ہم بھی تو مسافر نہیں“ داستان گوہ بولا ”ہم تو ڈرسٹ ہیں۔ اپنی میں“ کے رنگین غباے
جھرے پھرتے ہیں“

”نہ شاہ جی“ صوفی نے جواب دیا ”سرکار فرماتے ہیں، آدمی اُدپر کانہ دیکھو، بھیتر کا دیکھو۔
اور پھر لوٹا کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، اپنا کام تو بھر بھر مشکا دینا ہے“

”صوفی جی“ ملحقہ شیڈ سے آواز آئی ”ہانڈی کا پانی سوکھ گیا ہے“

”میں ابھی آیا، سرکار“ کہہ کر صوفی باہر نکل گیا۔

”واہ بھئی، واہ! کیا آدمی ہے۔ اگر ہر سو آدمیوں کے پیچھے ایک ایسا آدمی ہو تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں۔“

”ساری مشکلیں حل ہو جانا اللہ کو خود منظور نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک تو ہے“ داستان گو نے آہ بھری ساری لذت راستے کی ہے، منزل کی نہیں“

”چھوڑو یار۔ کیا بحث لے بیٹھے۔ ادھر دیکھو۔ دریا کس ٹھاٹ سے بہ رہا ہے“

لیڈر چلا یا۔

”بہتا پانی بھی عجیب چیز ہے“ شاعر بولا ”دیکھتے رہو تو ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے“

”جی تو اللہ والے عام طور پر بہتے پانی کے کنارے بیٹھتے ہیں“ داستان گو نے کہا۔

”ایک فرحت ہوتی ہے، ایک تازگی، ایک پاکیزگی۔ ساری ایوولوشن اس کی مرہون

منت ہے“ ڈرائیور گنگنا یا۔

”چھڑ یار“ شاعر گرجا ”اب ایوولوشن کا مسئلہ نہ لے بیٹھنا“

”سچ کہتا ہے یہ“ داستان گو بولا ”نور بابا کے پاس ایک آدمی آیا۔ بولا : بابا،

اللہ دکھا دو، جو کائنات کا خالق ہے۔ بابا اسے نانا رہا، لیکن وہ ہی رٹ لگائے بیٹھا رہا۔

کئی ایک دن گزر گئے۔ ایک دن بابا سوچ میں بیٹھا تھا۔ سائل نے پھر رٹ لگائی : بابا

مجھے کائنات کا خالق دکھا دو۔ بابا نے جگ سے پانی کا ایک گلاس بھر کر سائل کے ہاتھ میں

تھا دیا۔ بولا : بس اسے پکڑ لے۔ یہی کائنات کا خالق ہے۔“

”واہ! ساری ایوولوشن کا مسئلہ حل کر دیا“ ڈرائیور چلا یا۔

”لیکن بندر کی گتھی تو نہ سلجھی“ وٹ بولا۔

”چھڑ یار“ شاعر ہنسا ”انسان پہلے بھی بندر تھا، اب بھی بندر ہے۔ فرق صرف یہ

ہے کہ پہلے کھال میں مست تھا، اب چھٹی قمیص میں مکلف ہے۔“

”چلو، بھائی“ لیڈر چلا یا ”ہم بربک ٹھیک کر وائیں۔ پھر کھانا کھا کر آگے چلیں گے۔“

ابھی تو لیا سفر طے کرنا ہے۔“

لیڈا در دڑا بوجب لے کر چلے گئے، اور ہم چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ اس چھوٹے سے دُھواں آلود کمرے میں چُپ چاپ لیٹے ہیں ایک عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ دیر تک ہم چُپ چاپ لیٹے رہے۔

پھر انجینئر بولا ”ایسے لگتا ہے جیسے ہم بھولا بھول رہے ہوں۔“
”یہ دریا کی گھر گھر کی وجہ سے ہے“ داستان گونے لگا۔

”نہیں، یاد۔ جیب میں صبح سے سفر کر رہے ہیں، اس لیے۔ کیوں شاہ جی؟ کیا خیال ہے؟“ شاعر نے فقرہ دیا۔

”یاد، آم، چوسو، پیڑ نہ گنہ“ میں نے کہا۔
”کیا مطلب؟“

”ہماری مُشکل یہ ہے“ میں نے کہا کہ ہم بھولا نہیں بھولتے۔ یہ سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کیوں بھولا بھول رہے ہیں۔“

”ہمیں بوڑھے کی لذت مار گئی“ داستان گونے لگا ”گتے کہا کرتے تھے کہ تم چُپ رہنا سیکھ لو تو پھر کائنات تم سے باتیں کرنے لگے گی۔“

”بالکل ٹھیک“ شاعر بولا ”اس وقت دریا ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس کی نہیں سُنتے، اپنی کمرے جا رہے ہیں۔“

”ہاں“ میں نے جواب دیا ”مہاتما بدھ نے کہا تھا، جو دیکھنا چاہتے ہو تو آنکھیں موند لو۔“

”اگرچہ آنکھیں بھی بڑی رکاوٹ ہیں۔ لیکن سب سے بڑا اثر تو زبان نے ڈھار رکھا ہے“ شاعر نے کہا۔

”ہاں“ داستان گو بولا ”باباجی کہا کرتے ہیں کہ زبان میں ہی میں ہے۔ کان تو ہی تو ہیں،“

اور انھیں لذت ہی لذت - یارو، زبان کو لگام دو، آنکھیں بند کر لو، دریا کی گھر گھر سنو۔
 ذرا ہم اس جگہ کی لذت لیں، اس مقام کی خوشبو اکٹھی کریں تاکہ ساتھ لے چلیں :-
 سب خاموش ہو گئے۔ بھولا بھولنے لگے۔ دریا کا گیت ابھرا۔ ابھرتا چلا گیا۔

تین بجے کے قریب جب ہم تھا کوٹ سے رخصت ہوئے تو سو فی سڑک پر کھڑا
 تھا "بسم اللہ، بسم اللہ" وہ گنگنا رہا تھا "خیر سے جاؤ، خیر سے پہنچو، خیر سے لوٹو۔ تمہارا بہت
 احسان ہے کہ مجھ ایسوں کو پانی پلانے اور ردی کھلانے کا موقع دیتے ہو۔ اللہ تمہیں خوش
 رکھے۔"

ڈاسو

تھا کوٹ سے روانگی کے بعد دیر تک جیب میں خاموشی طاری رہی۔
صوفی کے کردار سے ہم اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فقرہ بازی کا مشغلہ کافی دیر
تک معطل رہا۔

عجیب لوگ ہیں یہ! داستان گوئے آہ بھری۔
”یار، یہ فرقہ جسے صوفی کہتے ہیں.....“ لیڈر نے کچھ کہنا چاہا۔
”فرقے کا تو مجھے علم نہیں“ داستان گو بولا ”صوفی میرے نزدیک ایک بُرخ ہے۔ ایک
زاویہ نظر ہے۔“

”ہٹا دیار، یہ فلسفہ بازی“ لیڈر نے چٹ کر کہا۔
انجینئر بولا ”شاہ جی، یہ بتاؤ کہ تھا کوٹ کی خوشبو کیسی رہی؟“
”تھا کوٹ کی خوشبو؟“ لیڈر نے حیرانی سے پوچھا۔
”تمہیں کیا پتا“ انجینئر بولا ”تم تو درکشاپ میں پٹرول کی بو سونگھتے رہے، اور
شاہ جی تھا کوٹ کی خوش بو اُکھٹی کرتے رہے۔“

”تھا کوٹ کی خوشبو میں صرت دو عناصر تھے“ شاعر نے کہا ”ایک تو دریا کی گھم گھم اور
دوسرا صوفی کا عجز۔“

”تم کبھی تھریار کر نہیں گئے“ ڈرائیور بولا ”دہاں کی خوشبو انوکھی ہے۔“
”ہاں، بہت انوکھی، داستان گو نے ہاں میں ہاں ملائی۔“

”کتنے غماص ہیں؟“ دٹ نے پوچھا۔

”لوگوں میں غربت کی بُجھ ہے، عمر کی بُجھ ہے، معصومیت کی بُجھ ہے، ادھر پھر چاروں طرف پھیلے ہوئے دیرانے میں وسعت کی باس ہے“ ڈرائیور نے وضاحت کی۔

”کیسا دیرانہ؟“ شاعر نے پوچھا۔

”ریت ہی ریت، تاحہ نظر“ ڈرائیور نے وضاحت کی۔

”صحرا کی کیا بات ہے! سارے پیغمبر محراؤں میں اُتارے گئے۔ عظیم ترین انسان کی تشکیل میں صحرا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صحرا کی کیا بات ہے! انجینئر نے آہ بھری۔

”آہستہ بولو“ دٹ نے زیرِ لب کہا ”لیڈر سن رہا ہے۔“

”ایک یہ ہمارا لیڈر ہے جو صحرا میں پک ٹمک کرنے کا قائل نہیں“ ڈرائیور نے کہا۔

”یہ تو پہاڑوں کا دلیوانہ ہے“ انجینئر بولا۔

”پہاڑ انسان کو کُٹا کرتے ہیں۔ صحرا عظیم بنا دیتے ہیں“ شاعر نے کہا۔

”سب بے کار ہے“ داستان گونے آہ بھری۔

”بے کاریوں؟“ دٹ نے پوچھا۔

”ہم ایسوں کے لیے کیا پہاڑ، کیا صحرا۔ نہ پہاڑ ہمارا کچھ بگاڑتے ہیں نہ صحرا“

داستان گون بولا۔

”وہ کیوں؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”اس لیے کہ گرد و پیش کی بولی سننے کے لیے ہم نے خود میں کوئی ریسورسز ہی نہیں کیا“ داستان گون نے جواب دیا۔

”ریسورس تو اللہ نے فٹ کر رکھا ہے، ہم میں۔ لیکن جو اثر ڈالنے کے دہانے ہوں انہیں اثر لینے کا نہ شعور ہوتا ہے اور نہ فرصت“ شاعر نے کہا۔

”ارے!“ ڈرائیور چلایا ”یار یہ بربیک پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی۔ ابھی ہم نے

کوہستانی علاقے میں سفر کرنا ہے۔ اسے ٹھیک کرانے بغیر بات نہیں بنے گی۔“
 ”میں بتاؤں؟“ انجینئر بولا ”وہ سامنے بشارت ہے اور بشارت میں فوجی درکشاپ ہے۔“
 بشارت ایک نہایت غیر پرفضا مقام ہے۔ چھوٹے چھوٹے مٹیالے ٹیلوں میں ایک
 غیر ہمواری سامیداں۔

”اے، یہ تو بالکل ہی فلیٹ جگہ ہے“ شاعر چلایا۔
 ”ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے رائے ونڈ میں آگئے ہوں“ درٹ بولا۔
 ”قصہ تو آگے ہو گا۔ یہ تو فوجی کیمپ ہے“ انجینئر نے کہا۔
 ”پھوڑو دیا۔ ان کی درکشاپ تو ادھر ہی ہو گی“ لیڈر چلایا۔
 ڈھلان پر چند ایک خیمے لگے ہوئے تھے۔ سامنے درکشاپ کا بورڈ لگا تھا۔ درکشاپ
 کے خیموں کے سامنے دو فوجی کھڑے تھے۔ ایک کام میں مصروف تھا۔ دوسرا بندوٹی لیے
 کھڑا تھا۔

”یہاں کا انچارج کون ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔
 ”اُدھر میجر صاحب ہیں“ سپاہی نے جواب دیا۔
 ”ہیں اُدھر لے چلو۔ ہم میجر صاحب سے بات کریں گے۔“
 میجر صاحب ایک معمولی سے خیمے میں میز کوئی لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں
 مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ پھر لبے مسٹر، ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں، اگر آپ کو
 ٹولہ کی ضرورت ہے تو لے لیجیے اور خود بہ یک ٹھیک کریں۔ ان کا لہجہ بے حد خشک تھا۔
 اندازہ ایسا جیسے آگائے بیٹھے ہوں۔

”تھینک یو میجر۔ ہم بریک خود ٹھیک کر لیں گے“ ڈرائیور بولا۔
 میجر نے ایک مستری سپاہی کو بلایا اور ہدایات دیں، یوں، جیسے کہ رہے ہوں، انھیں

انجینئر اور ڈرائیور کام میں لگ گئے اور ہم سب درک شاپ سے کچھ فاصلے پر، درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی سپاہیوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ دس بیس ہوں گے۔ لیکن ہماری طرف خیموں کی پشت تھی۔

”یہ تو بڑی سپاٹ جگہ ہے“ میں نے کہا۔

”یہاں تو صرف مٹی کی بو ہے“ وٹ ہنسنا۔

”مٹی کی بو سے بہتر خوش بو کوئی نہیں۔ کاش کہ کوئی نرم مٹی کا عطر بنا سکتی!“ شاعر نے کہا۔

”شاید کسی کمپنی نے بنایا ہو“ داستان گو بولا ”کیا پتا۔“

”بنایا ہو تا تو پتا چل جاتا“ لیڈر نے کہا۔

”نہیں یار۔ پتا نہیں چلتا“ داستان گو بولا۔

”وہ کیسے؟“ لیڈر نے پوچھا۔

داستان گو کہنے لگا ”ہم فیس کریم بناتے ہیں۔ اس لیے خوش بو بنانے والی کمپنیوں سے ہمارا رابطہ ہے۔ ایک بار میں نے تعریفاً ایک کمپنی کو خط لکھا کہ جناب، میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انسان کے جسم کی خوش بو بھی ایک خصوصی چیز ہے۔ اگر مرد کی خوشبو اور عورت کی خوشبو الگ الگ بنائی جائے تو وہ مکملی بہت کام کی چیز ہوگی۔“ کیا کہا؟ مرد کی خوش بو؟“ شاعر نے قہقہہ لگایا۔

”وہ تو بو ہوتی ہے“ لیڈر ہنسنا۔

”تمہارے لیے بو ہوتی ہے کیوں کہ تم مرد ہو۔ عورت کے لیے تو وہ خوش بو ہوگی“ میں نے کہا۔

”خوشبو تو خیر نہیں کہہ سکتے“ انجینئر بولا۔

”خوش بو میں تو بھنی لطافت کا ہونا ضروری ہوتا ہے“ ڈرائیور نے کہا

”اگر عورت کی بُد بنائی جائے تو وہ ہم پر کثافت طاری کر دے گی۔“
 ”بھئی، اس کی یہی تو خوبی ہے کہ کثافت طاری کرتی ہے“ میں نے جواب دیا ”ہم
 سب اس کثافت پر جان دیتے ہیں۔“

داستان گو بڑا رند آدمی ہے۔ وہ بات چھپرے کر چپ ہو جاتا ہے۔ سُنے لے بھڑوں
 کا چھتا بن کر چھن چھن کر رہتے ہیں۔ دیر تک ہم سب چھن چھن کرتے رہے۔
 ”ہاں بھئی، تو پھر کیا ہوا؟“ دُٹ نے پوچھا۔ داستان گو چُپ چاپ بیٹھا رہا حتیٰ کہ
 سب چلانے لگے ”پھر، پھر، پھر؟“

”پھر؟ وہ بولا ”تین مہینے کے بعد مجھے کمپنی کی طرف سے خط موصول ہوا۔ لکھا تھا:
 جناب والا، ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہمارے کام میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے
 لیے عرض ہے کہ انسان کے جسم کی خوش بُور سب سے پہلے ہماری کمپنی نے ۱۷۷۶ء میں
 بنائی تھی۔“

”ارے! ۱۷۷۶ء میں؟“ سب چیخنے لگے۔

داستان گو نے سلسلہ کلام جاری کیا ”پھر ۱۸۲۴ء میں مسٹر آندرے جویان نے اس
 میں ترمیم کی اور ۱۹۰۵ء میں مسٹر کیرن ماڈزے نے اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ خوش بُور
 کمپنی نے عام نہیں کی بلکہ اُمرا اور رؤسا تک محدود رکھی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ چونکہ آپ
 خوش بُور سے دل چسپی رکھتے ہیں لہذا بطور تحفہ ہم آپ کو عورت کی خوش بُور کی ایک شیشی
 بھیج رہے ہیں۔ اندازہ کر ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔“

”ارے! ارے! سب چلانے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عین اس وقت ہم نے
 دیکھا کہ چھ سات فوجی، سادہ کپڑوں میں ملبوس، ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

”بھئی، شرر نہ مچاؤ۔ وہ ہماری طرف آ رہے ہیں“ لیڈر نے سپاہیوں کی طرف

اشارہ کیا۔

”السلام علیکم“ وہ بولے۔ پھر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”میں کہتا ہوں، وہی ہے“ ایک بولا۔

”نہیں، نہیں یار“ دوسرے نے کہا۔

”شرط لگا لو“ پہلا بولا۔

”تیرا گرائیں ہے کیا؟“ تیسرے نے پوچھا۔ ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے

لگے۔ بالآخر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور داستان گو کی طرف اشارہ کر کے بولا:

”معافی چاہتا ہوں۔ مگر کیا آپ تلقین شاہ ہیں؟“

داستان گو نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”یا علیؑ!“ انھوں نے نعرہ بلند کیا، اور پھر— پھر ہم پر یوریش کر دی۔

چند ایک منٹ میں دہاں ایک جمع لگ گیا۔ چار آدمی ورک شاپ کی طرف بھاگے

تاکہ جپ کی بڑیک ٹھیک کریں۔ چار ایک سپاہی کیمپ کے لانگرمی کی طرف بھاگے کہ شاہ جی

کو چینی کی چائے پلانے کا انتظام کریں۔ ایک آدمی بسکٹوں کا ایک لفافہ لے کر آگیا۔ دس ایک

داستان گو کے چرنوں میں آ بیٹھے۔ پھر لاکھ ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک بوللا میں چار سال سے بلاناغہ تلقین شاہ سُن رہا ہوں۔“

دوسرا بوللا ”میں تو تب سے سُن رہا ہوں جب ابھی میں بھرتی نہیں ہوا تھا۔“

تیسرا بوللا ”شاہ جی، ذرا تلقین شاہ کی بولی سُنادیں“ ایک ہنگامہ مچ گیا۔

مانا کہ میں داستان گو کا بہت بُرا نا دوست ہوں۔ گزشتہ ۳۲ سال سے ہم ایک

دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں اس کی صلاحیتوں کو ماننا ہوں، لیکن جب بھی لوگ تلقین شاہ

کو سیر و بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اصولوں کو جھٹلانے والی بات کیسے سمجھ میں آئے۔ تلقین شاہ ایک منفی کردار ہے۔

اس میں کوئی مشیت پہلو نہیں۔ خیس ہے۔ باتوئی ہے۔ جو کہتا ہے وہ کرتا نہیں۔ جو کرتا ہے

وہ کہتا نہیں۔ کیونکہ ہے۔ باتیں ہی باتیں۔ لچھے دار باتیں۔ باتوں کے جال بنتا ہے۔ منہ زبانی باتیں۔ اس کے باوجود لوگ تلعین شاہ کو پوجتے ہیں۔ اس کی باتیں سُنتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں۔ صدقے داری جاتے ہیں۔ ریڈیو پر آج تک کوئی منفی کردار اتنا مقبول نہیں ہوا۔

پورے دو گھنٹے بشام میں فوجی لوگ تلعین شاہ کے صدقے داری جاتے رہے۔ جب ہماری جیپ دہاں سے چلی تو وہ سب میدان میں کھڑے ہاتھ لارہے تھے۔

بشام کے بد سہمی گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ داستان گو تو یوں بیٹھا تھا جیسے آرتی چڑھنے کے بعد دیوتا بن گیا ہو۔ دراصل بشام میں فوجیوں کی آؤ بھگت نے ہم سب کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

وہ علاقہ جس سے جیپ گزر رہی تھی، اُجڑا اُجڑا تھا۔ پہاڑ دُور رہاٹ چکے تھے۔ مٹیائے ٹیلے قریب آگئے تھے۔ زمینیں سُکھی پڑی تھیں۔ لوگوں میں سواتی رنگ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوہستانی عنصر ابھر رہا تھا۔

دفعۃً گاڑی دیر کے بازار میں جا داخل ہوئی۔

دیر ایک مختصر سا، میلا سا، بازار تھا۔ گاڈن چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھا۔ دس بیس دھواں آلود دکانیں تھیں جہاں دکاندار یوں بیٹھے تھے جیسے ازل سے بچھے ہوئے ہوں۔ ”یہ لوگ ہزارہ سے کتنے مختلف ہیں“ ڈرائیور بولا ”بچھے بچھے تو ہیں، لیکن ان کی اداسی اُداسی نہیں ہے۔“

”یہ اداسی ہزارہ کی اداسی سے کتنی مختلف ہے“ انجینئر نے کہا۔

”بھئی، یہ دیکھتے نہیں، یہ تو گھوڑتے ہیں“ لیڈر بولا۔

”کیا یہ کوہستانی لوگ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی کوہستانی کہاں“ انجینئر نے جواب دیا۔

”ان میں سرحدی لوگوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے“ شاعر بولا۔

”سرحد کے لوگوں کا باہر نہ دیکھو، ان کے اندر دیکھو۔ باہر سے گھورتے نظر آتے ہیں“ داستان گو نے کہا۔

”اور اندر سے؟“ وٹ نے پوچھا۔

”یہ داستان گو خود پٹھان ہے نا، اس لیے ان کے اندر کا بھید جانتا ہے“ لیڈر نے نغمہ دیا۔

”ادمنوں۔ یہ میری رائے نہیں“ داستان گو بولا ”یہ آرٹنڈ کی رائے ہے۔ آرٹنڈ ایک انگریز تھا۔ کھاتے پیتے گھر کو لات مار کر پاکستان آگیا۔ اتفاق سے وہ مجھے بل گیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ میرے ہاں وہ دو تین مہینے رہا۔ میں نے اس سے پوچھا: آرٹی، تو ایک امیر باپ کا بیٹا ہے، پھر تو کیوں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے، پردیس میں؟ کہنے لگا: میں مغرب کی افواہوں سے بے زار ہوں۔ بے راہ روی سے بے زار ہوں۔ دہاں کی فرسٹریشن سے بے زار ہوں۔ میں چار سال ملک ملک گھوما ہوں۔ اطمینان و سکون کی تلاش میں در بدر ہوا ہوں۔ اور اب، اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں پاکستان میں رہوں گا۔ یہاں غربت ہے۔ امن ہے۔ سکون ہے۔ کیا پنجاب میں رہو گے؟ میں نے پوچھا۔ بولا: نہیں، میں سرحد میں رہوں گا۔ سرحد کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ باہر سے کڑوے ہیں۔ غصیل ہیں۔ اندر سے مسادات کو دانتے ہیں۔ دد مٹے نہیں۔ ہپو کرٹ نہیں۔“

”پھر؟ پھر؟“ سب نے شور مچا دیا۔

اس وقت ہم دیر کے بازار میں گھوم پھر رہے تھے۔ لوگ ہماری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”بتاؤ یار۔ اب وہ آرٹی کہاں ہے؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”ایک جینا ہوا مجھے اس کا فن آیا تھا“ داستان گو نے کہا ”فن پر آرٹی کہنے لگا کہ میں یہاں لاہور میں پوم گلڈ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ کو تو آجاؤں۔ میں

گاڑی لے کر بھاگا۔ بڑی مشکل سے پوم گلڈ کا پتا چلا یا۔ یہ ہوٹل قلعہ گوجر سنگھ کے پھوپھو اڑے ایک پُراے بوسیدہ دودھ منزلہ چارے میں واقع ہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ اس میں ہوٹل کی کوئی بات نہ تھی۔

”یہاں دہاں ہر جگہ چار پائیاں ہی چار پائیاں کھڑی تھیں۔ جو بھی آتا، اسے ایک چار پائی دے دیتے، اور رات کے پانچ روپے لے لیتے۔ بس ہوٹل کا اتنا ہی کام تھا۔ البتہ ایک کونے میں کڑک چائے کا سٹال لگا ہوا تھا۔ سارا چربا رہ کچھ پیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں باری باری سب کمروں میں گھوما۔ آخری کمرے میں داخل ہوا تو ایک سواتی نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ارے! میں چلا یا۔ تم آرنی ہو؟ وہ مسکرا کر بولا: نہیں، آرنی نہیں، میں عبد اللہ ہوں۔ اور وہ دیکھو، اُدھر۔ میرے روبرو ایک سواتی عورت بیٹھی ہے۔ کونسا پلاہی تھی۔ بیکز فاطمہ ہے، وہ بولا، میری بیوی۔ تو کیا سوات میں شادی کرتی ہے تو نے؟ نہیں، وہ ہنسا کینز فاطمہ فرانسسیسی ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر بالکل یقین نہ آتا تھا کہ وہ فارسیز ہیں۔“

”ہاں، سوات میں۔ میں نے اس سے پوچھا: بتا، تیرا گزارہ کیسے چلتا ہے؟“ داتاں گونے کہا ”آرنی بولا: اسی طرح جس طرح دی ہوئی پرائنٹ کا گزارہ ہوتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی زمین خرید لی ہے۔ مٹی کا ایک کوٹھا تھوپ لیا ہے۔ گھر میں ایک بکری ہے۔ اٹھ مرغیاں ہیں۔ ہم انڈے کھاتے ہیں، دودھ پیتے ہیں، سارا دن دھوپ سینکتے ہیں، اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ یہ پٹھان بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں اپنا جانتے ہیں۔ غیر نہیں سمجھتے۔“

”یار، ہمیں بھی بلاؤ کبھی، اس سے“ انجینئر نے کہا۔

”تم اس کی باتیں نہیں سمجھ سکو گے، اس لیے کہ ہم سب افلاؤنس کے ارے ہوئے ہیں۔ افلاؤنس دودھ حاضرہ کی سب سے بڑی لعنت ہے“ میں نے کہا۔

”افلاض ہیں تو نصیب ہی نہیں ہوئی“، شاعر بولا ”حسرت ہی رہی“ سب نے
تمہہ لگایا۔

دفعۃً ہم تے دیکھا کہ بانار کے اختتام پر ہم ایک شوریدہ سرناے کے پُل اُپنچے ہیں، جہاں بیسیوں فیویں کا جھگڑا ہے اور سب لوگ حیرت اور شک بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔

”بھئی، یہ سڑک کیوں بند کر رکھی ہے آپ نے؟“ لیڈر حیل آیا۔

”سڑک بند ہے“ قریب کھڑا فوجی بولا ”آگے مرمت ہو رہی ہے۔“

پہلے بڑا خوشگوار سماں تھا۔ پانی اتنی تیزی سے بہ رہا تھا جیسے طوفان میں ہونے پھرنے سے لکھنؤ کی دھبے سے پانی کی پھوڑا دور دور تک اڑ رہی تھی۔ پھر پچکائی کی گھر گھر اور چائے خانوں کا شور۔ نالے پر پہنچ کر بازاں کی آوازیں اور گھٹن دور ہو گئی۔

دفعۃً ایک فوجی افسر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا اور خشک لبو میں ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟ پوچھ گچھ کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

”یار! یہ ہمیں مشکوک کیوں سمجھ رہے ہیں؟“ لیڈر بولا۔

”سمجھنے کی کیا بات ہے، ابھی۔ ہم تو ہیں ہی مشکوک“ دوطہ بولا۔

”وہ تو ظاہر ہے“ شاعر نے کہا ”سوال یہ ہے کہ ہم کیوں مشکوک ہیں؟“

”نہیں، سوال یہ ہے کہ ہم میں کون مشکوک ہے؟“ ڈرائیور نے کہا۔

”ہاں، یار۔ کوئی ہے ضرور“ دھڑ بھڑا۔

”صرف ڈرائیور ہے جس پر شک کیا جاسکتا ہے“ داستان گو بولا۔

”وہ کیوں؟“ ڈرائیو نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ سواریاں تو سوار یوں جیسی ہی ہیں، ڈرائیور ٹرک ڈرائیوروں جیسا

نہیں۔ اس لیے شکوک ہے“ داستان گو نے کہا۔

”ہاں، بھی، ڈرامیور تو خالص انگریز ٹائپ ہے“ شاعر بولا۔

”بس یہی بات ہے“ وٹ ہنسنا“ انھیں ڈر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر سے قبضہ

جملنے کے لیے ہراول پارٹی ٹکے طور پر اسے بھیجا ہے تاکہ جائزہ لے۔

ابھی ہماری بحث جاری تھی کہ دو فوجی آگئے۔ بولے اگر آپ کو جلدی ہے تو چلیے،

آپ کوسے چلتے ہیں۔ آپ ہماری جیب کے پیچھے پیچھے آجائیں۔“

جب ہم جیب میں بیٹھ رہے تھے تو وٹ نے کہا ”یار، ان سے یہ بھی تو پوچھنا تھا

کہ لے تو جا رہے ہو، پر لے جاؤ گے کہاں؟ کہیں نظر بند کرنے تو نہیں لے جا رہے؟“

”کیوں؟ سیکھے شاہی ہے کیا؟“ لیڈر غصے میں چلا یا۔

”وہ تمہارے“ وٹ بولا ”صورتِ حالات دیکھ لو“

”وہ صورتِ حالات جسے دیکھ کر ہم راولپنڈی سے بھاگے ہیں اور یہاں چھڈیا رہنا ہے

ہیں، واقعی خدوش ہے“ شاعر نے سنجیدگی سے کہا ”ایک طرف ایک پارٹی کھڑی ہے، دوسری

طرف دوسری۔ ایک ترقی کی رٹ لگا رہی ہے، دوسری اسلامی نظام کا وردہ کر رہی ہیں۔ بازاروں

اور گلیوں میں لوگ جمع ہیں۔ انھیں کچھ نہیں پتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ چاہتے ہیں کہ کچھ ہو جائے۔

چاہے کچھ بھی ہو، مگر ہو جائے۔ بازار اور گلیوں میں دھول اڑے۔ یہ سیکھے شاہی نہیں کیا؟“

”بالکل ہے“ انجینئر بولا۔

”نہ ہوتی تو سات شریف آدمی لوں چھڈیا رہنا نہ کے بہانے ان پہاڑوں میں بگڑتے

نہ چٹخا رہے ہوتے“ ڈرامیور بولا۔

”رُک جاؤ، رُک جاؤ“ فوجی چلائے۔ جیب رُک گئی۔

دونوں فوجی جیب سے اُتر کر ہمارے پاس آئے۔ بولے ”گاڑی آگے نہیں جاسکتی۔

سرٹاک پرتیل بچھا ہوا ہے۔“

”سرک پر تیل؟ سرک پر تو پتھر ہوتے ہیں، ٹمک ہوتا ہے، بجری ہوتی ہے۔ یہ تیل کہاں سے آیا؟“ انجینئر بولا۔

”یہ چینی جو ہیں ان کا اپنا ہی حساب ہے“ فوجی نے جواب دیا ”پہلے پتھر کو ٹٹے ہیں، پھر تار بنیں کا تیل ڈالتے ہیں۔ پھر کوٹتے ہیں اور آخر میں کول تار بچھا دیتے ہیں۔“
شام کے گھسپے میں وہ ایک خوفناک جگہ تھی۔ دونوں طرف چیل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ سرک کے دائیں ہاتھ پندرہ بیس فٹ کا ہموار میدان تھا۔ اس کے عین درمیان میں سیمنٹ کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ ہم سب اس چبوترے پر جا بیٹھے۔

”اس دیرانے میں چبوترہ؟“ لیڈر نے کہا۔

”یہ تو ہیلی پیڈ معلوم ہوتا ہے“ انجینئر نے جواب دیا۔

”یہاں ہیلی کا پڑاؤ کرنے کا مطلب؟“ وٹ بولا۔

”ارے بھئی،“ انجینئر نے کہا ”یہ ٹن کا علاقہ ہے۔ پچھلے سال ٹن میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔“

”ہاں، ہاں۔ اخباروں میں خبریں آئی تھیں“ داستان گو بولا۔

”شاید یہ ہیلی پیڈ ان دنوں بنایا گیا ہو، ریسک کے لیے، پروویشن کی سپلائی کے لیے“

انجینئر بولا۔

رات پر چکی تھی۔ اُنہی لمبے پہاڑ کالے بونے بن چکے تھے۔ اس مقام سے خوف آنے لگا تھا۔

”یار، جو ہمیں نظر بند ہی کرنا تھا“ شاعر نے فوجیوں سے کہا ”تو کسی اچھی جگہ کرتے۔“ فوجی ہنسنے لگے۔

”ملقین شاہ جی“ اپنے اگلے پروگرام میں اس دی آئی پی ٹی ٹیوٹ کا ذکر ضرور کرنا جو

فوجیوں نے ہمیں دیا ہے، میں نے تڑپ کا پتا پھینکا۔

تلقین شاہ کا نام سُن کر فوجیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کا انداز یکسر بدل گیا۔
”پھینک دیا، بھئی، تڑپ کا پتا“ وٹ زیر لب بولا۔

یہ سُن کر پہلے تو فوجی تلقین شاہ سے پرد گرام کی باتیں کرتے رہے، پھر سڑک پر کام کرنے والے چینیوں اور مزدوروں کو ڈانٹنے لگے: بھیج جلدی کرو۔ رات پڑ گئی ہے اور ہمارے ہمالوں نے جلدی پہنچنا ہے۔

ہیلی پیڈر سے رخصت ہو کر ڈرائیور کو دفتر میں تک تیل سے بھیگی ہوئی سڑک پر بڑی احتیاط سے گاڑی چلائی پڑی۔

”دیکھو، بھئی۔ بورنا نہیں“ لیڈر نے کہا ”ایک تو تیل کی پھسلن ہے، دوسرے سڑک خطرناک ہے، اور تیسرے گھپ اندھیرا ہے“

پٹن کا یہ علاقہ بڑا خوفناک تھا۔ دور دراز اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ سڑک گھومتی بل کھاتی جا رہی تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد موڑ آجاتا جس پر گاڑی چلانا بڑی چابکدستی کا کام تھا۔

یہ پہاڑ ویران تھا۔ دُور دور تک بستی کا کوئی نشان نہ تھا۔ سڑک پر کوئی گاڑی آ جا نہ رہی تھی۔ اس خوفناک راستے کو دیکھ کر سبھی خاموش بیٹھے تھے۔

گھنٹوں گزر گئے۔ جیب آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ راستہ ویسے ہی بند بند رہا۔
”کتنی خوفناک جگہ ہے!“ لیڈر بولا۔

”ہاں، بھئی۔ پٹن کا علاقہ ہے“ انجینئر نے کہا۔

”اچھا تو یہ وہ پٹن ہے“ داستان گو بولا ”جس کی امداد کے لیے دُنیا بھر سے چیزیں آتی تھیں“

”ہاں“ ڈرائیور نے کہا ”بستر، کپڑے، خوراک، فارن ایکسچینج اور دودھ“

”ہاں“ دٹ چلا یا ”وہ دودھ جو آج بھی پنڈی کے بانڈوں میں پک رہا ہے“
 ”وہ کبیل بڑے عمدہ تھے“ لیڈر نے کہا ”میں نے بھی ایک خریدا تھا، مارکیٹ سے“
 ”خریدنے والے بھی نہال ہو گئے اور بیچنے والے بھی“ ڈرائیور بولا۔

”نہیں یا“ داستان گو نے احتجاجاً کہا ”وہ چیزیں تو عوام میں بانٹی گئی تھیں۔ اخباریں
 میں دس پندرہ دن تصویریں چھپتی رہی تھیں۔ کبیل دیے جا رہے ہیں۔ اناج کی بوریوں تقسیم
 کی جا رہی ہیں“

”ہاں، ہاں۔ بڑی بڑی تصویریں بھی تھیں“ دٹ نے کہا ”سکیو کرنے والے فوٹو گرافر
 ساتھ لاتے تھے۔ پہلے وہ میلی کا پٹر کی سیر کرتے پھر تصویریں کھواتے اور پھر انھیں شاہ مرنویوں کے
 ساتھ اخباروں میں چھپواتے“

”اس علاقے کی ڈویلپمنٹ کے منصوبے بھی تو بنے تھے“ داستان گو نے کہا۔
 ”بالکل بنے تھے“ شاعر بولا۔

”ان پر عمل درآمد بھی کس دیا گیا“ انجینئر ہنسا۔
 ”نظر تو نہیں آتا، ادھر کوئی عمل درآمد“ داستان گو نے کہا۔
 ”شاید ادھر ٹپن میں ہو“ ڈرائیور بولا۔

”ٹپن میں نہیں“ دٹ بولا ”اسلام آباد سکرٹریٹ کی فائلوں میں جا کر دیکھو۔ آنکھیں نہ
 کھل جائیں تو کمنا۔“

دفعہ گاڑی رُک گئی بہانے سامنے ایک نالا تھا۔ نالے پر ایک بہت بڑا پتھر بنا ہوا تھا۔
 ”لو بھئی، ہوٹل تو آگیا“ لیڈر بولا۔ ہوٹل میں چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔
 ”ٹپن یہاں سے کتنی دُور ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

ایک سفید ریش بوترھا ہمارے پاس آکھڑا ہوا۔ بولا ”صاب، یہی ٹپن ہے۔“
 ”یہاں آبادی تو نہیں“ شاعر نے کہا۔

”آبادی نیچے ہے“ بابا نے جواب دیا۔
 ”راستہ کدھر سے جاتا ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔
 ”آدھ فرلانگ آگے جاؤ۔ پھر دائیں ہاتھ نیچے اتر جاؤ۔“
 ”ہٹاؤ یار“ شاعر بولا ”راستہ تلاش کرنے کا فائدہ؟ اسی ہوٹل میں کیوں نہ رات بسر
 کر لیں؟“

بابا کے ہوٹل میں پچتر تلے چار پائوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا کھا یا اور
 لیٹ گئے۔

بابا کے ہوٹل والی دہ رات مجھے آج تک نہیں بھولی۔ چاروں طرف خوفناک سناٹا
 چھایا ہوا تھا۔ نلے میں بستے ہوئے پانی کی مسلسل گھر گھر اس سمیٹ سناٹے کو اور بھی سنگین
 بنا رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے فطرت اس سناٹے کی زبان سے آفرینش کا راز بیان کر رہی ہو
 قدرت کے تخلیقی چکر کا بھید کھول رہی ہو۔

پتا نہیں کس اصول کے تحت پہاڑوں میں پُر فضا مقامات سطحی جذبات پیدا کرتے
 ہیں اور خوفناک مقامات دل کی گہرائیوں میں عظیم جذبات جگا دیتے ہیں۔
 اگلے روز صبح سویرے ہی ہم بابا کے ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔
 اس روز سبھی خاموش تھے۔ وٹ کو کہنے کے لیے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ لیڈر
 سنگلاخ پہاڑوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ داستان گو بدھ جکشووی کا سا آسمن جھانے
 بیٹھا تھا۔

ماحول اس قدر بوجھل تھا کہ ہم ایک عجیب سی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اُونچے
 اُونچے پہاڑ اپنا گھیرا مسلسل تنگ کرتے جا رہے تھے۔ گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ننگی سنگلاخ
 چٹانوں سے گرمی کے بھیکے اُٹھ رہے تھے۔ سڑک پر آبادی کا نشان تک نہ تھا۔
 دوپہر کے قریب ایک موڑ کاٹنے کے بعد دفعۃً ہم ایک آبادی میں داخل ہوئے۔

”ارے! یہ آبادی کیسی ہے؟“ وٹ بولا۔

”یار، یہ تو بروزن کالا پانی، کالا پہاڑ نظر آتا ہے“ شاعر نے کہا۔

”یہ ایک نہیں، دو آبادیاں ہیں“ انجینئر نے جواب دیا۔

”دو آبادیاں ایک ہی جگہ، ساتھ ساتھ!“

”یہ ڈاسو ہے، سوات کا آخری قصبہ۔ اور وہ اُدھر سامنے کو میلا، کوہستان کا پہلا

قصبہ۔ درمیان میں دریا ہے۔ اُدھر ڈاسو، اُدھر کو میلا“ انجینئر نے وضاحت کی۔

”میں نہیں مانتا“ میں نے کہا ”یہاں دریا ہوتا تو کچھ تو خنکی ہوتی“

”کیا واقعی درمیان میں دریا ہے؟“ شاعر نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں بھی۔ وہ دیکھو، درمیان میں فوجی پُل ہے۔ یہ وہی دریا ہے جو ہم نے

تھا کوٹ پر عبور کیا تھا“ انجینئر نے مزید وضاحت کی۔

”اونوں۔ یہ وہ دریا نہیں“ وٹ بولا ”اس میں گیلا پانی نہیں معلوم پڑتا۔ بھئی، وہ

تو خوشگوار دریا تھا۔ ہوا میں غلی غلی۔ ٹھنڈک تھی۔ یہاں تو گرمی کی بھڑاس کے سوا کچھ بھی نہیں“

”ضرور یہ لادے کا دریا ہو گا۔ بھی تو یہ جگہ جہنم معلوم ہوتی ہے“ داستان گو بولا۔

”کتنا خوفناک مقام ہے!“ ڈرائیور نے جھنجھری لی۔

”رود کو، یار، رود کو! کہیں سے چائے کا پیالہ بیٹیں“ لیڈر بولا۔

”رُکنے کو جی نہیں چاہتا“ ڈرائیور نے کہا ”رُکے تو دم نچت ہو جاہیں گے“

”ہاں یار، یہ شہر نہیں، بھٹی معلوم پڑتی ہے“

”نہ کو، نہ کو، لیڈر غز آیا“ ہم رکیں گے۔ گاڑی رُک گئی۔

ہوٹل دھواں دھار تھا۔ کمرے میں بورڈوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں چار

پانچ پٹھان ڈرائیور بڑے تھے جیسے تلے ہوئے کریلے ہوں۔

”ہٹاؤ، بھئی۔ یہ تو دم گھٹ مقام ہے“ میں نے کہا۔

”ہوں۔ پانی پیو اور چل پڑو“ ڈرائیور بولا۔

”جانا کہاں ہے، بابو؟ آگے سڑک بند ہے“ پٹھان ڈرائیور قہقہہ مار کر ہنسنا۔

راستہ بند ہے؟ لیڈرنے دہرایا“ لیکن کیوں؟“

”دیکھو، بابو، ام ادھر دس سال سے ٹرک چلا رہا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک بند ہے ام رُک جاتا ہے۔ جب کوئی بولتا ہے کہ سڑک کھل گیا تو ام چل پڑتا ہے۔“

”کب سے ادھر رُکا ہوا ہے، آپ؟“ انجینئر بولا۔

”چار دن سے“ خان نے جواب دیا۔

”چار دن سے؟“ سب نے حیرت سے دہرایا۔

خان ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ بولا ”صاحب، اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر ہونا چاہیے۔ جہاں روکا رُک گئے۔ جہاں چلایا، چل پڑے۔ رُک گئے تو رُکنے کا غم نہیں۔ چل پڑے تو چلنے کی خوشی نہیں۔“

”لیکن راستہ بند کیوں ہے؟ وجہ کیا ہے؟“ لیڈرنے پوچھا۔

”بس بند ہے۔ پتا نہیں کیوں بند ہے“ اس نے جواب دیا۔

”کب کھلے گا؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”کچھ پتا نہیں۔ چلے آج کھل جائے، چاہے چار دن بند رہے“ دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

”چار دن اور بند رہے گا؟“ لیڈر چلایا ”ہماری پھٹیاں تو یہیں ختم ہو جائیں گی“

”یہ بڑی مشکل ہوئی“ انجینئر نے کہا۔

”جلو، یہیں سے واپس چلے جائیں“ وٹ نے منہ بنایا۔

”پچھے بھی تو سڑک بن رہی ہے“ خان بولا ”اگر پیچھے بھی سڑک بند ہوئی تو کیا کرے گا؟ نہ ادھر کا رہے گا نہ ادھر کا۔“

”مارے گئے یار“ شاعر تڑپ کر بولا۔

”سمجھ لو جوازہ نکل گیا“ وٹ نے سمجھ بنایا۔

”صبر، بابو، صبر۔ اس سڑک پر چلنے کے لیے صبر چاہیے،“ ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

”یہاں کوئی افسر ہے، جس سے بات کی جاسکے؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”بس ایک کرنل ہے“ خان ڈرائیور نے جواب دیا ”اُدھر میلہ میں اس کا کیمپ

ہے، دریا کے پار۔“

بہت سے خیموں کے درمیان کرنل کا دفتر ایک پھوٹے سے کوارٹریں واقع تھا۔

دروازے پر ایک سپاہی بدوق اُٹھانے چلی پلائی دھوپ میں کھڑا تھا۔

”ہے جوان، ہمیں کرنل صاحب سے ملنا ہے“ ڈرائیور نے کہا۔

”کون ہے تم؟“ وہ بولا۔

”ہم اسلام آباد سے آیا ہے“

”تو پرچی پر نام پتا لکھواؤ۔ ام پرچی لاتا ہے۔“

چار ایک منٹ کے بعد سپاہی اندر سے ایک پرچی اور پنسل لے آیا۔

”کیا نام ہے؟“ وہ بولا ”باب کا نام؟ کہاں کا ہے؟ گاؤں کا نام؟“

”اسلام آباد“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”تحصیل کا نام؟“

”یہی کافی ہے، خان“ انجینئر بولا۔

”بائی، یہ کافی نہیں ہے۔ ام جو بولتا ہے، یہ کافی نہیں ہے۔“

”تم کرنل صاحب کو جا کر دکھاؤ تو“ لیڈر نے کہا۔

”نہیں“ وہ بولا ”کیسے دکھائے ام؟“

”کیوں؟“

”بس، یہی حکم ہے کہ پرچی پوری لکھو“ سپاہی نے کہا۔

”اچھا تو پوری لکھ لو“ ڈرائیور بولا۔

”بولو۔ تحصیل کا نام؟ سپاہی نے پوچھا۔

”اسلام آباد“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”گاؤں کا نام بھی اسلام آباد، تحصیل کا نام بھی اسلام آباد“ سپاہی نے مشکوک نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

”بالکل“ انجینئر نے بنجیدگی سے کہا۔

”اچھا۔ ضلع کا نام؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”اسلام آباد“ انجینئر نے جواب دیا۔

”خوہم سے محول کرتا ہے؟“ سپاہی بگڑ گیا۔

دٹ آگے بڑھا ”بھئی خان صاحب سے مذاق نہ کرو۔ لکھو خان، گاؤں اسلام آباد، تحصیل راولپنڈی، ضلع چک لالہ“ شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔

خان نے پرچی پھاڑ دی اور رائفل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

”اب اس سے بات نہ کرنا“ داستان گو نے کہا ”گولی مار دے گا۔“

اتنے میں ایک اور سپاہی آگیا ”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کرنیل صاحب سے ملنا ہے“ انجینئر نے جواب دیا۔

”کیا کام ہے؟“

”سڑک کے بارے میں پوچھنا ہے“ ڈرائیور نے کہا۔

”کیا پوچھنا ہے؟“

”کہ سڑک کب کھلے گی؟“

”جب کھلے گی، کھل جائے گی“ سپاہی نے کہا ”وہ دیکھو، ڈیڑھ سڑک یہاں رکا

پڑا ہے۔ چار روز ہو گئے ہیں۔“

”ہم حکومت کے آدمی ہیں۔ ہم نے واپس جانا ہے“ انجینئر نے کہا۔

”تو جاؤ۔ واپس جاؤ۔ کون روکتا ہے“ سپاہی بولا۔

”بے کار ہے، یار۔ پھوڑو“ شاعر نے زیر لب کہا ”خواہ مخواہ یہاں دھوپ میں اپنا آئینہ

بنادے ہو۔“

”چلو، بھئی، چلو“ دٹ چلایا، اور ہم دہاں سے واپس چل پڑے۔ راستے میں ڈرائیور کہنے

لگا ”یار، اس ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آگے ہی سڑک بند ہے۔ چلو، پیچھے چلتے ہیں۔ دوچار

میل دُور کوئی پُر فضا مقام ضرور مل جائے گا، جہاں پانی کا چشمہ ہو، درختوں کا سایہ ہو۔ دہاں جا کر

پڑاؤ کریں گے، خیمے لگائیں گے، امداد آرم کریں گے۔ کیوں کیسا؟“

”ہاں یار، ہوٹل میں جانے کو جی نہیں چاہتا“ شاعر بولا۔

”ہوٹل کہاں ہے؟ تندو ہے؟“ دٹ نے مُنہ بنایا۔ اور ہم واپس پتن کی طرف چل پڑے۔

اس تجویز سے سب متفق تھے۔

ابھی ہم ڈاسو سے ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ برب سڑک ایک ٹھنڈی کھوہ نظر آئی۔

اس کھوہ میں ایک چوڑا سا بڑکا پائپ لگا ہوا تھا، جس میں سے پانی کا اتنا موٹا دھارا بہ رہا تھا۔

ڈرائیور نے جیب روک لی ”واہ! کیا مقام ہے!“

”یہ پائپ کیوں لگا ہوا ہے؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”بس لگا ہوا ہے“ دٹ نے کہا ”آتم کھاؤ، پیر نہ گنو“

”یہ لگا نہیں، لگایا گیا ہے۔ دیکھو، اُدپر سے پانی پائپ کے ذریعے لایا گیا ہے۔ پھر یہاں

اسے سپلوٹ دے کر کھڑا کیا گیا ہے“ ڈرائیور نے وضاحت کی۔

”بالکل، بالکل۔ تاکہ ہم اس دھارے کے نیچے کھڑے ہو کر نہا سکیں“ دٹ چلایا۔

”ہاں، یار۔ میں بھی نہاؤں گا۔“ شاعر نے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔ ابھی ہم نہانے کی

تیاہیاں ہی کر رہے تھے کہ ایک ڈائریکٹر ٹرک آگیا، اور دو چینی ٹرک سے اُتر کر چینی چاؤ پھاؤ

چلانے لگے۔ ٹرک بیک ہو کر دھارے کے نیچے اکھڑا ہوا۔
 ”دیکھا؟ انجینئر بولا ”یہ جینیوں کا دائرہ ڈپوسٹم دیتا ہے۔ انھوں نے یہ دھارا سوچ سمجھ کر
 بنایا ہے“

”اے، بالو صاحب“ ایک سپاہی آدھکا ”یہاں اڈا نہ بناؤ۔ یہ جینیوں کا دائرہ ڈپوسٹم ہے“
 ”سنتری“ ڈرائیور نے پوچھا ”اس سڑک پر قریب ہی کوئی اور ایسی جگہ ہے جہاں پانی کا
 چشمہ ہو اور جہاں ہم قیام کر سکیں؟“
 ”اونوں“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”یہ سارے پہاڑ بخر ہیں۔ پٹن کے قریب کوئی چشمہ
 مل جائے تو پتا نہیں“

”ہم نیچے دریا میں خیمے لگالیں تو کیسا رہے؟“ ڈرائیور نے انجینئر سے پوچھا ”وہ دیکھو،
 نیچے دریا کے کنارے پر ریت بھی ہوئی ہے۔“

”لیکن نیچے جانے کا کوئی راستہ بھی ہو“ انجینئر نے جواب دیا۔
 ”نہیں ہے تو بنالیں گے۔ کیوں سنتری جی؟“ ڈرائیور نے کہا۔

”یہ قبائلی علاقہ ہے، بالو صاحب“ سنتری بولا ”بستی کے سوا کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ رات
 بسر کرنی ہے تو ڈاسو جاؤ۔ ادھر اُدھر کیمپ نہ لگانا۔“

”یہ جگہ بہت اچھی تھی“ لیڈر بولا۔

”یہاں کیمپ لگانے کی اجازت نہیں“ سنتری نے کہا۔

”یار، ٹھیک ہے۔ ڈاسو چلے جائیں گے۔ لیکن یہاں نہا تو لیں“ رات تک ہم وہاں
 نہاتے رہے۔ پھر مجبوراً ڈاسو واپس چلے گئے۔

ڈاسو پہاڑوں کے درمیان واقع ہونے کے باوجود ایک تپتا ہوا صحرا تھا۔ چاروں
 طرف پہاڑوں سے بھرپور اس نکل رہی تھی۔ ہوٹل کا چولھا مسلسل دھواں دے رہا تھا۔ وہاں
 رات گزارنا ایک عذاب نظر آ رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد خنکی ہونے کے بجائے ٹو کا بھکڑ چلنے لگا۔ کسی مسافر نے افواہ اڑادی کہ سڑک کھلنے والی ہے۔ ٹرک ڈرائیور اپنے اپنے ٹرک کی طرف بھاگے۔ ڈیڑھ سوٹرکوں کے انجن سٹارٹ ہو کر مزید بھڑاس نکالنے لگے۔

”بند کر دیا، بند کرو“ داستان گوجلایا، ہم کب تک اس تپتی ہوئی جیپ میں بیٹھے انتظار کریں گے کہ کب سڑک کھلتی ہے“

”بھئی، سڑک کھلنے والی ہے“ لیڈر غصے سے بولا۔

”کھلنے والی ہے تو کیا ہوا؟“ شاعر بولا۔

”ڈیڑھ گھنٹے سے ہم جیپ میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کھل جائے گی تو دیکھا جائے گا“ داستان گونے لگا۔

”اوہنوں۔ یہ سڑک نہیں کھلے گی“ سنتری قریب آکر بولا۔

”تو کیا ہمیں رات یہیں بسر کرنی پڑے گی؟ اس تندور میں؟“

”یار“ وہ بولا ”دو سال سے ہم اس تندور میں پڑے ہیں۔ یہاں سارا دن تندور جلتا ہے۔

شام کو ٹو کا بھکڑ چلتا ہے، اور رات کو تھڑوں کی فوج چڑھائی کر دیتی ہے“ سپاہی نے کہا۔

”اتنی گرمی میں تھڑ؟ داستان گونے حیرت سے پوچھا۔

”یہاں کے تھڑ خاص الخاص ہیں“ سپاہی نے کہا ”جو گرمی میں مرتے نہیں، پلتے ہیں“

”رات تو ٹھنڈی ہو جاتی ہوگی“ لیڈر نے پوچھا۔

”اوہنوں۔ رات کو آندھی چلتی ہے۔ روز بلا تاغہ بجلی ملتی ہے۔ بڑی خوف ناک کڑک۔

دل دہل جاتے ہیں“

”اچھا پہاڑ ہے یہ؟“ لیڈر چلایا۔

”یہ پہاڑ میں، کوہستان ہے جیسا موسم ہے، ویسے ہی لوگ ہیں“ سپاہی نے کہا۔

”تھڑ، یار“ لیڈر چلایا ”کیوں نہ ہم ہوٹل کی چھت پر رات گزاریں؟ میں ہوٹل والوں

سے بات کرتا ہوں۔“

ہوٹل کی چھت ہوا رہی۔ اس پردس ایک چار پائیاں بھی ہوئی تھیں۔
 ”چھت پر سونا منع ہے“ سپاہی نے کہا۔
 ”کیوں؟“ ڈرائیور غصے سے بولا۔

”پرے کو ہستانیوں کے گھر میں بے پردگی ہوتی ہے۔ تم تھانے میں ڈیرا لگا لو۔ تمہیں
 چار پائیاں دے دیں گے“ سپاہی نے کہا۔

رات کو ہم نے تھانے میں ڈیرا لگا لیا۔ ڈرائیور نے ہوا ر جگہ پر دونوں خیمے لگالیے۔
 یہ خیمے عروسی نوعیت کے تھے۔ ایک خیمے میں دو فرد سو سکتے تھے۔ اُٹھنے یا بیٹھنے کی گنجائش نہ
 تھی۔ رینگ کے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ اور پھر لیٹ جیسے کوئی لمحہ میں آ پڑا ہو۔

آدھی رات کے وقت آدھی چلنے لگی۔ پہلے تو ہوا سیٹیاں بجاتی رہی، پھر ریت اُٹنے
 لگی۔ ساری وادی عباد اکود ہو گئی۔ بالآخر گرج چمک شروع ہو گئی۔ یہ گرج بھی عجب قسم کی تھی۔
 ہر کوڑک پر لیون محسوس ہوتا تھا جیسے بجلی ہم پر گری ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم باری ہو رہی ہو،
 اور دشمن تاک تاک کر نشانہ لگا رہا ہو۔ ہم نے بھاگ کر جیپ میں پناہ لی۔ لیکن جیپ میں
 کتنی کتنی جتنا بڑا پتھر ہمارا منتظر تھا!

الپچی نالا

اگلے روز دوپہر کے قریب سڑک کھلنے کا اعلان ہو گیا۔ ڈرائیور نے شور مچا دیا "جلدی، جلدی۔ اگر ہم ٹرکوں کے بیچ میں پھنس گئے تو مارے جائیں گے۔"
جب سڑک کھلی تو ہماری جیب سب سے آگے تھی۔ ہمارے پیچھے سو ڈیڑھ سو ٹرک تھے۔

"ارے! یہ سڑک ہے کیا؟" ڈرائیور چلایا۔
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
"ذرا دیکھو تو!"

ہم نے آگے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔
"بھئی، وہ سڑک کہاں ہے" وٹ چلایا "جو انھوں نے کھولی ہے؟ اگر یہ پتھروں کا ڈھیر سڑک ہے تو اسے بند کرنے یا کھولنے کا مطلب؟"
"ہاں، یار۔ کتا تو ٹھیک ہے" شاعر نے وٹ کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"شکر نہیں کرتے کہ انھوں نے ٹریفک کھول دی ہے" لیڈ نے کہا "اگر ڈاسو میں ایک رات اور بس کرنے پڑتی تو طبیعت صاف ہو جاتی۔"

"اُٹ! وٹ سر سہلاتے ہوئے بولا "بڑے دھکے لگ رہے ہیں، یار۔"
"دھکے تو لگیں گے۔ سڑک ہی ایسی ہے۔ پتھروں کا ڈھیر لگا ہے۔ گاڑی کے دباؤ سے پتھر لڑھک جاتے ہیں" ڈرائیور بولا "حالانکہ میں پانچ میل کی سپیڈ سے چل رہا ہوں۔"

دہ نظر عجیب تھا۔ سو ڈیڑھ سو ٹرک پتھروں پر لڑھک رہے ہیں۔ انجن گھاڑ گھاڑ
کہہ رہے تھے۔ بہتوں تلے سے پتھر پھسلتے اور پھریوں اڑتے جیسے بیڑے ہوں۔ ہمارے دل
سہے ہوئے تھے۔ اب گرے کہ اب گرے۔

موڑے پتھروں کی بو سے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ سورج جھنڈا گاڑ کر سر پر کھڑا تھا۔
چٹانوں سے گرمی یوں ٹھوٹ ٹھوٹ کر نکل رہی تھی جیسے جیڑے بردزہ رستابے۔ ہوا بند
تھی۔ سڑک پر درخت پودے یا جھاڑی کا نشان تک نہ تھا۔ دُور نیچے دریا یوں بہ رہا تھا
جیسے مکھیتوں کا چھتا بھنھنا رہا ہو۔ دریا کے باوجود ہوا میں نہ خشکی تھی نہ نمی۔ ہم پر بے نام
خوف دہراں طاری تھا۔

”واہ! کیا ریشمی سڑک بھی ہے“ دٹ بولا۔

”خبردار! لیڈر غز آیا“ اگر تو نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں تجھے اٹھا کر دریا
میں پھینک دوں گا۔“

”اللہ کے واسطے پھینک دو“ دٹ نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”دوہا پانی تو ہوگا، کم از کم“
”پانی میں تو تیری لاش پہنچے گی“ شاعر غز آیا۔

”چلو، لاش ہی سہی۔ میری لاش تو پانی میں ہوگی۔ تیری لاش کو تو ادھر گدھ کھائیں گے“
دٹ نے کہا۔

”یہاں تو گدھ بھی نہیں آئیں گے“ انجینئر بولا۔

”بکواس بند کرو“ ڈرائیور غز آیا ”اگر میری توجہ ذرا بھٹکی تو ساری لاشیں دریا میں تیریں گی“
”کیا فرق پڑتا ہے“ انجینئر بولا۔

”بڑا فرق پڑتا ہے“ داستان گو بولا ”دیکھ لو، ذرا سے موسم سے کتنا فرق پڑ گیا ہے۔“

قمقمے تیوریوں میں بدل گئے ہیں۔ جملوں کی جگہ گالیاں برسنے لگی ہیں۔“

”بند کرو اپنا فلسفہ“ لیڈر غز آیا ”ڈرائیور کی توجہ بھٹکی تو —“

”تو ڈرائیور کا چاچا لگتا ہے کیا؟ شاعر بولا۔

”ارے! سب چلائے۔ جیپ نے شدید ہچکولا کھایا۔ سب ایک دوسرے میں گکڑھو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وٹ نے خود کو سنبھالا۔ بولا ”یارو! ہم خیریت سے ہیں کیا؟“ کسی نے جواب نہ دیا۔

”کیا ہم سڑک پر ہی ہیں؟“ وٹ نے پوچھا۔

”کیا پتا“ شاعر نے کہا ”سڑک کہاں ہے؟ یہاں تو پتھر ہی پتھر ہیں۔“

”شکر ہے، کوئی تو بولا۔ میں سمجھا تھا کہ میں واحد سردائیور ہوں۔“

”چوچو، پی جی، چن“ باہر سے آواز آئی۔

”یہ چڑیاں کہاں چکے لگیں؟“ وٹ بولا۔

”بے وقوف! خاموش! سامنے چینی سڑک روک کے کھڑے ہیں“ ڈرائیور بولا۔

”سامنے پتھروں پر چینی لیں چھٹے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلیوں پر چھوٹے۔“

”رک کیوں گئے، ڈرائیور؟“ انجینئر بولا۔

”آگے سڑک بند ہے“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”پھر بند ہے کیا؟ سب چلائے۔“

”سڑک تو ہے ہی نہیں، پھر بند کرنے کا مطلب؟“ شاعر نے منہ بنایا۔

”گاڑی سے اتر جاؤ“ رائفل دالا حوالدار قریب آکر چلایا۔ آگے بلا شنگ ہو رہا

ہے۔ پتھر گرے گا۔ مغز پھٹ جائے گا۔ کور لے لو، کور۔“

دراڈرام!

دراڈرام! ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ پہاڑوں نے مزید اٹھالا۔ سب نے

جیپ سے چھلانگیں لگادیں، اور کور لینے کے لیے بھاگے۔ آدھ گھنٹے تک دھماکوں کی قیامت مبارہی۔ سب یوں جیپ تلے یا اطراف میں دیکے موٹے تھے جیسے وہ بلاشنگ نہیں، ایئر ریڈ ہو۔

آدھ گھنٹے کے بعد حوالدار کی آواز سنائی دی "بلاشنگ خلاص۔ بلاشنگ خلاص۔" سائل مُردے جیپ تلے سے نکلے۔

"حوالدار، حوالدار" لیڈر چلتا "اب سڑک کھل گئی ہے کیا؟"
"نہ، بالو، اب تو سڑک بالکل بند ہو گیا ہے، بلاشنگ سے۔ سڑک پر پتھر کا ڈھیر لگ گیا ہے، ڈھیر کو صاف کرے گا، پھر راستہ بنے گا۔ جب ادھر کا راستہ بن جائے گا تو ادھر بلاشنگ ہوگا۔"

"خان، راستہ کب کھلے گا؟" ڈرائیور نے پوچھا۔
"کیا خبر؟ وہ بولا "چار دن لگ جائیں۔"

"چار دن؟" ڈپ چلتا "دوڑو، دوڑو، یارو۔ میں بے ہوش ہونے لگا ہوں۔ جلدی سے میرے منہ میں پانی ڈالو۔"

وہ جگہ ڈاسر سے بھی، "سہانک تھی۔ اُدپنے اُدپنے بلے چیل پہاڑوں کی دو مٹاری دیواریں کھڑی تھیں۔ درمیان میں ایک گہرے اور تنگ کھڈ میں دریا بہ رہا تھا۔ پہاڑوں پر نہ بھاری تھی، نہ پودا، نہ درخت۔ گھاس کا پتلا تنگ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کسی جگہ ہریا دل یا سائے کا نشان نہ تھا۔ چٹانیں تپ رہی تھیں۔ ان سے گرمی کے جھبکے اُٹھ رہے تھے۔ سڑک پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس ڈھیر پر ڈیڑھ سو ٹرکوں کی قطار کھڑی تھی۔

کوئی بھی ٹرک سیدھا نہ تھا۔ کوئی ادھر جھکا ہوا تھا، کوئی اُدھر۔ کوئی عین کنارے پر کھڑا ڈول رہا تھا۔ بچے گہرا کھڈ تھا۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے میدان میں پندرہ بیس دم پخت قسم کے موٹے موٹے خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہ چینیوں کا کیمپ تھا۔ اس کے ساتھ ہی

اوپنی بچی زمین پر پاکستانی حوالدار کا خیرہ تھا، جس میں چھ سپاہی مقیم تھے۔ ساتھ ہی بلا سنگ کے لیے بارود کا ذخیرہ تھا۔

ہم نے منظر کی طرف دیکھا۔

”یادو، میں بے ہوش ہونے لگا ہوں“ دٹ چلایا ”سٹیجر کا انتظام کر لو“

”غم نہ کھاؤ“ شاعر بولا ”ہم تھیں اٹھا کر نیچے کھڑے پھینک دیں گے“

”یادو، کتا تو ٹھیک ہے“ انجینئر بولا ”صورتِ حال اچھی نہیں“

لیڈر دوڑتا ہوا آیا ”حد ہو گئی، بھئی، حد ہو گئی“ وہ چلایا ”ٹرکوں کے سارے ڈرائیور

لوپوش ہو گئے ہیں“

”کیا سارے کے سارے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک بھی دکھائی نہیں دیتا“ لیڈر نے کہا۔

”بھئی، وہ ٹرکوں کے نیچے پڑے ہوں گے“ انجینئر نے کہا۔

”ٹرکوں کے نیچے؟“ شاعر نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں، یہاں اور کہیں سایہ بھی ہو“ انجینئر ہنسا۔

”اچھا، تو سالے اپنا اپنا سایہ ساتھ لائے ہیں“ دٹ بولا۔

”ہم تو جیپ تلے لیٹنے سے رہے“ لیڈر نے آہ بھری۔

”گنجائش ہی نہیں“ شاعر نے کہا۔

”حوالدار صاحب، حوالدار صاحب، یہاں کہیں سایہ ہو گا؟“ لیڈر نے پوچھا۔

حوالدار نے سر فنی میں ہلادیا ”خو، یہ تو دوزخ ہے، دوزخ، بالو صاحب۔ یہاں سایہ

کدھر سے آیا۔“

”چلو، یار۔ چار دن یہاں دوزخ میں رہنے کی ریسرسل ہی کر لیں گے“ دٹ بولا۔

”چار دن۔؟“ ڈرائیور غصے سے چلایا۔

”اوہ حوالدار، کہیں پانی ملے گا؟ شاعر نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں“ حوالدار بولا ”وہ سامنے موڑ پر نہ لاپا ہے“

چینی کیمپ کے عین مقابل ایک بڑا نالا تھا۔ پانی اُدپر سے آتا اور ایک چھوٹے سے میدان میں جمع ہو جاتا، اور پھر نیچے گرتا، جہاں ایک وسیع چوہچہ سا بنا ہوا تھا۔

پانی کو دیکھ کر سب نے چوہچہ میں پھلانگیں مار دیں۔ نہانے کے بعد ہوش آیا تو شاعر بولا ”لیڈر، ایک پیالہ چائے کا مل جائے تو....“

”خبردار! جو کسی نے گرم مشروب کا نام لیا تو“ انجینئر بولا ”یہ جگہ تو خود چائے کی گرم کیتلی ہے۔ یہاں چائے کا نام نہ لو۔“

”وہ ہر میوہ پیتی دے تو کہتے ہیں کہ گرمی کو گرمی کا ٹی ہے“ دٹ بولا۔

”یار، چائے تو ہیں بنا دوں“ لیڈر نے کہا ”لیکن یہاں چوہچہ جلانے کے لیے لکڑی کہاں سے ملے گی۔“

”ہاں، یار۔ یہاں تو گھاس کا تنکا تک نہیں جلانے کو۔“

”تو پتھر جلا لو“ دٹ بولا۔ سب تہقہ مار کر ہنسے۔

”ہنسنے کی بات نہیں، یار“ دٹ بولا ”کوئی نہ کوئی چوہنے کا پتھر مل ہی جائے گا۔“

”ہٹاؤ یار، چائے کو۔ کچھ کھانے کو مل جائے۔ کوئی بسکٹ۔ کوئی پھل۔ کوئی میز۔“

”ہاں، یار۔ سخت مجھوک لگی ہے۔“

”ارے! وہ جو تافانے ہیں ہمارے پاس“ لیڈر چلا یا ”جاؤ، یار، جاؤ۔ وہ تافانوں

کا پیکٹ تو اٹھا لو، جیپ میں سے۔“

پانچ ایک منٹ کے بعد دٹ منہ لٹکائے تافانوں کا تھیلا اٹھائے لوٹا۔ ارے

یار! یہ تو بڑی ظالم جگہ ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”ایسی ظالم گرمی ہے کہ گھی بھی ادیپور ریٹ ہو گیا“ دٹ نے رونی آواز میں کہا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ پراٹھے سوکھے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں۔“

”ارے! سچ کہتے ہو کیا؟“

”چلو، سوکھے ٹکڑے پانی سے نکل لیں گے“ لیڈ نے کہا۔

”ادنیوں۔ یہ سوکھ کر کاٹھ نہیں بنے، پتھر کی سلیں بن گئے ہیں۔ پانی سے نکلیں

نہیں جائیں گے“ دٹ بولا۔

ہر کسی نے ایک ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

”ادنیوں۔ یہ تو بالکل ہی کاٹھ بن گئے ہیں“ انجینئر نے کہا۔

”یار، ہم کھائیں گے کیا؟“ داستان گونے پوچھا۔

”گرمی جو ہے، کھانے کو۔ گرمی کھاؤ۔ پانی پیو“ دٹ چمکا۔

”بکو اس نہ کر“ شاعر چلا یا۔

”کرنے دے، یار، بکو اس“ داستان گوبولا ”اور یہاں کرنے کو ہے ہی کیا۔ اب کیا

بکو اس بھی نہ کرے؟“

”بی سیریس، بوائے“ لیڈ بولا ”نہ یہاں ہوٹل ہے، نہ دکان۔ نہ لکڑی ہے۔ جس سے

چوڑھا جلا یا جا سکے۔ پھر یہ بھی پتا نہیں کہ یہاں ہمیں کتنے دن رُکنا پڑے۔“

”ہاں، یار۔ بات تو ٹھیک ہے“ سب سمجیدہ ہو گئے۔

”بالکل غلط“ دٹ بولا ”یار، ہم اکیلے تو نہیں۔ ہمارے ساتھ ڈیڑھ سو ٹرک ڈرائیو

جو ہیں۔“

”ہاں، یار۔ وہ تو ہم بھول ہی گئے“ لیڈ نے کہا۔

”مرگ، انوہ ہے۔ جتن رہے گا“ دٹ بولا۔

شام کو جب ہم نامے سے باہر نکل کر سڑک پر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی جشن ہو رہا ہے۔ ہر ٹرک کے پہلو میں چوٹھا جل رہا ہے۔ تو سب پر پراٹھے پک رہے ہیں۔
 ”ارے! داستان گو بولا“ یہ تو جیسے برات اُتری ہوئی ہے۔“

”خان صاحب“ لیڈ ایک ٹرک ڈرائیور کی طرف لپکا ”خان“ یہ چوٹھا جلانے کو لکڑی کہاں سے لی؟“

”نہو، ہم ساتھ لایا“ وہ بولا ”سب کچھ ساتھ لایا۔ لکڑی، آٹا، مسالا، مرغی، گھی۔ سب کچھ۔“

”ارے! لکڑی بھی ساتھ لایا؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”یہاں سب کچھ ساتھ لانا پڑتی ہے۔ میرے پاس پندرہ دن کا راشن ہے۔“

”اور ہمارے پاس پورے مہینے کا“ دوسرا ٹرک ڈرائیور بولا۔

”ہمارے پاس بھی ہے“ داستان گو نے سوتھے ٹکڑوں کا تھیلا جھلایا۔

”میں بتاؤں؟“ وٹ بولا ”ٹکڑے چباؤ اور پراٹھے سونگھو۔ پراٹھے کامزائے

آئے تو میرا ذمہ۔“

”ارے نہیں۔ ان کے مہمان بن جاؤ۔ یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں“ شاعر نے کہا۔

”اس صورتِ حال میں نہیں ہوتے“ ڈرائیور ہنسنا۔

”ایک ایک ڈرائیور سے ایک ایک نوالہ مانگو تو....“ شاعر رک گیا۔

کدو

”ارے! مانگنا نہیں“ والد نے ہمیں دھکی دی ”تم بالو لوگ ہمارے کیمپ میں ڈیرا لگاؤ۔ روٹی ہم دے گا۔ کدو خود پکاؤ۔ سالانہ بھی ہم دے گا۔“

”کدو کدھر سے آئے گا؟“

”کدو جتنا چاہو۔ فکر نہ کرو۔“

خان چلا گیا تو داستان گورنے کہا یہاں تو گھاس کا پتہ نظر نہیں آتا۔ کدو؟ اور پھر جتنا چاہو؟

”یار! اس نے دریا کی طرف اشارہ کیا تھا“ انجینئر ہنسا۔

”بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ چلو، دریا کا جائزہ لیں“ لیڈ نے کہا۔

دریا کیمپ کے پیچھے تقریباً تین منزلیں نیچا تھا۔ ادھر پتھروں پر ریت کے

تودے لگے ہوئے تھے۔ جلی ہوئی چٹانوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بدبو کا ایک دیلا آیا۔

”ارے! وٹ بولا“ یہاں تو خالص کھاد کا ڈلو معلوم پڑتا ہے۔ ذرا دیکھو تو؟“

دیکھا تو فٹلے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

”لو! ابھی“ وٹ چلایا ”کھاد ہے تو کدو بھی ہوگا۔“

دریا کے پاٹ پر موٹی ریت کی بیچ بنی ہوئی تھی۔ سامنے ٹیلوں کی چوٹیوں

پر جگہ جگہ ریت بھی ہوئی تھی۔

”کمال ہے!“ ڈرائیور نے کہا ”پھاڑ کی چوٹیوں پر صحرا۔ ریت ہی ریت۔۔۔“

ریت ہی ریت؟

”ہاں، یار۔ یہ عجیب بات ہے! لیڈ نے جائزہ لیا۔

”ایوڈیشن تو ٹھیک ہے، یار۔ مگر کدو؟ شاعر بولا۔

”ارے! سانپ!“ لیڈ بولا۔

دیکھا تو ہمارے قریب ہی ایک دو گز لمبا بھورا سانپ جا رہا تھا۔

سب اٹھ کر بھاگے۔ وٹ سب سے آگے تھا۔

”بڑا بڑا سانپ ہے یہاں تو“ انجینئر بولا۔

”یہاں سانپ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ یہ پتھر بیٹے پھاڑ، ریت کے تودے اور دریا“

ڈرائیو نے کہا۔

”ہاں، یار۔ جی، ادھر دریا کی طرف کوئی نہیں آتا“ لیڈر بولا۔

”بل گیا! بل گیا؟“ وٹ کی آواز آئی۔

اوپر کیمپ کے قریب وٹ کھڑا تھا ہلارہ تھا بل گیا! بھی، بل گیا؟

”کیا ملا؟ سانپ؟“ شاعر نے پوچھا۔

”نہیں، یار، کدو“ وٹ بولا۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک لمبی سی تالی میں، بیل پر پندرہ بیس کدو لگے ہوئے

تھے۔

”یار! اتنے بڑے کدو! لیڈر نے حیرت سے کہا۔

”یہ مٹی میں نہیں اُگے ہوئے۔ خالص فضلے کی پیداوار ہیں“ وٹ ہنسا ”بڑے

تو ہوں گے“

اب سوال یہ تھا کہ کدو پکانے کا کون؟

”لو، کدو پکانے میں کیا مشکل ہے۔ اور پھر یہ کدو۔ خاص کھا دیں اُگا ہوا کدو۔

بس ہنڈیا میں ڈالو اور پھر ہنڈیا آڈلو۔ اللہ اللہ خیر سلا“ وٹ نے کہا۔

”تو پھر یار، تم ہی پکا دو“ ڈرائیو نے جواب دیا۔

”وہ رہا، بادرچی خانہ“ داستان گربولا۔

وٹ دو منٹ کے بعد بادرچی خانے سے باہر نکل آیا اور لمبے لمبے سانس

لینے لگا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے۔ بس پکا لیا کدو“ انجینئر ہنسنے لگا۔

”نہ بھی نہ“ وٹ نے کہا ”کدو پکانا تو مشکل نہیں، لیکن اس بادرچی خانے

میں کھڑا ہونا دل گردے کا کام ہے۔ اندر جاؤ تو دم گھٹتا ہے۔
 ”ادروہ جولا نگری اندر کام کر رہا ہے؟“ داستان گونے پوچھا۔

”پسینے کا فتارہ چل رہا ہے۔ لانڈری میں پانی ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں“ وٹ بولا۔
 ”اچھا، بھئی۔ میں تو چلا“ ڈرائیور نے کہا ”جب تک میں خیمے لگاؤں باہر میدان میں“
 جب ہم خیمے لگا رہے تھے تو چینی کیمپ میں سے کسی کی نگاہ پڑ گئی۔ پھر دیکھتے ہی
 دیکھتے سات آٹھ چینی ہمارے ارد گرد آکھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غور سے خیموں کو دیکھنے
 لگے۔ نائیلون کی رستوں کا معائنہ کرنے لگے۔

وہ خیموں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ان کی
 جی جی چوچن چوسے سا اگر دوش بٹیش بھر گیا۔

”یارا یہ تو چڑیاں بول رہی ہیں“ وٹ نے کہا۔
 ”بولنے دو“ شاعر ہنسا۔

قریب ہی سے حوالدار کی آواز آئی ”کوئی نئی چیز ہو، یہ چینی اسے دیکھ دیکھ کر
 پاگل ہو جاتے ہیں۔ نئی مشین پر تو مکھٹیوں کی طرح بھنبھنتے ہیں۔“

”حوالدار، آپ ان کی بات سمجھتے ہیں کیا؟“ داستان گونے پوچھا۔

”ہمارے پتے تو کچھ نہیں پڑتا، ہاں، اشاروں سے چھوٹی موٹی بات کر لیتے ہیں“
 حوالدار نے جواب دیا۔

خیمے گاڑنے کے بعد ہم نے باہر زمین پر بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ چار خیموں
 میں، تین باہر۔ اس وقت شام پڑ چکی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود
 پہاڑوں سے بھڑاس نکل رہی تھی۔ خشکی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”حوالدار صاحب، یہ جگہ اتنی گرم کیوں ہے؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”یہ تو جہنم ہے، صاحب، جہنم“ حوالدار بولا ”یہاں دن اور رات میں کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ رات کے دہ بجے جب پہاڑ ٹھنڈے پڑتے ہیں تو گرم لوکی اُنہی چلنے لگتی ہے۔“

”رات کے دہ بجے گرم ٹو؟ لیڈرنے کہا ”وہ کس اصول کے تحت؟“
 ”یہاں اصول نہیں چلتے، صاحب“ حوالدار نے کہا ”گرم بگولے چلتے ہیں۔ ایک دن کے وقت، چار پانچ بجے، دوسرا رات کو، دوتین کے قریب۔ ان بگولوں میں گرمی ہوتی ہے، ادریت۔ منیلا سے لے کر چلاس تک ریت اُڑتی ہے۔ ساتھ چمک اور کڑک بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار چار بوندیں بھی پڑ جاتی ہیں تو ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔“

”یہاں سانپوں کی افراط ہے کیا؟“ انجینئر نے پوچھا۔
 ”سانپ تو ہیں۔ بہت ہیں۔ ادھر دیا کی طرف“ حوالدار بولا ”نہریے بھی ہیں۔ پر ادھر نہیں آتے۔“

”ادپر کیوں نہیں آتے؟“ داستان گونے پوچھا۔
 ”کیسے آئیں؟ موسم کی وجہ سے سر چھپائے پھرتے ہیں، بگولوں میں ریت کی وہ مار پڑتی ہے کہ آنکھیں نہیں کھلتیں۔ پھر ادپر سے گرمی۔ ادر صاحب، کھانے کو یہاں ہے کیا؟ نہ چمک، نہ مینڈک بے چارے جھوک کے ہاتھوں تنگ ہیں۔“

زندگی کا راز

شاعر نے فقہہ لگایا۔

”تم ہنستا ہے، بالو،“ حوالدار بولا ”یہاں آٹھ دن رہو تو سمجھ میں آجائے۔ جو ہم یہاں دو سال سے بیٹھا ہے اس جہنم میں۔“
 ”خان“ ایک ٹرک ڈرائیور بولا ”تو دو سال کی بات کر رہا ہے، ام دس سال

سے اس سڑک پر چل رہا ہے۔ ہاں۔“

”تم چل رہا ہے، بیٹھا نہیں“ خان بولا ”بیٹھنے اور چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے“

”دیکھ، خان“ ٹرک ڈرائیور نے حوالدار کو پھیرا ”جو جینا سیکھنا ہے تو چلنا سیکھو۔ ہم

تو کہتا ہے، بابو، جو جینا سیکھنا ہے تو پہلے ٹرک چلاؤ۔ دو سال ٹرک چلاؤ تو پھر تم زندگی

کر سکتے ہو۔ پھر کچھ فکر نہیں۔ غم تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ خوشی تمہارا کچھ نہیں بگاڑے

گی۔ دال کھاؤ گے تو یوں لگے گی جیسے پلاؤ ہو۔ کپڑا اچھا ہو، بُرا ہو، نیا ہو، پرانا ہو۔ کچھ

فرق نہیں پڑے گا۔ گرمی ہو یا سردی۔ برت پڑ رہی ہو۔ پڑی پڑے“

”تم کب سے اس سڑک پر چل رہے ہو؟“ شاعر نے پوچھا۔

”اپنی تو ساری زندگی ہی اسی سڑک پر گزری ہے۔ پہلے کلیںز تھا، پھر ڈرائیور

بن گیا۔ اب مالک ہوں، ٹرک کا۔“

”کسی اور سڑک پر کیوں نہیں چلتے؟“ وٹ نے پوچھا۔

”اس سڑک کو چھوڑ کر کون جائے“ ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

”کیوں؟ اس سڑک میں کیا ہے؟“ شاعر نے پوچھا۔

”اس سڑک میں بارہ سواد ہیں، بابو“ ٹرک ڈرائیور ہنسا۔

”جہنم ہے، جہنم“ خان غصے سے چلا یا۔

”جہنم بھی ہے، بہشت بھی ہے، حوالدار۔ ٹرک ڈرائیور جہنم اور بہشت دونوں

سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اب دیکھ لو، سڑک چلتی رہے تو ٹھیک، رُک جائے تو ٹھیک۔

سب اچھا۔ دس دس دن رُکے رہتے ہیں، پر کبھی لال نہیں آیا۔ دل میلانہ ہوا۔ راشن

ہو تو پراٹھے کھاتے ہیں، مرغی پکاتے ہیں۔ نہ ہو تو چنے چبا کے پانی پیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بس بابو، یہی بھید ہے زندگی کا۔ دل تنگ نہ کرو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جو ہے

اسے قبول کرو۔ جو نہیں، اُس کے خواب نہ دیکھو“

”بالکل یار“ داستان گو بولا ”تُو نے صوفی کا بھید پالیا۔“
 ”صوفی دینی کا تو اپنے کو پتا نہیں“ وہ بولا ”نہ ہی ولی کا پتا ہے۔ اور پتا لگا کر
 کرنا بھی کیا ہے؟“ وہ اٹھ بیٹھا ”اچھا، حوالدار“
 ”کیسے آیا تھا؟“ حوالدار نے پوچھا۔

”ادھر پانی لینے آیا تھا۔“
 ”نیند نہیں آئی کیا؟“
 ”تاش کی بازی چل رہی ہے“ وہ بولا۔
 ”اس اندھیرے میں؟“
 ”لال ٹینس جو ہیں۔“

”اور گرمی؟ اس گرمی میں تو جان نکل رہی ہے“ لید نے کہا۔
 ”بالو، اپنی جان تو کب سے نکل چکی۔ سالی نکل گئی تو سکھی ہو گئے۔ ایک یہ
 حوالدار ہے کہ جان کو یوں مٹھی میں دبائے ہوئے بیٹھا ہے جیسے ہاتھ کا بیڑا ہو۔ سالی کو
 ناز نعمت میں رکھو تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ عذاب بن جاتی ہے“ وہ ہنسا ہوا چلا گیا۔
 ”یار“ انجینئر بولا ”کیا بات کر گیا ہے، یہ ٹرک ڈرائیور؟“
 ”ان کی بات نہ سنو، صاحب“ حوالدار بولا ”ان کا کیا اعتبار۔ آج یہاں، کل وہیں۔
 پیسے کی کمائی کھاتے ہیں۔ پیسے پر چڑھے رہتے ہیں۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے ہیں۔ ان کا
 کیا بھروسہ؟“

گرمی کی وجہ سے رات بھر وہیں نیند نہ آئی۔ پھر تیسرے پیر آدھی چلتے لگی، اور
 ہم نے منہ سر چادریں پلیٹ لیا۔

چیلنی میمپ

چیلنیوں کا میمپ، بالکل ایسا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا گھروندا ہوتا ہے۔ تفصیل

سوچتی سمجھی ہوئی تھی۔

چینی ایسی جگہ کیمپ لگاتے ہیں جہاں پانی دافر ہو، اور وہ پانی چھتے کا ہو۔ دریا یا نالے کا نہیں۔ پہلے پانی کا معیار نہ کرتے ہیں کہ صحت کے لیے موافق اجزاء موجود ہیں یا نہیں۔ پھر بلندی پر کسی محفوظ جگہ ربر کی موٹی سی نال لگا دیتے ہیں اور ربر بڑے بڑے بانسوں کی مدد سے نال کو سہارا دے دے کہ کیمپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیمپ میں پہنچ کر نال کا پانی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک پینے کے لیے اور دوسرا برتنے کے لیے۔

پینے کا پانی سیدھا ایک حمام میں اکٹھا ہو جاتا ہے، جس کے نیچے ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ دہاں سے پانی کچن میں جاتا ہے اور باہر ایک ٹوٹی پینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ چینی ٹھنڈا نہیں، گرم پانی پیتے ہیں۔

جب وٹ نے یہ سنا تو دہ چیخ اٹھا "نہیں، یا۔ میں نہیں مانتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی سمجھدار قوم اور ایسی طاقت کرے! بھلا گرم پانی پینے کی تک ہے کوئی؟"

"پی کے دیکھو تو پتا چلے" انجینئر بولا "پیٹ نہیں بڑھتا۔ جراثیم مر جاتے ہیں معدے میں گر بڑ نہیں ہوتی۔ بار بار پیاس نہیں لگتی۔"

"ہٹاؤ، یا۔" شاعر بولا "ہمیں دنیا بھر کی بیماریاں منظور ہیں، لیکن پینے کو ٹھنڈا پانی ملے"

نالے پر چینیوں نے ایک عام چوبچو بنا رکھا تھا۔ اس چوبچے سے ایک دھارا بہتا تھا۔ دھارے کے سامنے ایک چھوٹی سی پن جکتی لگی ہوئی تھی۔ اگر دھارا پن جکتی کے پروں پر ڈال دیا جاتا تو دو چھوٹے چھوٹے پتھر کے پاٹ گھومنے لگتے۔ غالباً یہ آٹا یا چاول پیلنے کی مشین تھی۔

کیمپ میں ایک جبریز لگا ہوا تھا جو بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس بجلی سے چھوٹے چھوٹے قمقمے روشن ہو جاتے۔ لیکن سارے کیمپ میں کوئی بجلی کا پنکھا نہ تھا۔

خیمہ موٹی اور دوسری کینوس کے بنے ہوئے تھے، جو چاروں طرف سے بند تھے۔ پہلو

میں صرف ایک جالی دار کھڑکی تھی۔ خیمے کو دیکھ کر ہی شدت سے گرمی لگنی شروع ہو جاتی۔ ان خیموں میں چینی تیس اُتار کر ہلکی نگریں پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ کھانے کے وقت گھنٹی بجتی اور وہ اپنی اپنی بائٹی اٹھا کر لائن میں جا لگتے۔ صبح کے وقت کالی کالی کھیر سی کھاتے اور دوپہر کو چاول۔

چینی کیمپ کی ایک خصوصیت بڑی عجیب تھی۔ وہ گردلوں میں کام کرتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں سڑک پر کھڑے ہو کر بلا سنگ کرتے۔ پھر سڑک کے پتھروں کو مشین سے ہموار کرتے۔ پھر خود ہاتھوں سے پتھر سڑک پر جاتے۔ لیکن اس دوران میں دیکھنے والے کو پتا نہ چلتا کہ کون کام کر رہا ہے اور کون کام کر رہا ہے۔

کیمپ میں بھی ایک کڑا نظام رائج تھا۔ لیکن پتا نہیں چلتا تھا کہ نظام کون چلا رہا ہے۔ عمل درآمد کی ذمہ داری کس کے سر پر ہے۔ لباس، انداز، طور طریقے سے وہ سبھی ایک سے نظر آتے تھے۔ نہ کوئی حاکم تھا، نہ محکوم۔ کیمپ میں کوئی خصوصی خیمہ نہ تھا جس سے پتا چلتا کہ یہ ناظم کا ہے۔

اس بات پر وٹ بڑا خشکیاں ہوا، کوئی بات ہے، ”وہ بولا“ یہ اپنے حوالدار ہی کو دیکھ لو۔ ایک میل دُور سے دیکھو تو بھی صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ حوالدار ہے، اور باقی سپاہی ہیں۔“

”بالکل پتا چل جاتا ہے“ شاعر بولا۔

”ہر وقت اس کا ہاتھ مونچھ پر رہتا ہے“ ڈرائیو بولا۔

”ہاتھ مونچھ پر نہ ہو، تب بھی پتا چل جاتا ہے“ لیڈر نے کہا۔

”لیکن“ ڈٹ چلا ”ان چینیوں کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کون حوالدار ہے، کون سپاہی

ہے۔ خواجہ خلیفہ خدا کو کفیوڑ کرتے ہیں۔“

چینی کیمپ میں ہر وقت ریڈیو لگے رہتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ کیمپ میں

ایک بہت طاقتور ریسورس لگا ہوا تھا، جہاں سے ہر خیمے میں تارفت کمر کے لاؤڈ سپیکر لگائے ہوئے تھے۔ صبح سویرے ہی چینی ریڈیو کی آوازیں کان میں بڑھتی۔ پہلی بار انھیں سن کر لیڈر گھبرا گیا۔ دوڑا دوڑا آیا۔ کہنے لگا ”یار! تم تو کہتے تھے چینی کیمپ میں کوئی لڑکی نہیں۔“

”تو کیا غلط ہے؟“ شاعر نے پوچھا۔
 ”ہاں، غلط ہے“ پھر وہ قریب ہو کر زیر لب بولا ”کیمپ میں ایک لڑکی ہے۔ سالوں نے اسے چھپا کے رکھا ہوا ہے۔“
 ”تم نے اسے دیکھا ہے کیا؟“ انجینئر نے پوچھا۔
 ”دیکھا تو نہیں“ لیڈر بولا۔

”ہاں“ داستان گو مسکرایا ”میں نے بھی اسے دتے ہوئے سنا ہے۔ ہر خیمے کے لاؤڈ سپیکر سے اس کی آوازیں آتی ہیں۔“

”اے بھائی، وہ تو ان کا ریڈیو ہے۔ کوئی گناہ ہی ہوگی“ انجینئر بولا۔
 ”اس طرح جینیں مار مار کر گاتے ہیں کیا؟“ لیڈر نے غصے سے کہا۔
 ”کل دو چینی ٹرک ڈرائیوروں کے ادھے پر پہنچے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیوران سے چہلیں کر رہے تھے۔ ایک نے تو گال تک سہلائے۔ اس پر چینی طیش میں نہیں آئے بلکہ مسکراتے لگے“ دٹ نے کہا۔

”یہ جو کام کر رہے ہیں، بہت چھوٹی عمر کے لڑکے ہیں“ لیڈر بولا۔
 ”ہاں، ہاں۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں“ داستان گو نے کہا۔

چینیوں کی ایک خصوصیت حیران کن تھی۔ اگرچہ وہ خود سڑک بنارہے تھے، ساری ذمے داری ان کے سر پر تھی، اس کے باوجود وہ استقامی امور میں قطعی دخل نہیں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر چینی کیمپ کے ساتھ ایک پاکستانی یونٹ منسلک تھا۔ یہ

فوجی یونٹ پبلک سے رابطہ رکھتا تھا اور پاکستانی حکومت کے احکامات بجالاتا تھا۔
چینیوں کا کام صرف سڑک بنانے تک محدود تھا۔

جہنم

اس جہنم میں ہم تین دن رُکے رہے۔ وہ صبح شام بھی عجیب صبح شام تھے۔
صبح سات بجے سے نو بجے تک اور رات کو نو بجے سے گیارہ بجے تک، صرف چار گھنٹے
کے لیے اس تندہ کی آگ میں کچھ تخفیف ہو جاتی۔ باقی وقت سُرُج سر پر آگے یوں بیٹھ
رہتا جیسے کُلاہ ہو، اور پھر ہم سائے کے لیے تر پڑتے۔

ان پہاڑوں میں کوئی ایسی کھوہ بھی نہ تھی جہاں کرکٹ کی دھوپ میں سر چُھپایا جا
سکتا۔ کوئی ٹنڈ ٹنڈ درخت بھی نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً ہم نالے کے چوہچے میں جا کھڑے ہوتے۔
جب بھی دھوپ ناقابل برداشت ہو جاتی تو چوہچے میں ڈبکی لگا لیتے۔

اگر ٹرک ڈرائیو بھی ہماری طرح نالے میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیتے تو پھر مشکل
ہو جاتی۔ نالے کے چوہچے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ دس بیس افراد نہا سکتے تھے۔
دلوں ایک سو پچاس آدمیوں کی گنجائش نہ تھی۔

ٹرک ڈرائیو باری باری نالے پر آتے، ڈبکی لگاتے اور پھر اپنے اپنے ٹرک
تکے لیٹ کر سو جاتے۔ اس لیے نالے میں مستقل طور پر رہنے والے صرف ہم سات تھے۔

ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد سڑک سے اعلان سنائی دیتا "بلا سٹنگ، بلا سٹنگ"
ایک جبین دھوپ میں دوڑا دوڑا آتا "بلا سٹنگ، بلا سٹنگ"۔ اس پر نالے پر کھڑا سنتری شور
مچا دیتا "خلاص، خلاص" اور ہمیں مجبوراً نالے سے نکل کر سڑک پر جیب کی اوٹ میں کُور
لینا پڑتا۔ دلوں دھوپ میں کھڑے کھڑے ہمارا مُرتا بن جاتا۔

بلا سٹنگ ختم ہوتی تو ہم دھڑے دھڑے نالے پر پہنچتے اور پانی میں ڈبکیاں

لگاتے۔ بین بچیس منٹ کے بعد پھر سے اعلان ہوتا: بلا شنگ، بلا شنگ۔ سنتری خلاص
خلاص، چلا تا۔ اور وہیں پھر سے چلپاتی دھوپ میں کود لینا پڑتا۔

”یار، یہ اچھی پریڈ ہو رہی ہے، اپنی“ وٹ چلاتا۔
”اپنا تو وہی حال ہو رہا ہے جو ٹینس کورٹ میں بال کا ہوتا ہے“ شاعر ہنسا۔
”یار، کچھ کرنا چاہیے“ لیڈ نے کہا۔

اس سنتری کو رام کو روک کر کم از کم دوڑ بھاگ سے تو نجات ملے گی، انجینئر نے مشورہ دیا۔
سنتری کو بھی ہم سے بہت ہمدردی تھی، لیکن وہ بے چارہ مجبور تھا۔ کیونکہ چینی ہر وقت
اس کے سر پر سوار رہتے تھے۔ پھر ایک ٹرک ڈرائیور آکر کہنے لگا ”نہ، بالو۔ کیوں خواہ مخواہ گرمی سردی
کے حکم میں پڑا ہے۔ تاؤ کھا جائے گا تو تین مہینے چار پانی پر پڑ جائے گا۔“
”وہ کیا ہوتا ہے تاؤ؟“ وٹ نے پوچھا۔

”دیکھو، بالو۔ تم ادھر ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگاتا ہے، پھر ادھر سڑک پر دھوپ میں
ہو کر کوہ لیتا ہے۔ پھر ادھر آتا ہے۔ پھر ادھر جاتا ہے۔ اس سردی گرمی سے تاؤ لگ جائے
گا“ ٹرک ڈرائیور بولا۔

”تو پھر کریں کیا؟“ شاعر نے پوچھا۔
”ادھر لاپچی نالے میں جا کر چھپ جاؤ“ ڈرائیور نے ہیں آنکھ ماری۔

لاپچی بھاڑیاں

”ادھر کوئی اور نالا بھی ہے کیا؟“ لیڈ نے پوچھا۔
”ہاں۔ آگے سڑک پر۔ ایک فرلانگ دور“ ٹرک ڈرائیور نے زیر لب کہا۔
جب ہم لاپچی نالے پہنچے تو بے حد مایوس ہوئے۔ وہ نالائیں تھا بلکہ نالی تھی۔
”نہ چو کچھ، نہ دھارا۔“

”ارے!“ دفعۃً ڈرائیور چلتا یا ”وہ دیکھو، وہ“
ہم نے اُدپر دیکھا تو حیران رہ گئے!

نالے کے اُدپر، ایک بڑے سے میدان میں، گہرے سبز رنگ کی چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ بالکل اس طرح جس طرح بڑے ہوٹلوں کے لان میں شام کے وقت رنگ دار چھتریاں لگادی جاتی ہیں۔

اُدپر گئے تو دیکھا کہ وہ جھاڑیاں تھیں۔ سارے میدان میں تقریباً سین پچیس سبز جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ پتے بے حد سرسبز تھے۔ شاخیں خشک اور لیوں مڑی مڑی تڑی ہوئی تھیں جیسے پرانی رستیاں ہوں۔ نیچے رستیاں ہی رستیاں تھیں، اُدپر جھاڑو دار پتے۔ چار چار پانچ پانچ جھاڑیوں کا جھنڈ چھتری کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک چھتری کے نیچے پھر ٹرک ڈرائیور بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دوسری چھتری تلے چار آدمی سوئے ہوئے تھے۔ تیسری خالی تھی۔ ہم اندراکڑوں داخل ہوئے۔ وہاں صرف بیٹنے یا بیٹھنے کی جگہ تھی۔ عجیب سی خنکی تھی وہاں۔

”واہ، ابھی واہ! کیا جگہ ہے!“ لیڈر بولا۔

”ہم تو جھوٹے ہی رہے۔ اس سائے کا تو جواب ہی نہیں۔“

”یار، یہ کیا لالچیوں کی جھاڑیاں ہیں؟“ دٹ نے پوچھا۔

”خوشبو تو لالچیوں کی ہی آ رہی ہے“ شاعر بولا۔

”بھئی، لالچی نالا جو نام ہے تو ضرور یہ لالچیوں کے پیڑ ہی ہوں گے“ لیڈر بولا۔

”لیکن کوئی لالچی نظر نہیں آتی“ انجینئر نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لالچیوں کے پیڑ ہوں اور لالچی نہ لگی ہو؟“ ڈرائیور بولا۔

”کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا تم نے مری کے راستے پر زیتون کے پیڑ نہیں دیکھے؟“

داستان گو بولا ”اتنے سرسبز پیڑ ہیں کہ سبحان اللہ! لیکن گزشتہ نو سال سے پھل نہیں لگا۔“

”آب دہوا موافق نہیں آئی ہوگی“ ڈرائیور بولا۔

”میں نے ایکسپریس سے بات کی ہے“ داستان گو نے کہا ”وہ کہتے ہیں پھل اس لیے نہیں لگ رہا کہ پودوں کو آب دہوا ضرورت سے زیادہ موافق آگئی ہے۔ اس لیے پودے پل رہے ہیں پھل نہیں دے رہے“

”یہ کیسی دلیل ہے؟ لیڈر نے غصے میں کہا۔

”وہ کہتے ہیں، پھل دار درخت کی بات الٹی ہے۔ اگر پودا مٹا دیا جائے تو پھل آتا ہے۔ اگر پودا پل کر بڑا ہو جائے تو پھل نہیں آتا“ داستان گو نے کہا۔

”ارے ادبے دو قوفو! نالائقو!“ میں غصے میں جھینے لگا ”دو دن مسلسل گرمی کھانے کے

بعد میں یہ الاچی نالے کا ٹھنڈا ٹھنڈا سا یہ دستیاب ہوا ہے۔ ان سبز پھرتیوں کی لذت کے

بجائے، اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے، تم یہ جھگڑا لے بیٹھے ہو کہ ان جھاڑیوں پر الاچیاں

کیوں نہیں لگتیں۔ یا، تم واقعی سچے اور کھرے دانش ور ہو۔“

”ہاں، یا۔ ٹھیک کہتا ہے، یہ“ وٹ بولا۔

”چلو، اب دومنٹ کی خاموشی سادھ کر شکر ادا کر دو“ شاعر نے ہنس کر کہا۔

”ابھی آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ بلاشٹن بلاشٹن کی آواز آئی۔

”اے احمقو! وٹ چلایا، ہمیں شکر یہ تو ادا کر لینے دو۔ پھر بلاشٹنگ کرنا۔“

”خلاص، خلاص“ سنتری چلایا۔

”جا، جا،“ تاش کھیلنے والے ٹرک ڈرائیوروں نے سنتری کو ڈانٹا ”بڑا آیا ہے

بلاشٹنگ کا چچا۔“ سنتری ان کے تیورہ دیکھ کر پچھے ہٹ گیا۔

”ویٹ، اندری سپر ہٹ“ شاعر نے تالی بجائی۔

”ہم بھی یہاں سے نہیں ہٹیں گے“ لیڈر بولا۔

اتنے میں دو چینی آگئے ”چائیں چائیں چو چن چو“ وہ چلائے۔

”بالکل درست کہتے ہو“ انجینئر بولا ”ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔“
 چینی ہماری پھتری کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ ادھر ٹرک ڈرائیور چلائے کہ
 سنتری انہیں سمجھاؤ۔ جب قضا آئے گی تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ اگر پتھر لگنا ہے تو لگنا ہے۔
 ”ہاں“ دوسرا بولا ”وہ عجیب خان ٹرک تلے لیٹا ہوا تھا۔ پتھر ٹرک کی چادر توڑ کر
 اس کے سر پر جا گرا۔ بے چارہ مر گیا۔ خو، یہ تو نصیب کی بات ہے۔“
 ”اوہنوں۔ چینی یہ بات نہیں سمجھتا“ سنتری بولا ”یہ چینی لوگ نصیب کو نہیں مانتا۔
 تم ادھر سے خلاص کرو، بائی۔ جلدی۔“

لیکن ہم ڈھیٹوں کی طرح پھتری تلے پڑے رہے۔
 ہر چند سنٹوں کے بعد چینی چلا کر چیں چیں کرتے اور پھر خاموشی سے ہمیں گھومنے لگتے۔
 ”ارے، یار“ شاعر بولا ”یہ تو لنگاہوں کی چاند ماری کرتے ہیں۔“
 ”ان کی خاموشی تو خود پتھر کی طرح بوجھل ہے“ لمیڈر ہنسا۔

ہم چینیوں کی اس چاند ماری کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے، اور جھوڑا اٹھ کر
 ٹیلے سے نیچے اترنے لگے۔ ٹرک ڈرائیور بھی گالیاں دیتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔
 جب بلا سنٹنگ ختم ہوئی تو انجینئر بولا ”یارو، وہیں چلتے ہیں، الاچی نالے کی
 پھتریوں تلے۔“

”ہٹاؤ، یار“ ڈرائیور نے کہا ”جب تک ہم وہاں پہنچیں گے تو پھر بلا سنٹنگ
 بلا سنٹنگ ہو جائے گا۔“

”ہاں یار۔ اتنی دُور جانے کا فائدہ؟ دٹ چلایا۔“

منقارہ زیر پر

تین دن ہم الاچی نالے پر پرید میں لگے رہے۔ کبھی نالے کی طرف بھاگتے، کبھی

کوہ لینے جیپ کی طرف دوڑتے۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ ہمارے دماغ دھواں دے رہے تھے جسم تپ رہے تھے۔ مزاج چڑچڑ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وٹ مزاج کی بات کرتا تو لیڈر غصے سے لال پیلا ہو جاتا "خبردار! جو وٹ کی بات کی تو۔ میں تمہیں اٹھا کر نیچے کھڑ میں پھینک دوں گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے" شاعر کہتا "اس الحق کو اتنا بھی پتا نہیں کہ سنہسی مذاق کی بات پُر سکون فراغت میں چلتی ہے، ان حالات میں نہیں۔"

اُدھر داستان گونجتے میں کھول رہا تھا "یار، یہ بتاؤ کہ ہم میں سے وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ شاہراہ ریشم خمی سڑک ہے؟"

انجینئر کہ رہا تھا "کیوں نہ ہم ہمیں سے واپس ہو جائیں؟"

ڈرائیور چلتا "نی اعمال تو آندھی کی بات کرد، بھائی۔ تین بج گئے ہیں۔ اب بگولا چلے گا۔"

بگولے کا نام سن کر ہمارے دل بیٹھ جاتے۔ جب بگولا چلتا تھا تو ہمارا دم گھٹنے لگتا۔ جسم پر گرم ہوا کوڑے برساتی۔ جی چاہتا کہ موٹے گرم کپڑے لپیٹ کر خود کو ان کوڑوں سے محفوظ کر لیں۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی ہم بہت دُکھی تھے۔ چائے پینے کو جی چاہتا۔ بڑی شدت سے جی چاہتا۔ لیکن پہلا گھونٹ بھرتے تو جی متلانے لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کانٹے نیگل گئے ہوں۔ رہا کھانا تو پہلے دن تو کدو ہم نے بڑے شوق سے کھایا تھا۔

"یار، اتنا اچھا! اتنا نرم کدو!"

"بھئی، مٹی کا کدو نہیں، خالص کھاد کا کدو ہے۔"

لیکن دوسرے دن وٹ چیمنے لگا۔ بولا "اب لا! کتنا نرم ہے۔ بالکل حلوسے کی طرح۔ اور کتنا اچھا ہے۔" پھر وہ رونی آدانہ میں چلایا "یہ کدو۔"

اس کے بعد وہ کدو جو خالص کھاد میں اُگا تھا عام کدو بن کر رہ گیا۔

تیسرے دن ہماری کیفیت یہ ہو گئی کہ بات بات پر ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ایک دوسرے کی بات ہمیں بُری لگنے لگی۔ شاعر کے قلم میں تلخی اُبھر آئی۔ داستان گو کی داستانیں تھم پڑتی گئیں۔ ڈرائیور کی ایڈولوشن ریوولوشن میں بدل گئی۔ ادھر حوالدار ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ ردی پکانے والے لانگری کی نگاہوں میں غیظ و غضب اُبھر آیا۔ اگر ہم ایک دن اور وہاں رُکے رہتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے تیسرے دن شام کے وقت دفعۃً اعلان ہوا کہ سڑک کھل گئی ہے۔ پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آیا۔ دٹ بولا ”یار، ان سے کہو کہ ہم سے مذاق نہ کریں۔“

”ہاں، ہم پہلے ہی جلے جھٹھے بیٹھے ہیں“ لیڈر بولا۔
 پھر حوالدار آگیا۔ بولا، ”صاحب راستہ کھل گیا ہے۔“
 ”اوتھوں۔ اس کا بھی اعتبار نہیں رہا“ داستان گو بولا۔
 ”ہاں یار۔ یہ تو ہمیں کدو چور سمجھتا ہے نا“ شاعر نے کہا۔
 ”ٹھیک تو ہے۔ روز اس کے دو کدو ضائع ہو رہے ہیں“ انجینئر بولا۔
 اور آٹے کی بات کرو، داستان گو نے کہا۔
 پھر دفعۃً ایک شور اُٹھا۔
 ڈیڑھ سو ٹرک سٹارٹ ہو کر گھاؤں گھاؤں کرنے لگے۔
 ”ارے!“ ہم سب اُٹھ کر جیپ کی طرف بھاگے۔ عین اسی وقت بعد دوپہر کا بگولا چلنے لگا۔

جب ہم الا کچی نالے سے روانہ ہوئے تو ساری فضا بگولے کی وجہ سے دھواں دھار تھی۔ ریت اُڑ رہی تھی۔ ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ دادی پر خونناک قسم کی وحشت طاری تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے جھٹنے بیدار ہو گئے ہوں۔ وہ ہم کو

اپنے دلیں سے نکالنے کے لیے ہمارے پیچھے دوڑ رہے ہوں ، اور ہم پر ریت اور پتھر برس رہے ہوں۔

اس وقت منظرِ تناخوتِ ناک تھا کہ ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہم کوئی قبیح جرم کر کے بھاگ رہے ہیں ، اور شیطانی طاقتیں ہمیں بھاگنے سے روک رہی ہیں۔

سڑک پر چینی مزدور بلا تھلا رہے تھے۔ ساتھ ہی حوالدار حسرت ناک نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ موڑ بچہ پر تھا۔ رستی جلی ہوئی تھی ، پر بیل بڑھتا جا رہا تھا۔

چلاس

اسیب زدہ گھائی

الاچی نالہ سے انخلا کی وہ شام میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ چٹیل پہاڑوں سے گھری ہوئی وہ تنگ تاریک گھائی۔ وہ تند و تیز جھکڑ جو ریت پچکاری سے گویا ہولی کھیل رہا تھا، اور جس نے فضا کو تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ پھر وہ شام کا دھندلا کاجس میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ پہاڑ کدھر ہے اور کھائی کس طرف۔ اُدپر سے سیلیاں بجاتے ہوئے بھٹتے جو اس اسیب زدہ گھائی میں ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اور وہ ڈیر پھل سوڈک جو ہمارے عقب میں گھاؤں گھاؤں کر کے چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوہستان نہ ہو بلکہ الف لیلا کا کوہِ ندا ہو۔ کوئی پُر اسرار آواز ہمیں پکار رہی تھی اور ہم عالم دیوانگی میں، کسی سحر کے زیرِ اثر، موت کی وادی کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔

میں نے دہشت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جیب پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

صدیاں بیت گئیں۔

آخر کوٹ کی آواز نے وہ دہشت ناک طلسم توڑا "ارے! وہ چلایا" یہ سڑک کو کیا ہوا؟

”کیا ہوا؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”بھئی، کوئی گڑبڑ ہے“ وٹ بولا

”کیسی گڑبڑ؟“ شاعر نے پوچھا۔

”بھئی، یہ سڑک تو چلنے لگی ہے۔ باقاعدہ چل رہی ہے۔ وہ دیکھو، سپیڈ میٹر“

اس نے ٹارچ کی روشنی میٹر کی طرف موڑ دی ”ہم تو تیس میل کی سپیڈ پر جا رہے ہیں“

”ہاں، یار۔ سڑک تو پھر سے لیشی ہو گئی“ میں نے کہا۔

”خبردار! داستان گو غزّیا“ خبردار جو کسی نے اس سڑک کو لیشی کیا۔ مجھ سے بڑا کوئی

نہ ہو گا۔“

”بالکل ٹھیک ہے“ شاعر بولا ”اس سڑک کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”سالی کبھی تحمل بچھا دیتی ہے، کبھی کانٹے“ وٹ ہنسا۔

”ہتسوں نہیں“ لیڈر غزّیا۔

”کیوں؟ ہتسوں کیوں نہیں؟“ انجینئر بولا۔

”کینو!“ لیڈر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہمیں ڈانٹا ”جو جو کچھ تم پریتی ہے، اگر تم میں

ذرا بھی غیرت ہوتی تو یوں کھی کھی نہ کرتے۔“

”ہاں، بھئی۔ ٹھیک کہتا ہے یہ“ شاعر بولا ”کم از کم چار ایک دن کے لیے تو ہتس

کا فور ر ہنی چاہیے۔“

”دقت یہ ہے“ داستان گو نے کہا ”کہ تم سب بے غیرت ہو۔ کیوں ڈرائیور؟ یہ

بے غیرت ہیں نا؟ غیرت مند صرف ڈرائیور ہے اور میں ہوں۔“

”یہ کیا کہ رہا ہے، ڈرائیور؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”خاموش!“ ڈرائیور نے وہیل سے منھ موڑے بغیر کہا ”مجھے نہ بلاؤ۔ میں پھانسی پر

لٹکا ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ مشکل ڈرائیورنگ نہ میں نے کبھی کی ہے، نہ پھر کبھی موقع ملے گا۔

اگر یہاں سے بچ نکلے تو۔

”ہاں، یار۔ اسے نہ بلاؤ، لیڈر بولا۔

”اور مجھے بھی نہ بلاؤ،“ داستان گو نے کہا۔

”کیوں؟ تو بھی پھانسی پر لٹکا ہوا ہے کیا؟“ انجینئر نے پوچھا۔

”میں پھانسی پر نہیں لٹکا ہوا،“ داستان گو نے جواب دیا، ”لیکن اگر کسی نے مجھے بلایا

تو میں اُسے پھانسی پر لٹکا دوں گا۔ ڈرو، میرے موڈ سے ڈرو۔“

”ہاں، بھئی۔ اس کے موڈ سے ڈرو،“ دٹ ہنسنا ”اُسے کہتے ہیں غیرت مند موڈ۔“

”ہوٹل آگیا، ہوٹل۔ سازین کا ہوٹل۔ رُک جاؤ۔ رُک جاؤ،“ لیڈر چلایا۔

ڈرائیور نے اس کی بات اُن سنی کر دی۔ اُنٹا گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی۔

”یہ ہوٹل تھا کیا؟“ دٹ بولا۔

”ہوٹل نہیں تو اور کیا تھا؟“ لیڈر چلایا، ”بھئی، سازین کا ہوٹل تھا۔“

”یہ تو بالکل دم چُخت تھا، جیسے مال خانہ ہو،“ داستان گو بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مال خانے میں نہ درہوتا ہے نہ دریچہ،“ داستان گو نے وضاحت کی۔

”ہاں، یار۔ اس ہوٹل کے باہر برآمدہ بھی تو نہ تھا،“ شاعر نے کہا۔

”تو پھر یہ ہوٹل کیسے ہو سکتا ہے؟“ انجینئر بولا۔

”یار، تم سارے ہی احمق ہو،“ داستان گو ہنسنا ”جس علاقے میں دن میں دو بار بھکڑ

چلتا ہو، منوں ریت اُڑتی ہو، وہاں ہوٹل دم چُخت نہ ہو گا تو کیا بارہ دری قسم کا ہو گا؟“

”ہاں، یار۔ بات تو ٹھیک ہے،“ لیڈر نے کہا۔

مُغلیہ دسترخوان

”چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ ایسے مقبرہ نما ہوٹل کے اندر جانے سے تو بھوکا رہنا کہیں

بہتر ہے ”ڈرائیور بولا۔

یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

”ہاں، بھئی“ دھڑنے زیر لب کہا ”اس ٹرپ کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ہمیں بھوکے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔“

”ابے“ لیڈر بولا ”ایک بار چلاس پہنچ لو۔ ایسا کھانا کھلاؤں گا کہ تمہیں مغلیہ دور کا دسترخوان یاد آجائے گا۔“

”ہاں، ہاں۔ دیکھو، فی الحال خواب دیکھو۔ مغلیہ دور کے دسترخوان کے خواب دیکھو۔ وقت کئی کا یہ لا جواب نسخہ ہے“ ڈرائیور بولا۔

”کیوں بے، لیڈر؟“ انجینئر بولا ”تو خواب دکھا رہا ہے ہیں کیا؟“

”کیوں نہ دکھائے، خواب“ شاعر نے کہا ”ہر لیڈر کا فرضِ اولین ہے کہ قوم کو خواب دکھائے۔“

”وہاں پہنچو گے، چلاس میں، پھر دیکھنا۔ خواب دکھا رہا ہوں یا حقیقت“ لیڈر بولا۔

”وہاں ہے کون جو مغلیہ دور کا کھانا کھلائے گا؟“ داستان گونے لپٹھا۔

”میرا ایک دوست ہے“ لیڈر نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔

”تیرا دوست مغلوں کا بادشاہی رہا ہے کیا؟“ داستان گونے لپٹھا۔

”میرا دوست ہیڈ ماسٹر ہے“ لیڈر بولا ”بائی سکول کا ہیڈ ماسٹر۔“

شاعر قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا ”ماسٹر کے پاس بے شک حکومت ہوتی ہے، لیکن کھانے

کو روٹی نہیں ہوتی۔“

”تجھے کیا پتا، ان علاقوں میں ماسٹر کس قدر اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں“ لیڈر نے کہا۔

”اثر و رسوخ والے لوگ تو دھمکتے کھاتے ہیں، کھلاتے نہیں“ داستان گونے جواب دیا۔

”بالکل، بالکل۔ کھلاتے تو وہ ہیں جو اثر و رسوخ والے نہ ہوں“ انجینئر ہنسا۔

”میں کہتا ہوں ہم چلاس جائیں ہی کیوں؟ ڈرائیور بولا۔
 ”کیا مطلب؟ خالم، تو نے تو سارا مغلیہ دسترخوان الٹ کر رکھ دیا“ وٹ چلایا۔
 ”یاد پھوڑو“ ڈرائیور نے کہا ”ہم رات کے دو بجے کے قریب چلاس پہنچیں گے۔
 اس وقت خوا مخواہ خراب ہوں گے۔ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔ صبح سویرے گلگت
 پہنچ جائیں گے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا“ لیڈر غصے میں چیخا۔
 ”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ ڈرائیور بولا ”چلاس جانے کے لیے ہمیں شاہراہ سے اتر کر
 چارپانچ میل کا چکر کاٹنا پڑے گا۔“

”یہ اس لیے نہیں ہو سکتا“ انجینئر نے کہا ”کہ لیڈر کی عزت پر حرف آتا ہے۔“
 ”مغلیہ دسترخوان کو چھوڑ کر جانا کفرانِ نعمت ہے“ شاعر ہنسا۔
 ”دیکھ لیڈر!“ ڈرائیور نے کہا ”میں تیرے بھلے کی کہتا ہوں۔ کیوں خود کو امتحان
 میں ڈالتا ہے تو؟“

”کیا مطلب؟“ لیڈر غرّایا۔
 ”ہاں، بھئی“ وٹ بولا ”اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔“

بل اور بوٹیاں
 ”دو کو! دو کو!“ لیڈر چلایا۔
 ”وہ کس لیے؟ میں نے پوچھا۔
 ”وہ دیکھو۔ برآمدے والا ہوٹل آگیا“ لیڈر بولا ”وہ دم پخت قسم کے ہوٹل
 ختم ہو گئے۔“

”عجب آدمی ہو!“ شاعر بولا ”ایک طرف چلاس میں مغلیہ دسترخوان کے خواب دکھا

”ہے ہو، دوسری طرف برآمدے والے ہوٹل پر رکنے کو کہہ رہے ہو۔“
 ”ہاں بھی یہاں رُک کر کمرہ گے کیا؟“ انجینئر نے پوچھا۔
 ”رُک دو، روکو!“ لیڈر چلتا یا ”ورنہ میں پھلانگ لگا دوں گا۔“
 ”ارے، ارے! وہ پھلانگ لگانے لگا ہے۔“ سب چیخنے لگے۔
 گاڑی رُک گئی۔ سب اُتر آئے۔

”بول، اب کیا کرے گا؟“ شاعر نے لیڈر سے پوچھا۔
 ”بھئی، بیٹھیں گے، پانی پیئیں گے، چائے کا دُور چلے گا، اس بُھتنوں کی گھاٹی سے
 نکلنے کی خوشی میں“ لیڈر نے جواب دیا۔
 وہ ایک صاف سُسترا اور کھلا ہوٹل تھا۔ سامنے چار ایک ٹرک کھڑے تھے۔ برآمدے
 میں چھ سات آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ برآمدہ ایک منزل اُونچا تھا۔ قریب ہی
 ایک نالا برآمدہ تھا۔

ہوٹل میں ہم سب چار پائیلوں پر لیٹ گئے۔
 ”پانی لاؤ، بھئی، پانی۔“
 ”لڑکے، جلدی سے چائے بنا دے۔“
 ”کیوں بھئی، کھانے کو کیا ملے گا؟“
 ہر کوئی آرڈر دینے لگا۔

”غلط، بالکل غلط“ لیڈر غصا کر صرف لیڈر آرڈر دے گا۔ بولو، کیا کھاؤ گے؟
 ”کدو“ وٹ چلایا۔ سب تمقہ مار کر منس دیے۔

”یار، ہنستے کیوں ہو؟ تین روز، صبح شام، کدو کھا کر مجھے کدو کھانے کی عادت پڑ
 گئی ہے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ وٹ نے خود پر مظلومیت طاری کر کے کہا۔
 ”صاحب“ ہوٹل والا داخل ہو کر بولا ”مرعی کٹوا دوں؟“

”ہاں، ہاں۔ کٹاؤد“ داستان گو نے کہا ”اب بنے گی۔ رات بارہ بجے چھٹے پر رکھو گئے۔ انشاء اللہ صبح سویرے گل جانے گی۔ کھا کر ہم کل دہر کو یہاں سے چل پڑیں گے۔ کیوں، لیڈر؟“

”بھئی، مرغی ہے، پائے تو نہیں“ شاعر بولا۔

”بھئی، سات ہزار کی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تو ٹماٹر بھی دو گھنٹے میں گلتا ہے“ داستان گو نے کہا۔

”مرغی دکھاؤ، مرغی دکھاؤ“ لیڈر چلا یا۔

جب ہوٹل والا مرغی لے کر آیا تو سب اُٹھ کر بیٹھ گئے ”ارے! یہ مرغی ہے کیا؟“ گلتا تو شکرا ہے“ شاعر نے کہا۔

”اتنی بڑی مرغی!“ انجینئر بولا۔

”یہ تو بکرے کی ماسی نظر آتی ہے“ وٹ ہنسا۔

”دیکھو، خان“ داستان گو نے کہا ”اس مرغی کو ہنڈیا میں ڈالو۔ اس کا شور باناؤ۔“

پھر شور یا مجھے ڈونگے میں ڈال دو اور بوٹیاں ان سب صاحبوں میں بانٹ دو۔“

”مطلب کیا ہے، تمھارا؟“ سب بچے بھاڑ کر داستان گو کے پیچھے پڑ گئے۔

”مطلب یہ ہے کہ میں تو دیوبھی ٹیرین ہوں۔ شور بے پر گزارہ کر لوں گا۔ تم سب

گوشت خور ہو۔ تم گوشت کھا لینا۔“

”بالکل غلط“ لیڈر چلا یا ”دیکھو، خان۔ مرغی کا ٹو، مسالا لگاؤ اور بھون دو۔ سمجھے؟“

”بالکل ٹھیک“ داستان گو نے کہا ”پھر بل ہم سے وصول کرو اور بوٹیاں پیچھے

آنے والے ٹرکوں کے ڈرائیور کھائیں گے۔“

داستان گو نے سچ کہا تھا۔ جب بھئی ہوئی مرغی سامنے آئی تو سب کے دانت

کھٹے ہو گئے۔ ہم نے بل ادا کیا، بوٹیاں پیچھے آنے والے ٹرک ڈرائیوروں کے چھوڑ دیں،

ادارہ سفر پر روانہ ہو گئے

مستقل مہمان

جب ہم چلاس پہنچے تو رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کھلاری تیلامیدان تھا جس کے ایک طرف چار ایک ٹوٹی چھوٹی دکانوں کا بازار تھا۔
”ارے ایہ ہے چلاس! ڈٹ چلایا اس سے تو وہ ہوٹل ہی زیادہ آباد تھا۔“
میدان میں چار پائی پر سوئے ہوئے ایک شخص کو ہم نے جگایا۔ وہ انھیں ملتا ہوا اٹھا۔

”کیوں میاں، ہیڈ ماسٹر صاحب کہاں رہتے ہیں؟ لیڈر نے پوچھا۔
”اُس نے انگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پھر لیٹ کر سو گیا۔
ہم مشرق کی طرف چل پڑے۔ بہت دیر میدان میں گھومتے رہے۔ کوئی سڑک نظر نہ آئی تو پھر وہیں آ کر اس شخص کو جگایا۔ ”میاں، ریسٹ ہاؤس کدھر ہے؟“ اس نے اٹھ کر پھر مشرق کی طرف اشارہ کیا، اور پڑ کر سو گیا۔

ہم پھر مشرق کی طرف چل پڑے۔ اتفاقاً ایک سڑک نظر آئی۔ نیم پختہ اور تنگ۔ دیر تک ہم اس سڑک پر مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر ریسٹ ہاؤس مل گیا۔ اندر داخل ہوئے تو وہاں کوئی چوکیدار نہ تھا۔ چلا چلا کر بار گئے۔ آخر کار ایک شخص باہر نکلا۔ بولا ”یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔ شور نہ مچاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

”یہ کون تھا؟“

”اہلکار تو نہیں لگتا تھا۔“

”سلیپنگ سوٹ تو کسی رئیس کا تھا۔“

”انداز غنڈے کا تھا۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک آدمی آگیا۔ کہنے لگا ”رہسٹ ہاؤس لگا ہوا ہے ا جی۔“

”کون ٹھہرا ہوا ہے، ادھر؟“

”ادھر افسر لوگ رہتا ہے“ اجنبی نے کہا۔

”کتنے دن ٹھہرے گا؟“

”ٹھہرا ہوا نہیں۔ وہ ادھر ہی رہتا ہے“ اجنبی بولا۔

ہیڈ ماسٹر

رہسٹ ہاؤس سے نکل کر جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو ڈرائیور بولا ”دیکھ لو، تین بچ گئے ہیں۔ کیوں ہیڈ ماسٹر کو ڈھونڈنے میں وقت ضائع کر رہے ہو؟ چلو سیدھے گلگت چلتے ہیں۔“ لیڈر تڑپ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا ”تم یہاں بیٹھو۔ میں ہیڈ ماسٹر کو تلاش کرتا ہوں۔“ پاگل ہو گئے ہو کیا؟

”ہاں، پاگل ہو گیا ہوں“ لیڈر یوں چلا یا جیسے آسیب زدہ ہو۔

”یار، اسے کیا ہو گیا ہے؟“

”بھئی عزت کا معاملہ ہے۔ پریسٹج کا سوال ہے“ دٹ زیر لب بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ رات کے تین بجے اس تنگ دتاریک سڑک پر کیسے ہیڈ ماسٹر کا گھر ڈھونڈے گا؟“ ڈرائیور نے کہا۔

”اس کی کوئی بات بھی سمجھ میں آسکی ہے آج تک؟“ میں نے کہا ”چودہ سال محبوبہ کے رُوبرو بیٹھا رہا۔ سامنے بیٹھ کر روتا رہا۔ لیکن اسے اپنا دکھ نہیں بتایا۔“

”کمال اس کا نہیں، محبوبہ کا تھا“ انجینئر بولا ”سالی کو سب پتا تھا۔ لیکن اس نے نہیں بتایا کہ مجھے پتا ہے۔ چودہ سال پوچھتی رہی کہ بات کیا ہے۔“

”ایمان سے، کیا عظیم داستانِ عشق ہے“ داستانِ گد بولا ”چودہ سال تھلیے میں ایک دوسرے کے آسنے سامنے بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے کہ تجھے کیا دکھ ہے۔“

”واہ وا! واہ وا!“ ڈرائیور بولا ”بڑا بڑا کردار پڑا ہے، اللہ کی دُنیا میں۔“
 ”سبحان اللہ! عشق بھی کیا رُوپ دھارتا ہے“ داستان گونے کہا۔
 ”بل گیا! بل گیا!“ دُور سے لیڈر کی آواز آئی۔
 ”کیا بل گیا، بھئی اسے؟“

”ہیڈ ماسٹر کا گھر مل گیا۔“
 ”اونوں۔ گھر نہیں گھر کا پتا مل گیا ہوگا۔“
 ”آجاؤ، آجاؤ“ لیڈر کی آواز سُنانی دی۔

سامنے دیکھا تو سڑک کے درمیان کوئی لائٹن جھلا رہا تھا، جیسے ریلوے گارڈ بستی جھلاتے ہیں۔

”لو بھئی، گھر کا پتا نہیں بلکہ گھر ملا ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”اس لیے کہ لائٹن جھلائی جا رہی ہے۔“

جب ہم لائٹن کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ لیڈر کے ساتھ ایک شخص ہاتھ میں لائٹن لیے کھڑا ہے۔ ہم گاڑی سے نیچے اُترے تو وہ سب سے باری باری ہاتھ ملانے لگا۔ ہاتھ ملانے کے بعد وہ آگے آگے چل پڑا۔ ہم سڑک سے اُتر کر نچان پر چل پڑے۔ آگے گئے تو چھ نوجوان قطار میں کھڑے تھے۔ انھوں نے با آواز بلند السلام علیکم کہا اور پھر باری باری ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔

”لو، باقی رات تو ہاتھ ملانے میں گزر جائے گی“ دُپ زیر لب بولا۔

”یار! یہ مسکمانی ہم کو بڑی مہنگی پڑ رہی ہے“ انجینئر ہنسنا۔
 ”لاں بھائی، کوئی چائے پانی پوچھو۔ کوئی پھل فروٹ سامنے رکھو۔ کیسی میزبانی
 ہے کہ لاکھ ملائے جا رہے ہیں؟“ شاعر نے کہا۔

”آج کی رات تو بھی لاکھ ملانے پر ہی گزارہ کرو۔ کل دیکھا جائے گا“ وٹ بولا۔
 ”بھئی، مجھے تو صرف ایک عدد چار پائی چاہیے“ داستان گونے کہا۔

”جو چار پائی نظر آئی تو میں تو یاد ڈھیر ہو جاؤں گا، وہیں“ ڈرائیور نے کہا۔
 لاکھ ملا کو فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہم ایک مرغزار میں کھڑے ہیں۔ نیچے
 محلی گھاس کا فرش بچھا ہے۔ چاروں طرف اُونچے اونچے چنار کے درخت قطار در قطار
 کھڑے ہیں، اور قریب ہی بہتے نالے نے بھیر دیں کا الاپ پھیڑ رکھا ہے۔

الف سیلوی منظر

”ارے! میرے چٹکی بھرنا“ وٹ بولا ”میں سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں؟“
 ”یہ وہی چلاس ہے کیا، جہاں ہم آکے رُکے تھے؟“ شاعر نے پوچھا۔
 ”نہیں، نہیں۔ یہ وہ چلاس نہیں۔ وہ تو ایک ویرانہ تھا۔ اور یہ تو الف سیلوی منظر
 ہے“ میں نے جواب دیا۔

”ضرور ہم مرجچکے ہیں“ وٹ زیر لب بولا ”اور مر کر اپنے نیک اعمال کی وجہ سے
 بہشت میں داخل ہو گئے ہیں۔“

”تشریف لائیے، تشریف لائیے“ ایک فوجوان آگے بڑھا۔
 ”یار! یہ بہشت تو ٹھیک ہے، لیکن یہ عثمان سیکنڈ ہینڈ معلوم پڑتے ہیں“ وٹ نے کہا۔
 ”تشریف لائیے، تشریف لائیے“ ہیڈ ماسٹر صاحب لالٹین لے کر آگئے۔
 آگے بڑھے تو لان میں سات آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوان تھا

جس پر گاد تکیے رکھے ہوئے تھے۔

”بیٹھو، یار! بیٹھو“ دٹ زیر لب بولا ”اب سٹیج سٹ ہو گیا ہے۔ اب حویں آئیں گی۔“
ہیڈ ماسٹر ایک دُبلّا پتلا عجز اور اخلاق سے بھرا ہوا آدمی تھا۔ اس کی گفتار میں عجیب شیرینی تھی۔ حرکات میں ٹھہراؤ تھا۔ انداز میں لگن اور محبت تھی۔

جب وہ کچھ دیر کے لیے اندر گیا تو میں نے کہا ”میں نہیں ماننا کہ یہ شخص ہیڈ ماسٹر ہے“
”مجھے بھی شک پڑ رہا ہے“ شاعر ہنسا۔

”کیوں؟“ لیڈر غصے سے بولا۔

”نہ اس کے ماتھے پر تیوری ہے، نہ آواز میں تحکم ہے، نہ انداز میں درشتی ہے۔ پھر ہیڈ ماسٹر کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔
”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو“ شاعر بولا۔

”جی، میں نے خود بارہ سال ماسٹری کی ہے“ میں نے وضاحت کی ”آج ماسٹری چھوڑے تیس سال ہو گئے ہیں لیکن ماتھے کی تیوری ابھی تک نہیں گئی۔ لہذا یہ شخص کوئی بہرہ دیا ہے، ہیڈ ماسٹر نہیں۔“

”بکو اس مت کرو“ لیڈر غصے سے چلایا۔

”دیکھ، میری جان۔ میں تیرے دوست کی بد تعریفی نہیں کر رہا۔ صرف یہ کہ رہا ہوں کہ وہ حاتم ہو سکتا ہے، صوفی ہو سکتا ہے، سوشل ورکر ہو سکتا ہے، سچا مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن ہیڈ ماسٹر نہیں ہو سکتا۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے وہی بچہ نوجوان تھے۔ انھوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے قاب اٹھائے ہوئے تھے اور میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاعر نے مجھے کہنی ماری۔ کہنے لگا ”میں تو سمجھا تھا کہ یہ سُفہ زبانی اخلاق کا پتلا ہے،“

لیکن یہ تو عامل نکلا۔“

”یار، یہ تو بالکل الف لیلوی منظر ہے!“ میں نے کہا۔

”شاہی باغیچہ ہے۔ رات کے تین بجے ہیں۔ دسترخوان چٹنا جا رہا ہے۔ غلمان خدمت کے لیے دست بستہ حاضر ہیں۔ مجھے تو شک پڑنے لگا ہے کہ ابھی یہ کیا سرار میزبان محکم دے گا کہ خدام، سہانوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔ ہر قسم کی نعمت ان کے لیے مہیا کرو۔ اور جب یہ سیر ہو جائیں تو ان کے سر قلم کر کے اسی قاب میں رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کر دو۔“

میز پر کھانے چُن دیے گئے تو میں نے کافی آنکھ سے دیکھا۔ ان میں چائے تھی۔ بسکٹ تھے۔ کیٹ تھے۔ کباب تھے۔ انڈے تھے۔ گوشت تھا۔ میٹھا تھا۔ پھل تھے۔ ایسا میز میں نے کبھی نہ دیکھا تھا جس پر بیک وقت چائے، بریک فاسٹ اور ڈزنگا ہو۔

”یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ شاعر نے میز کا جائزہ لے کر کہا۔

”ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا، ہمارے ساتھ“ داستان گویا بولا۔

”بھئی، ہمارے ساتھ تو اس کے برعکس ہیلتھ ویسا سلوک ہوتا رہا ہے جیسا بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں“ دٹ نے کہا۔

”دیکھا؟“ لیڈر فخر سے بولا ”میز بانی اسے کہتے ہیں۔“

”بالکل نہیں کہتے“ شاعر بولا ”میزبان تو وہ ہوتا ہے جو چچی میں سے سہان کو دیکھ کر پچھلے دعوازے سے باہر نکل جائے اور پھر ملازم آکر کہے کہ جناب، صاحب گھر پر نہیں ہیں۔“

”ہم خود یہی کرتے ہیں“ میں نے کہا۔

”سارے شریف آدمی یہی کرتے ہیں“ انجینئر بولا۔

”اگر میرے گھر کوئی سہان رات کے تین بجے آجائے تو ایمان سے میں تو اسے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دوں“ میں نے کہا۔

”بالکل۔ اور جو تو اسے قتل نہ کرے اور انٹرنیٹن کرنا شروع کر دے تو تیری بیوی

تجھے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دے“ شاعر کی بات پر سب ہنس دیے۔
 ”ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے انھیں ڈانٹ پلائی ”بالکل ٹھیک کہتا ہے یہ۔
 سب نیک بیبیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔“
 ”معلوم ہوتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے گھر کوئی نیک بی بی نہیں“ دٹ بولا۔

امپا سبل پلیس

اگلی صبح جب میں جاگا، آنکھیں کھولیں، اور اس مرغزار کو دیکھا تو از سر نو میرے
 شکوک جاگ اُٹھے کہ ضرور ہمارے سامنے الف لیلہ کا سوتے جاگتے کا قصہ دہرایا جا رہا ہے۔
 ”یار، کیا خوبصورت جگہ ہے!“ ڈرائیور بولا۔
 ”ویسے ہونی نہیں چاہیے“ میں نے کہا۔
 ”وہ کیوں؟“ لیڈر بولا۔

”اب تک اس سفر کا جو رنگ رہا ہے، یہ ایسی سوڈاس سے ہم آہنگ نہیں“
 میں نے جواب دیا۔

”ہمارا سارا ٹرپ بیٹرن تباہ کر دیا“ داستان گو بولا۔

ابھی ہم اس منظر کو اپنے ٹرپ بیٹرن میں فٹ کر رہے تھے کہ چھ نوجوان ہاتھوں
 میں قابیں اٹھائے پھر سے آمو جود ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مدرسے کا وہ لمبا میز پھر سے
 کھانوں سے لگ گیا۔

دٹ زیر لب آہ بھر کر بولا ”لاٹے! وہ دعوتِ کدو!“

ابھی ہم ناشتا کرنے میں مصروف تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب دو انیسروں کو ساتھ
 لے کر آمو جود ہوئے۔ ایک انسپکٹر سکولز تھے، دوسرے تحصیل دار تھے۔ لیکن ان کے
 انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ یا تو انھیں علم ہی نہیں کہ وہ عہدے دار ہیں اور یا پھر

جلاس کے عمدے بنا سیتی قسم کے ہیں۔

”یار، یہ جگہ تو بالکل امپا سبل قسم کی جگہ ہے“ میں نے کہا ”اقل تو اس کا نام ہی بے تکا ہے۔ جلاس۔ کتنا بے ہودہ نام ہے۔ نہ معانی نہ ساؤنڈ ایفکٹ۔ پھر یہاں کی همان نوازی کس قدر احمقانہ ہے۔ ادریہاں کے افسر غیر افسرانہ ہیں ادریہاں کے نوجوان لڑکے جو بار بار قباب اٹھا کر لاتے ہیں اور رات کے تین بجے همانوں کے لیے پلنگ بچھاتے ہیں، اور بات بات پر مسکراتے ہیں، انھیں پتا ہی نہیں کہ نسل نو کا برتاؤ کن سانچوں میں ڈھلنا چاہیے!“

”ایک اور بات بھی تو ہے“ شاعر نے کہا ”عام طور پر دستور ہے کہ اوپر سے چیز دیدہ زیب اور صبر کیلی ہوتی ہے اور بھیتر سے پھٹیخ۔ یہ شہر جس کا نام جلاس ہے، اوپر سے پھٹیخ تھا لیکن بھیتر سے مرغزار ہے۔“

”بالکل“ وٹ چلا ”لات جب ہم نے اسے اوپر سے دیکھا تھا تو ایسے لگا تھا جیسے دوسرا لالچی نالا ہو۔“

ڈپٹی کمشنر

تخصیص دار ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ بولا ”ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہے کہ جلاس سے روانہ ہونے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔“

”ارے!“ شاعر نے زیر لب کہا ”یہاں کا ڈپٹی کمشنر بھی بنا سیتی معلوم ہوتا ہے۔“

”بالکل ہے“ وٹ نے کہا ”ورنہ ڈپٹی کمشنر کب کسی سے ملتے ہیں۔ دودو دن باہر دروازے پر بیٹھے انتظار کرو، پھر کہیں ملاقات کا شرف بخشا جاتا ہے۔“

ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ کچری سے ملحق تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ لیڈر اور داستان گو کہیں کام سے گئے ہیں۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ان کا انتظار کیا جائے تاکہ سب

مل کر اکٹھے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کریں۔

میں کچری کے لان میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کچری سے ایک اہل کار باہر نکلا۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔

”ارے! میں تو حیران رہ گیا۔ کچری کا اہل کار اور مجھے سلام کرے، اور جھک کر! نہیں! نہیں ضرور اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

چند ساعت کے بعد ایک کلرک باہر نکلا اور اس نے بھی جھک کر مجھے سلام کیا۔ یا اللہ خیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچری کا انفرنیچر بھی سلام کرنے کی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے، مگر کچری کا کلرک جھک کر سلام کرے! نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اول تو میں کچری کے نام سے ہی خائف ہوں۔ لہذا میں نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ لیکن زندگی میں چند ایک بار مجبوراً کچری جانا پڑا ہے۔ وہاں جا کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ فرعون مصری تاریخ سے نکل کر، آنکھ بچا کر، ہماری کچریوں میں آ جمع ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میں کچری میں گیا تو ایک گھنٹے کے بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں ایک آن پڑھ بیچ آدمی ہوں جو براہمنوں کے دیس میں آنکلا ہوں۔ اس کے بعد میں نے خود کو مجرم محسوس کرنا شروع کر دیا، ایسا مجرم جو تختہ دار سے بچا پھرتا ہو۔ جتنی تذلیل میری کچریوں میں ہوئی ہے کسی اور جگہ نہیں ہوئی۔

دفعۃً مجھے وہ دلخراش باتیں یاد آ گئیں۔ زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ میں ڈرٹ کے کھڑا ہو گیا اور بڑی فرعونیت سے کچری کے عملے کے سلام قبول کرنے لگا۔ اس شغل میں اتنی لذت تھی کہ میرا دل چاہتا تھا کہ زندگی بھر وہاں کھڑا کچری والوں کے سلام قبول کرتا رہوں۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک سادہ اور متعل مزاج آدمی ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھڑک نہ تھی۔ یا اللہ! یہ شخص علاقے کا نظم و نسق

کیسے چلاتا ہوگا! نہ بوٹ نہ سوٹ۔ نہ بو، نہ ٹائی۔ نہ فوں فوں، نہ ٹیں ٹاں۔
 ڈپٹی کمشنر مقامی آدمی تھا اور سالہاں سے چلاس میں اس عہدے پر فائز تھا۔
 وہ میری حیرت کو تاڑ گیا۔ بولا ”میں مقامی آدمی ہوں، اس لیے میں نے اعلان کر رکھا ہے
 کہ مجھ سے ملاقات پر کوئی پابندی نہیں۔ جب بھی چاہو، مجھ سے آکر مل سکتے ہو۔“ پھر وہ
 ہنسا۔ کہنے لگا ”لوگ مجھ سے آکر پوچھتے ہیں، کیا آپ کو وہ سب اختیارات حاصل ہیں
 جو دوسرے ڈپٹی کمشنروں کو حاصل ہیں۔“

بہر طور چلاس بالکل ہی اُن ہونی جگہ تھی۔ بالکل اُونٹ کی طرح اس کی کوئی
 کل سیدھی نہ تھی۔ نہ ہیڈ ماسٹر، نہ انسپکٹر آف سکولز، نہ طلباء، نہ کچری، نہ ڈپٹی کمشنر۔
 جیب میں گلگت کی طرف جاتے ہوئے میں ابھی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔